امر بیل

بانو قدسیہ

ہو نقش اگر باطل

شادی شدہ زندگی وہ بجلی ہے جس میں لوڈ ہمیشہ زیادہ پڑتا ہے اور کسی لمحے کسی جگہ کسی بھی حالت میں اس کا فیوز بکس سے اڑ جانے کے امکانات ہیں۔ شادی کے دو ماہ تین کے بعد سات سال تین ہفتے گزر جانے پر ستائیس سال اور نو گھنٹے کی مدت کے بعد غرضیکہ کسی وقت بھی اچانک مین سوئچ فیوز ہو سکتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ نیا فیوز کبھی پرانی تار سے نہیں لگتا ـــــ اس کے لئے ہمیشہ نیا تار لگانا پڑتا ہے ۔

میری اور عطیہ کی زندگی میں یہ نیا تار برقی زیبا تھی۔

بچے جب بھی شرارت کرتے ہیں کنڈے بند کر لیتے ہیں۔ میاں بیوی جب بھی چوری چوری کسی اور سے محبت کرتے ہیں غسلخانے اور لیوٹری میں نہیں سوچتے۔ ایک دوسرے کے پاس لیٹ کر دراز ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوئے اسی محبت سے منکر ہو جاتے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے زیبا کا خیال اس وقت آیا جب میں شیو کے بعد آئینے میں تولئے سے منہ پونچھ رہا تھا۔ یہ خیال اس تازہ زخم کی طرح تھا جو نئے بلیڈ نے میری ٹھوڑی پر ڈالا تھا اور جس میں سے ٹھہر ٹھہر کر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لہو رستا تھا۔

عطیہ ـــ زیبا ـــ اور میں ایک ایسے کون کے غیر واضح زاویے ہیں جو گھٹتے اور بڑھتے رہتے جنہوں نے طعن و تشنیع سے کچھ طے نہیں کیا ـــ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ہم نے تو

کچھ کبھی طے ہی نہیں کیا۔ ہم تو اپنی اپنی آگ میں اپنے اپنے شبہات میں، اپنی اپنی نیک نیتی میں یوں جلتے رہے جیسے فاسفورس ٹھنڈی آگ میں روشن رہتا ہے۔ ہم تینوں نے بڑی وضعداری بڑی محبت سے، بڑے خلوص سے ایک دوسرے کی زندگی تباہ کر دی۔

نیکیاں نیکیوں کو مجروح کرتی رہیں۔

محبت نے محبت کا گلا گھونٹ دیا۔

شرافت نے بڑی شرافت سے جان لے لی۔

ہم تینوں کو ایک دوسرے کے دل کا اس قدر خیال تھا کہ بالآخر اسی خیال نے تینوں دل کھرل میں ڈال کر کشتہ بنا ڈالے۔

عطیہ میری زندگی میں اس طرح آئی جیسے ساون میں بارش برستی ہے اور جس بارش سے پرنالے ٹوٹ جاتے ہیں۔ چھتیں بیٹھ جاتی ہیں اور سڑکوں پر متعفن پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔

زیبا میری زندگی میں وہ گلاس بھر پانی بن کر آئی جو ریگستان میں تپی ہوئی دوپہر کے وقت ملتا ہے اور جس پر کسی دشمن کی سنگین پہرہ میں کھڑی ہوتی ہے۔ عطیہ میرے جسم کا، میری غلطیوں کا، میری عادتوں کا مجموعہ تھی اور زیبا وہ سائیکلو انیلسٹ تھی جس کے سامنے مجھے اپنے وجود سے اپنی غلطیوں سے اپنی عادتوں سے اپنی انا سے چھٹکارا حاصل کرنے کے امکانات نظر آتے تھے۔

کبھی کبھی لوٹ کر دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہر شادی کو غالباً روزمرہ کی وہ زندگی کھا جاتی ہے جو قطرہ قطرہ زہر گھولتی ہے جس طرح زیادہ میٹھے پھل میں خود بخود سنڈی پیدا ہو جاتی ہے شادی کے پکے ہوئے آڑو میں بھی اپنے آپ وہ کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جن کا آڑو جیسی خوبصورت چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔

بہرکیف زیبا کے آنے کے بعد جو کچھ بھی ہوا ___ اور جو کچھ بھی نہ ہوا ___ اور جس طرح ہماری خوشیوں کی بجلی بجھی اور میں سوئچ فیوز ہوا، اس کا تعلق اس المیے سے ہے جسے روزمرہ کی زبان میں شادی کہتے ہیں۔

مرد کی ذات ایک سمندر سے مشابہ ہے۔ اس میں ہمیشہ پرانے پانی بھی رہتے بستے ہیں اور نئے دریا بھی آکر گلے ملتے ہیں۔ سمندر سے پرانی وفا اور نیا پیار علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ان دونوں کے لئے کٹ مرے گا۔

لیکن عورت اس جھیل کی مانند ہے جس کا ہر چشمہ اس کے اندر ہی سے نکلتا ہے۔ ایسے میں جب جھیل کی زندگی اور ہے اور سمندر اور طرح سے رہتا ہے۔ ان دونوں کا ہمیشہ یکجا رہنا کس قدر مشکل ہے۔ مچھلی اور ابابیل کے سنجوگ کی طرح اس میں ہمیشہ نظریے کے اختلاف کی گنجائش ہے۔

عطیہ کون تھی؟

زیبا کون ہے؟

کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟ یا دونوں ایک ہی سچائی کے دو روپ ہیں؟

عطیہ سے زیبا تک اور زیبا سے کسی اور عورت تک کتنا فاصلہ ہے؟

پھر یہ بھی سوال ہے ایک عورت سے دوسری عورت تک میرا وجود کس بات کی نشاندہی کرتا ہے؟ کس باطل نقش کی تکرار مجھے ایک وجود سے دوسرے وجود تک یوں گھمائے پھرتی ہے جیسے بھرپور آندھی میں گندم کے دانے کا ایک آوارہ بیج۔

جب پہلی بار میں نے زیبا کا ذکر عطیہ سے کیا تو وہ قمیض اٹھائے پلنگ پر لیٹی منے کو دودھ پلا رہی تھی۔ منے کے بال اور ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور وہ اپنی بائیں ٹانگ عطیہ کے پیٹ پہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ذات میں پیوست تھے۔ لکڑی کے تختے میں لکڑی کی کیل گڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس نوجوان پلنگ زادی کے پاس بیٹھ کر محتاط لہجے میں کہا: "کل میرے کلینک پہ ایک لڑکی آئی تھی۔ اسے افریقہ سے آئے ایک ہفتہ ہوا ہے اور بے چاری بیمار بھی پڑ گئی۔"

"افریقہ سے کیوں آئی ہے؟" عطیہ نے دوپٹے سے منے کا سر پونچھ کر پوچھا۔

"ڈاکٹری پڑھنے"۔

میں عطیہ سے عموماً اپنے مریضوں کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن یہ ذکر مختلف تھا۔ میری شرافت عطیہ کو کاشن دے رہی تھی۔ جگا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میں وہ بوجھ بھی سرسری طور پر سر سے اتارنا چاہتا تھا جو زمبا کو دیکھ کر مجھ پر پڑ گیا تھا۔

لیکن یہ بوجھ اتنی آسانی سے اترا تھوڑی کرتے ہیں۔

اچانک سوتے میں گلے میں بل پڑ جائے اور رہ رہ کر... ٹھہر ٹھہر کر ٹیس سی اٹھے۔

"افریقہ میں کہاں رہتے ہیں اس کے ماں باپ....."

"کینیا میں ـــــ اس کا باپ کپڑے کا بیوپار کرتا ہے۔"

"کیا بیماری ہے.... اسے....."

"گردوں میں درد تھا۔ اب ٹھیک ہے۔"

عطیہ نے بچے کے ماتھے پر ہونٹ رکھ کر آہستہ سے کہا: "بے چاری پردیسن ہے۔ آپ اس کا خیال رکھئے گا۔"

اس پروانۂ راہداری نے گویا غیر قانونی چیزوں کی درآمدی کا باب کھول دیا۔ عطیہ اس گھوڑے کی مانند تھی جو ایک ہی کھونٹے سے بندھا چکر پہ چکر لگائے تھک جاتا ہے جاتا ہے لیکن اس کی منزل اس چکر سے باہر نہیں نکلتی ـــــ اور زمبا جنگلی چیتل کی طرح تھی ہر قاعدے سے آزاد ـــــ یا شاید یہ بھی میرا وہم تھا۔

شروع شروع میں زمبا کے متعلق پچھلی رات کو سوچنا مجھے اخلاقی چوری سی لگی لیکن میں اس مریض کی طرح تھا جس کی آنکھ رات کے آخری کنارے جا کھلتی ہے اور پھر دن چڑھنے نیند نہیں آتا۔ مجھ میں اور زمبا میں کوئی رابطہ نہ تھا حتیٰ کہ نگاہ کی پیام رسانی تک موجود نہ تھی۔ پھر بھی جب وہ قریب ہوتی تو میری انگلیاں اس کے جسم کو محسوس کر سکتیں میں غیر شعوری طور پر اس کے جسم سے آشنا ہو چکا تھا۔ غرغر کرتی بلّی سا گرم جسم شکھ چین کے درخت کی تازہ

کونپل کی طرح مڑ جانے والا رس دار ـــــ کرنے کے پھولوں سے لدے ہوئے پہاڑوں کی طرح خوشبو سے لدا ہوا۔ محبت خیال کے علاوہ اور ہے بھی کیا؟

میں نے اس کے جسم کو چھو کر نہیں دیکھا تھا لیکن آنکھیں بند کرنے پر اس کا ایک ایک خم، اس کا ایک ایک اتار چڑھاؤ، اس کی حدت، اس کی نرمی سب کو میں محسوس کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ میں کلینک میں، گھر پہ، مریضوں کے گھروں میں، فلم دیکھتے ہوئے، دکانوں پر خرید و فروخت کرتے ہوئے زمبا کے متعلق سوچنے لگا۔ لیکن یہ سوچ ایک باپ کی سوچ تھی... ایسے باپ کی جس کی بیٹی سسرال جا چکی ہو اور جو سمجھ نہ پائے کہ بیٹی کا اصلی گھر اس کا گھر نہیں ہے!

زمبا کے گردوں میں معمولی سا درد تھا۔ چند دن کے علاج کے بعد یہ شکایت جاتی رہی لیکن وہ کلینک پر آتی رہی۔ میں نے نسخے کی جگہ ٹانکیں لکھنی شروع کر دیں۔ ٹانکوں کے بعد وٹامنز کی باری آگئی۔ اس کے بعد کئی دن پرہیز بتاتا رہا۔ وہ میرے مشورے بڑے غور سے سنتی۔ پھر اچانک ہم دونوں ایک ہی وقت میں ایکدوسرے کی طرف دیکھ بیٹھتے۔ یہ برہنہ نظر ہم دونوں کو ایکٹرک شاک کی طرح لگتی اور ہم خاموش ہو جاتے۔ میں نے کبھی اس سے مراسم بڑھانے کی کوشش نہ کی۔

وہ کبھی مجھ سے بے تکلف ہونے پر آمادہ نظر نہ آئی۔

پھر بھی ہم دونوں کے درمیان ایک اَن کہا رابطہ بڑھتا رہا۔ فربہ ہو رہا تھا۔ بغیر کسی ٹانک کے۔ بغیر کسی وٹامنز کے۔

انسان درخت کی مانند کیوں ہے کہ دن پر دن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جو کل تھا سو آج نہیں ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہ ہو گا۔ اس تبدیل ہوتے ہیولے سے اس سیماب صفت سیّال چیز سے وفا کی توقع کتنی غلط چیز ہے؟ باطل نقش سے ابدی محبت کی توقع ایسی ہی ہے جیسے رحم نکال دینے کے بعد عورت سے بچے کی توقع۔

انسان عام طور پر اس عکس سے، اس تصویر سے، اس امیج سے محبت کرتا ہے جو اسکا ذہن تخلیق کرتا ہے۔ اس تصور کا اس کے محبوب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لئے محبت کئے جانا اتنا آسان فعل بھی ہے اور اس قدر مشکل امر بھی۔

عطیہ جس ڈاکٹر سے محبت کر رہی تھی وہ اس کی ذات سے پھوٹتا ہوا چشمہ تھا۔ میں جس عطیہ سے محبت کرنے سے قاصر تھا وہ عطیہ میرے آدرشی چوکھٹے میں فِٹ نہ آتی تھی ـــــ یہی ہمارا المیہ تھا۔ کیونکہ جب کوئی خیالوں میں مر جاتا ہے تو پھر زندہ نہیں کیا جا سکتا۔

جب میری شادی کو چند دن ہوئے تھے مجھ پر شادی ایتھر کی طرح سوار تھی۔ میں سوتے میں جاگتے میں ہر لمحہ ہر جگہ اپنی بیوی میں لپٹا رہتا عطر بیز لفافے میں محبوب کا خط۔

شادی کی اوّلیں سرشاری کا ذکر ہے عطیہ کے سر میں ایک شام درد اٹھا۔ یہ درد اتنا تشویشناک نہ تھا کہ میں رات بھر جاگتا رہتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں سوتی آنکھوں والی جاگتے چہرے والی عطیہ میں کیا بات تھی کہ میں تکیئے پر سر رکھتا اور تڑپ کر اٹھ بیٹھتا۔ مجھے یوں ہی شک سا تھا کہ میری آنکھ لگتے ہی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گی۔

اپریل کے آخری دن تھے۔

کمروں میں پنکھوں کی غنودگی بھری آواز ہوا کے ساتھ آوارہ پھر رہی تھی۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی سے جامن کا گھنا درخت نظر آتا تھا۔ رہ رہ کر اس کا کوئی سوکھا پتہ پکے فرش پر گرتا تو میں کانپ اٹھتا۔ صبح اذان ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کوئل کوکنے لگی تو عطیہ کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے کھڑکی میں کھڑا دیکھ کر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی ـــــ "آپ ـــــ آپ اس قدر محبت نہ کیا کریں مجھ سے"۔

میرے گلے میں بے شمار آنسو آ چھپے اور میں خاموشی سے اس کا چندن سا ماتھا سہلاتا رہا۔

عطیہ نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور گھٹی سی آواز میں بولی: "مجھے ایسی محبت سے بڑا خوف آتا ہے۔ ایسی محبتوں . . . . میں ایسی محبتیں . . . . . یہ . . . . . پائدار نہیں ہوتیں . . . جی"۔

وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ مد و جزر کا کیا اعتبار؟

کبھی بڑھتی اٹھتی دیوار سی لہر آتی اور کبھی یوں لوٹ جاتی ہے جیسے ساحل سے کبھی آشنا تھی ہی نہیں۔ لیکن تب تو محبت مجھ پر ایتھر کی طرح چھائی تھی۔ میں نے اسی مدہوشی تلے کہا ـــــ "میں جو کچھ پسند کرتا ہوں سمجھ سوچ کر پسند کرتا ہوں ـــــ محبت ناپائدار نہیں ہو سکتی"۔

اس کی سوتی آنکھوں میں موٹے موٹے چمکدار آنسو آ گئے اور وہ آہستہ سے بولی: "انسان تو بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ یہ کوئی پتھر تھوڑی ہے کہ ہمیشہ ایک ہی جذبے سے بندھا رہے"۔

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ صبح کی ہوا میں جامن کے درخت سے کئی پتے اکٹھے گرے۔

"میں سوچتی ہوں۔ سوچتی رہتی ہوں کہ اگر ـــــ اگر ـــــ آپ کی زندگی میں کوئی بہتر لڑکی آ گئی تو میں کیا کروں گی۔ کیسے RETREAT کروں گی؟ ـــــ فتح کے بعد پیچھے لوٹنا بھی تو کوئی آسان کام نہیں ہے"۔

میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا: "جس بہتر لڑکی کی مجھے تلاش تھی وہ مل گئی ہے مجھے"۔

عطیہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور آہستہ آہستہ کہتی گئی ـــــ "ایسی باتوں کیلئے یہ عمر بہت لمبی ہے۔ شادی کے دو ماہ تین دن بعد ـــــ سات سال تین ہفتے کے بعد ستائیس سال اور نو گھنٹے کے بعد ـــــ کسی دن اچانک وہ منحوس لمحہ آ سکتا ہے جب مجھے تو آپ سے محبت ہے اور آپ کو . . . . . انسان بدلتا رہتا ہے نمو ـــــ بڑھتا ہے گھٹتا ہے۔ جامد چیز تو ہے نہیں کہ ایک سی محبت کئے جائے ـــــ کئے جائے"۔

میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنے کی خاطر کہا تھا۔ "میرا قد کم از کم اور نہیں بڑھے گا۔ چلو تمہیں میرے قد پر اعتماد کرنا چاہئے۔ پکا"۔

لیکن وہ تو مزاح سے کوسوں دور تھی۔ اپنے آپ سے کہتی گئی۔ "جب وہ آئے گی تو میدان کو خالی پائے گی ـــــ میں خزانے کا سانپ بن کر آپ پر پہرہ نہیں دوں گی ـــــ میں تو ـــــ مجھے تو

میں تو۔۔۔۔۔ مجھے اگر یقین ہو گیا کہ آپ کی خوشی اس سے وابستہ ہے تو بس آپ سے یوں علیحدہ ہو جاؤں گی جیسے پکا ہوا پھل ڈالی سے گرتا ہے ـــــ خود بخود ـــــ اپنے بوجھ سے۔"

باہر سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کی جانب آیا۔ کوئل زور سے کوکی اور جامن کے درخت سے ایک پتہ آنسو بن کر گرا۔

"تم ـــــ تم ایسی باتیں نہ کیا کرو عطیہ ـــــ مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

لیکن وہ گھاٹوپ جذباتیت کا شکار ہو چکی تھی۔ مجھ سے کم اور اپنے آپ سے زیادہ مخاطب تھی کہتی گئی۔

"مجھے تو ابھی سے اپنے آپ پر ترس آنے لگا ہے نمو ـــــ مجھے ـــــ میں تمہاری خوشیوں کے سامنے کبھی فصیل بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی اور ـــــ تمہاری اس خوشی سے ـــــ چاہے میرا ـــــ نقصان بھی ہوتا ہو لیکن ـــــ میں وہ پھاٹک ہوں نمو جو تمہاری خوشیوں کے لئے کھلتا ہے ہمیشہ ـــــ ہر لمحے ـــــ"

جاگتے چہرے اور سوئی آنکھوں والی اپنے مستقبل کے بھیانک تصور سے لرز رہی تھی۔

میں نے اس کا سر اپنے ہاتھوں میں لیا اور آہستہ سے بولا: "تو تو مجھے ـــــ اپنی بچی لگتی ہے عطیہ۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی اچھا سا بر تلاش کر کے تجھے اس سے بیاہ دوں ـــــ لیکن اگر میں نے تجھے بیاہ دیا تو ـــــ بول اپنی بچی کو کوئی فریب دیتا ہے۔ عطیہ بول، بتا؟"

کیا عجیب سی بات ہے کہ یہ واقعہ تو مجھے اچھی طرح سے یاد رہے لیکن اس واقعے کی وہ آہنی نوک ٹوٹ چکی ہے جس نے اس وقت مجھے چھید ڈالا تھا۔ زمبا سے ملنے کے بعد مجھے کئی بار اس رات کی یاد آئی جب جامن کے پیڑ سے پتے آنسو بن کر گرتے تھے لیکن اس رات کا بوجھل پن جذبات سے بھیگی باتیں اور ایکدوسرے کے لئے مر جانے کی خواہش باسی پھول کی طرح مرجھا چکی تھی۔

ہر مرد بالآخر ایک عاشق مزاج عورت سے ڈرنے لگتا ہے۔ ایسی عورت کی وفا اس کی ننگی بے حسی پر کوڑے کی طرح لگتی ہے۔ کاش عورت قربانی کو اس حد تک اپنا شعار نہ بنا لیا کرے

کاش وہ سمجھ سکے کہ مرد اپنی تمام تر بے وفائیوں کے باوجود کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جس سے پہلے بت ٹوٹ جائیں۔ اس نے دل کے کونے میں جس بت کو پہلے پہل بٹھایا ہوتا ہے اس کی نفی کرنے کے باوجود وہ بت وہیں کہیں چھپا رہتا ہے ـــــ کیونکہ مرد ایک سمندر کی مانند ہے۔ اسے اپنے پرانے پانیوں سے بڑا پیار ہوتا ہے۔

ہمیں ایک دوسرے کے جذبات کا کس قدر پاس تھا۔

ہم تینوں ایکدوسرے کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ محبت خیال کے علاوہ اور کیا ہے؟

ہم تینوں ایکدوسرے کی اتنی عزت کرتے تھے کہ اسی احساس نے ہمارے منہ پر تالے ڈال دیئے۔ عطیہ نے میری خوشی کے حق میں سب پھاٹک کھول دیئے۔ زمبا پھاٹک کے اندر داخل نہ ہو سکی اور میں ایک زخمی کتے کی طرح پھاٹک کی دہلیز پر بیٹھا اپنی ہی خوشی کے زخم چاٹتا رہا۔

میں نے عطیہ کو کبھی کچھ نہیں بتایا کیونکہ میرے پاس سوائے اس کیفیت کے جو میرے دل کے اندر تھی، بتانے کو کچھ نہ تھا۔ عطیہ کے پاس پوچھنے کے لئے کچھ نہ تھا کیونکہ اس کے پاس سوائے وسوسوں کے، سوائے اندر ہونے والی سرد جنگ کے کوئی ثبوت میری بے وفائی کا موجود نہ تھا۔ زمبا میرے اس قدر قریب نہ آئی تھی کہ وثوق سے کچھ کہہ سکتی ـــــ اور اس قدر دور نہ تھی کہ اندر ہی اندر اٹھنے والے طوفان کو مکمل طور پر دبا سکتی۔

یہ ایک سرد جنگ تھی۔

ہر ایک فرد اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اپنی خود غرضی سے لڑ رہا تھا۔ اس جنگ میں اس کے تمام سفید جرثومے ختم ہو چکے تھے۔ بیماری حملہ کر چکی تھی اور قوتِ مدافعت کے سارے خزانے ختم ہو چکے تھے۔

جس روز پہلی بار زمبا میرے گھر پہنچی تو میں باہر مین سوئچ بند کر کے نیا فیوز لگا رہا تھا۔ اس نے کئی بار عطیہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر یہ

سمجھاتی تھی کہ آگ اور پانی کو یکجا کرنے سے ایک نہ ایک کے ختم ہو جانے کا امکان ہے۔

زمبا کو برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری ٹانگوں میں عجیب قسم کی کمزوری در آئی اور سر ہلکا سا محسوس ہونے لگا۔

وہ بہت دبلی پتلی لڑکی تھی۔ کانگو کے طاس میں بسنے والے حبشیوں کی طرح اس کی چال ڈھال میں ایک طرح کی پھرتی، ایک قسم کی لے تھی۔ اس کے حسن میں صحت کو بڑا دخل تھا رنگت، اعضاء، آواز سب صحت کا اشتہار تھے۔

سٹول سے اتر کر زمبا تک پہنچنا میرے لئے ایک مرحلہ بن گیا۔

"آپ کی مسز گھر پر ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"جی ہاں ___ ہیں تو سہی ___ پر ___"

اس وقت منا باہر آ گیا۔ گیلے بسکٹ کو ہاتھوں میں بتیاں بناتا ہوا۔ وہ زمبا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

زمبا بڑی خوش لباس لڑکی تھی۔ رنگوں کے امتزاج اور کپڑے کے چناؤ میں اس کی چھٹی حس کام کرتی تھی۔ منا اس وقت بسکٹ کی لیپ سے چپچپا سا نظر آ رہا تھا لیکن پھر بھی اس دیدہ زیب نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

"آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے زینب۔"

"اتنے پیارے بچے کے سامنے ان کپڑوں کی کیا حیثیت ہے ڈاکٹر صاحب....."

میں منے کو اس کی گود میں دیکھ کر ڈر سا گیا ___ کتنی مشابہت تھی دونوں میں ___ ناک کے بانسے سے دور دور چمکتی بھولی بھالی آنکھیں، دھلی سی جلد اور بھیگے بھیگے گلابی ہونٹ ..... دونوں کو قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

افریقہ سے آئی ہوئی یہ لڑکی کتنی بھولی تھی۔ بچوں کی طرح اسے علم نہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں اس کھلونے کی خواہش لکھی ہوئی ہے جو اسے کوئی خرید کر نہیں دے سکتا۔

عطیہ اس وقت غسلخانے میں تھی۔ میں زمبا کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

وہ کارنس کے پاس چمڑے کے گول مونڈھے پر بیٹھ گئی اور منے کے ہاتھ اپنے رومال سے صاف کرنے لگی۔

"آپ کلینک پر نہیں گئے آج....."

"بس اب تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔"

اندر عطیہ اپنی بے سری آواز میں گا رہی تھی۔ ایک ایسے مشکل فلمی گانے کا ریاض کر رہی تھی جس میں غالباً مالکونس درباری اور پٹ دیپ وغیرہ کی آمیزش تھی۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

منا اس کے کان میں پڑے ہوئے خانہ بدوشوں جیسے بالے کو انگلی سے جھلانے لگا۔

"آپ وٹامن بی پیا کرتی ہیں باقاعدگی کے ساتھ۔"

"جی ___"

پھر خاموشی ___ لمبی سی بے سری تان اور ننھی سی انگلی سے جھولتا ہوا بالا۔

"زولو قبیلہ کے متعلق تو آپ کے پاس فسٹ ہینڈ انفرمیشن ہو گی ___ ان کے ہاں تو WITCH DOCTORS ہوتے ہیں۔ آپ کا کوئی پرسنل تجربہ ہے ان ڈاکٹروں کے متعلق؟ ....."

لمبی لمبی پلکیں اوپر کو اٹھیں، جھلملیاں کھلیں اور اندر نیلے پردے روشن ہو گئے۔

"اب تو جی ان لوگوں نے بہت ترقی کر لی ہے۔ دراصل جی کانگو میں بنتو قبیلہ رہتا ہے اس قبیلے کی بہت سی شاخیں ہیں۔ سوحیل، زولو وغیرہ۔ اب تو چکاری نے ___ ایک قومی لیڈر ہے جی زولو ٹرائب کا ___ چکواری نے بہت محنت کی ہے جی زولوز پر ___ متمدن بھی ہو گئے اور ترقی پسند بھی۔ اب تو وچ ڈاکٹروں کی وہ شان نہیں رہی جی وہاں۔"

وہ بنتو قبیلے کی بات کر رہی تھی اور میں اس بنتو کو دیکھ رہا تھا جس کی کمر چیتے کی طرح خمدار

لچکیلی اور پتلی تھی۔ یہ کمر ڈھاکے کی ململ تھی۔ ایک ریشمی رومال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی پیمائش کی جا سکتی تھی۔ ہاتھوں کی انگوٹھی میں سے بخوشی نکل سکتی تھی۔

میں نے اس کی کمر کو چھو کر نہیں دیکھا حالانکہ وہ میری انگلیوں کی پوروں میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس گر سے میٹر نے جو اندھوں کی انگلیوں میں چھپا رہتا ہے اور جس کی مدد سے وہ ٹٹول کر کپڑے کا رنگ بتا دیتے ہیں۔ اسی گر سے میٹر نے مجھے زمبا کے جسم کی ساری لطافت بغیر چھوئے سمجھا دی تھی۔

پہلی ملاقات ہی میں غالباً زمبا نے عطیہ کی شخصیت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے وہ اس احترام کی دیوار کو پھر کبھی مسمار نہیں کر سکی۔ اس کے پاس لکڑی کا کوئی گھوڑا موجود نہ تھا جس میں اپنے جانباز چھپا کر قلعے کے اندر لے جاتی اور یوں ٹرائے کی جنگ کا پانسہ بدل دیتی۔

عطیہ کو میں نے کچھ نہیں بتایا۔

اس کے باوجود پہلے ہی دن اس نے غالباً شکست قبول کر لی۔ اگر وہ مجھ سے کبھی جھگڑتی تو آج میں اس کے متعلق کسی اور زاویے سے سوچتا۔ اس نے تو مجھ پر کوئی الزام، کوئی تہمت نہیں لگائی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس قدر جانتی تھی۔ بس اس دن کے بعد وہ ایسی ٹنڈ منڈ کلی بن گئی جس کی پتیاں نوچ کر علیحدہ کر دی جائیں۔ اس کا چہرہ ننگا بجھا اور بے رونق ہو گیا جیسے کسی میجر آپریشن کے بعد مریض کا چہرہ ہو جاتا ہے۔

دراصل عطیہ میں سپورٹس مین سپرٹ کی کمی تھی جس کی مدد سے آدمی ہار کر بھی مسکراتا رہتا ہے۔ عطیہ میں الکوہال سپرٹ کی کمی تھی جو وقتی طور پر انسان کو بہادر بنا دیتی ہے۔ اسمیں زخموں پر لگانے والی سپرٹ تک کی کمی تھی۔ وہ ایک ایسی روح تھی جس میں کسی قسم کی سپرٹ موجود ہی نہیں تھی اسی لئے اس نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کیا۔ الٹا سومناتھ مندر کے پٹ کھول دیئے اور سارا مال و متاع ان کے سپرد کر دیا جو دور سے آئے تھے اور حق بجانب تھے۔

عجیب دن تھے وہ بھی.....!

جب عطیہ اور میں اکیلے ہوتے تو عطیہ زمبا کی باتیں چھیڑ دیتی۔ اس کے لہجے میں اور میرے لہجے میں ہمیشہ فرق ہوتا۔ وہ بظاہر جوش اور محبت سے باتیں کرتی، میں بظاہر سرد مہر رہتا۔ لاتعلقی سے باتیں سنتا۔ بے ربط جواب دیتا۔ لیکن اندر سے میرا وجود کسی کی ہوئی ستار کی طرح تنا رہتا۔ زمبا کے ساتھ بھی ہمیشہ عطیہ کی باتیں ہوتیں۔ زمبا دل کھول کر عطیہ کی تعریف کرتی۔ اتنی تعریف کہ میں لوکھلا جاتا۔ میں بظاہر گرمجوشی کے ساتھ عطیہ کی باتیں کرتا لیکن میرے اندر برف کی قاشیں جمتی چلی جاتیں۔ کوئی چیز مجھے سُن کرتی جاتی۔

یہ میرا ہی حال نہیں ہے۔ غالباً ہر اس شوہر کا ہوا ہوگا جس نے شادی کے بعد ایسی ٹوٹ کر محبت کی ہے ـــــ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ عطیہ مجھ سے اس محبت کی وجہ سے سرد مہری برتے۔ میں اس سے نہ بدلنے کی توقع رکھتا تھا۔ حالانکہ خود میں ـــــ اور میرے جذبات اس کے لئے بدل چکے تھے۔ اس معاملے میں میری خود غرضی مثالی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ عطیہ کی محبت مجھ سے کم نہ ہو۔ وہ ہر وقت اسی سپردگی کے ساتھ مجھے ملے جس طرح ملتی آئی تھی۔ جسم اور روح کی مکمل سپردگی کے ساتھ ـــــ یہ زیادتی تھی۔ میں زمبا سے محبت بھی کر رہا تھا اور اس کی قیمت بھی ادا نہ کرنا چاہتا تھا جو غالباً عطیہ کی سرد مہری سے ادا ہو سکتی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں ہر لمحے میں نے مدافعت کی ہر قسم کی حفاظتی تدابیر کیں۔ ایسے منصوبے، وعدے، اصول بنائے جو مجھے زمبا سے نجات دلا سکیں۔ لیکن میں تو زخمی ہو چکا تھا۔ نازک ہرنی کی طرح میں بھاگ بھاگ کر تھک چکا تھا اور میرے تعاقب میں وہ سرنگ گھوڑے تھے جن کے سموں سے شعلے اڑا کرتے ہیں۔ یہ دوڑ، یہ فرار، یہ جدوجہد عموماً رائیگاں ہوتی کیونکہ حساس نتھنوں والی ہرنی کی قوت بالآخر جواب دے جاتی ہے اور بہت جلد بجلی کی طرح چمکتے جسموں والے اور شبنمی شریانوں والے گھوڑے اس تک آ پہنچتے ہیں اور وہ بے سدھ ہتھیلیاں زمین میں گاڑے آنکھیں بند کئے اپنے آپ کو آنے والے انجام کے حوالے کر دیتی ہے۔

یہی حال میرا ہوا۔

میں بہت بھاگا ــــ بہت بھاگا اور بالآخر میلوں کی مسافت کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بے حال ہو کر گر پڑا۔

اس روز جب میں زیبا کو فاطمہ جناح کے گیٹ پر چھوڑ کر لوٹا اور میں نے گیراج میں گاڑی بند کی تو دیر تک میں نے اس سیٹ پر ہاتھ ڈالے رکھا جس پر زیبا بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں بغیر کچھ کہے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تھے جیسے شکست خوردہ ٹیم کے کھلاڑی میدان سے نکلتے ہوئے ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملاتے۔

نہ میں نے اس سے اقرارِ محبت کیا نہ اس نے مجھے اقرار پر آمادہ کیا۔ حالانکہ رات کی ٹھنڈک میں کئی اشارے تھے اور فضا خود بخود جگنوؤں کی طرح جلتی بجھتی تھی۔ میری کار میں زیبا کی خوشبو تھی۔ ہلکی سی فرانسیسی خوشبو میں ملی جلی جلتے ربڑ کی خوشبو.....

میں دیر تک وہیل پر بازو رکھے بیٹھا رہا۔ بالآخر جب اس کی غیر موجودگی کا قلق آنسو بن کر میرے گلے میں اترنے لگا تو میں اٹھا، کار بند کی اور اندر چلا گیا۔

میں عطیہ کو کیسے سمجھاتا کہ محبت کوئی ٹرین تو ہے نہیں کہ پچھلے ڈبے کاٹ کر نئے ڈبے لگائے جائیں۔ یہاں تو پچھلے ڈبے اور نئے کوپے یوں آپس میں ملے جلے ہیں، پچھلی محبت نئی محبت میں کچھ یوں بغلگیر ہے جیسے ایک ہی کتاب کے مختلف ورق!

عطیہ منے کا گال اپنی ہنسلی کی ہڈی پر رکھے سو رہی تھی۔

بیڈ لیمپ کی روشنی کا ہالا منے کے سر پر تھا۔

ماں اور بیٹے کا رشتہ ــــ کم از کم اس رشتے کی راہ میں وہ منزلیں نہ تھیں جن پر چل کر آدمی ضرور بچھڑ جاتا ہے ــــ اپنے چاہنے والوں سے۔

میں چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔ اسی نظر سے مہاتما بدھ نے آخری بار اپنی رانی اور بچے کو دیکھا ہوگا۔ کرب کی کئی منزلوں سے گزر کر وہ بھی ایک نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ بچھڑنا ناگزیر ہے!

مہاتما بدھ اس فیصلے پر پہنچ کر مجھ سے آگے نکل گیا۔ اس نے پھر لوٹ کر یشودھرا اور بچے کی طرف نہ دیکھا ہوگا۔ ورنہ وہ بھی میری طرح گو مگو کے عالم میں رہتا اور کچھ نہ کر پاتا۔

میری نئی محبت کا بچہ جنم لے کر ڈیلیوری روم میں آچکا تھا اور پچھلی محبت کا آنول ابھی تک اس کی ناف سے لٹک رہا تھا۔ اس نئے بچے کی اپنی ایک زندگی تھی اور لٹکتی آنول کا اپنا ایک رشتہ تھا۔ میں سرجن ہونے کے باوجود قینچی اٹھا کر اس آنول کو کاٹ نہ سکا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔

خدا جانے میں کتنی صدیاں اسی طرح کھڑا رہا۔ بجلی کی ننگی تار کی طرح کرنٹ سے بھرا ــــ کئی پتھر اور دھات کے زمانے آئے۔ تانبے اور سونے کے ظروف بنائے۔ انسان نے آگ پکر جنگل سے۔ جانوروں کو بھون ڈالا اور الاؤ کے گرد بیٹھ کر نوجوانوں نے عشقیہ گیت سنائے۔ اب ان صدیوں کا، اس وقت کا، اس انتظار کا کچھ باقی نہ رہا۔ الاؤ کے گرد بیٹھنے والے اور ٹرائی ڈنڈ طیارے میں لائٹر سے سگریٹ جلانے والے کے درمیان ایک آگ کا رشتہ باقی رہ گیا۔

اندر کی ادھ جلی آگ ــــ باہر کی یخ بستہ اور شفاف آگ ــــ نئے ڈیزل انجن کی آگ ــــ ویلڈنگ مشین کے شعلوں سے نکلتی آگ ــــ نفرت کی آگ ــــ محبت کی جھلسی ہوئی آگ ــــ اپنے آپ کو بچانے کی آگ ــــ دوسرے کو آگ سے نکالنے اور پھر اسی آگ میں دھکیل دینے کی آگ ــــ

کھال پہننے والا، پتھر کے نیزوں سے شکار کرنے والا، کھلی غاروں پر کھالیں لٹکانے والا رخصت ہو چکا تھا۔ اس کا ہم سے کوئی رشتہ باقی نہ تھا۔ اس کی زبان اور ہمارے رسم الخط میں صرف ایک لفظ سانجھا تھا

آگ کا شعلہ رُو لفظ۔

اس بھٹی میں آج کا ماڈرن آدمی بھی جل رہا تھا۔ شارک سکن کا سوٹ پہن کر کنکریٹ پر چلنے والی کی آگ نہیں بدلی تھی۔

پھر پتہ نہیں کب عطیہ کی آنکھ کھل گئی۔

اس جاگتے چہرے نے کچھ نہ پوچھا۔ اُن سوئی آنکھوں نے کوئی سوال نہ کیا۔ دراصل ہمارے درمیان باتوں کا وہ منبع سُوکھ گیا تھا جو نطق رکھنے والے جانور کے لئے آبِ حیات ہے۔

کھانا لگاتے ہوئے اس نے کوئی ہزارویں بار کہا: "کیسی پیاری لڑکی ہے زمبا"

میں خاموشی سے نوالہ توڑنے لگا۔ میں اس جھوٹ تلے دیکھ سکتا تھا۔

"کتنی خوبصورت ہے۔ چنبیلی کی کلیوں کا سا ملائم رنگ . . . . ."

ٹیکہ لگوانے سے پہلے جس طرح مریض یکدم TENSE ہو جاتا ہے میں بھی اسی طرح بوٹوں کے اندر پاؤں سکوڑے بیٹھا تھا۔ مجھے اپنی آواز پر اعتماد نہ تھا ورنہ میں اس کی بات کا جواب ضرور دیتا۔

"آج آئی تھی زمبا۔ بڑی دیر تک منے سے کھیلتی رہی"

میں اسے بتا نہ سکا کہ زمبا مجھے پہلے ہی سب کچھ بتا چکی ہے۔

پرانی محبت کی زنجیریں ٹوٹنے اور نئی محبت کی قید کے درمیان ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جس میں کوئی چیز وثوق سے کہی نہیں جا سکتی۔ دودھ کو جامن لگنے اور دہی کے بن جانے کے درمیان ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب دودھ دودھ نہیں رہتا اور دہی بھی کہلا نہیں سکتا۔ خوف سو بار دل میں یہ امید بندھ جاتی ہے کہ نئی محبت خود اپنی موت مر جائے گی یا پھر ایک صبح اچانک ساتھ والے تکئے پر پچھلی محبوبہ کی آنکھیں اجل نے بند کر دی ہوں گی یا اپنا سانس رک جائے گا . . . . .

یہ دور بے اطمینانی کا دَور ہوتا ہے ــــ پچھلی محبت سے بندھے رہنے کی خواہش اور اسی محبت سے چھوٹ جانے کی موہوم سی امید . . . . .

ایسے جیسے دار پر چڑھ کر آدمی غٹاغٹ آبِ حیات کا پیالہ پی رہا ہو۔

اس دَور میں انسان گندھی ہوئی مٹی کی طرح کمہار کا منتظر ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ چاک پر چڑھ کر ٹھلیا، آبخورہ، گملا، گونڈا، صراحی، ناند، ہنڈیا، کنالی یا خدا جانے کونسا برتن بن جائے گا۔ یہ وقت سانس روکے رہنے سے کٹتا ہے۔ وہ موسم سے یوں متاثر ہوتا ہے جیسے چنے کی فصل ہو

چھوٹی چھوٹی بے معنی باتوں پر اس کے کان، شکاری کتے کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی حسیات تیز کمانی دار چاقو کی طرح تیکھی ہوتی ہیں۔ وہ لمحوں میں ہفتوں کی، مہینوں کی، سالوں کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ دور احساسِ گناہ اور لذتِ گناہ کی شراب سے دو آتشہ بن جاتا ہے۔

میں سارا سارا دن سوچتا رہتا کہ عطیہ کس قدر جانتی ہے؟

وہ مجھ پر کس حد تک شبہ کرتی ہے؟

میں نے تو ابھی تک زمبا سے اقرارِ محبت بھی نہ کیا تھا تو میں عطیہ کو کیا بتاتا۔

اسی الجھاؤ میں اسی شرافت میں زمبا میڈیکل کالج کے تھرڈ ایئر میں پہنچ گئی۔

ہم تینوں خودداری کے پتلے تھے۔

ہم تینوں میں سے ایک بھی بے رحم نہ تھا۔

ہم تینوں کو اپنی ذات سے کم اور دوسرے کی خوشی سے زیادہ سروکار تھا۔

اسی طرح پورے تین سال گزر گئے اور کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ ہم تینوں فیصلہ کرنے کیلئے نہیں بنے تھے۔ میرے جسم کی ساری توانائی کو یہ گومگو کا عالم کھا گیا۔ عطیہ کے چہرے پر چھائیاں پڑ گئیں۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور آنکھوں میں مستقل نمی رہنے لگی۔ زمبا چپ کے ایسے دنوں سے آشنا ہو گئی جو موت سے گہرے ہوتے ہیں۔

مجھے وہ دن ابھی بھی یاد ہے جب میں نے زمبا کو عطیہ کے گھر ہونے والے بچے کی خبر سنائی تھی۔ ہم تینوں بازار گئے ہوئے تھے۔ عطیہ میرے ساتھ والی سیٹ پر تھی اور زمبا منے کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر اچانک بازار میں عطیہ اپنی ایک سہیلی سے باتیں کرنے لگی۔ منا اتر کر ماں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور ہم دونوں بیٹھے رہ گئے۔ میں نے برتنوں کی دکان پر نظریں جما کر کہا ــــ "عطیہ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے . . . . . تم اسے سمجھاؤ زمبا۔ تمہاری تو ہر بات مان لیتی ہے عطیہ"

"جی ہاں ــــ آپا تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہیں . . . ."

میں زیبا کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی حاملہ تھی ___ خدا جانے وہ کیا جذبہ تھا جو مجھے یہ خبر سناتے ہوئے ملزم سا بنا رہا تھا۔

"عطیہ حاملہ ہے ..... اسے اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔"

میں نے شدھ ڈاکٹری لہجے میں بہ زبانِ انگریزی کہا۔

خدا جانے کیا بات تھی کہ زیبا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے ___ غالباً وہ دل ہی دل میں سمجھتی تھی کہ اس کے آنے کے بعد میں نے ٹرین کا آخری ڈبہ اتار پھینکا ہے ___ میں اسے کیسے سمجھاتا کہ میاں بیوی بغیر عشق کئے بغیر جذبے کے ایک دوسرے سے پیوست رہا کرتے ہیں۔ بچے آتے چلے جاتے ہیں۔ صرف ان بچوں کے ماتھوں پر وہ نور نہیں ہوتا جو عشق عنایت کرتا ہے۔ خیال سے پیدا ہونے والا حسن نہیں ہوتا۔

وہ خاموشی سے رومال میں آنسو چھپاتی رہی اور میں چور نظروں سے سامنے والے شیشے میں اسے دیکھتا رہا۔

نہ میں نے اسے کچھ کہا۔

نہ اس نے مجھے کسی صفائی پیش کرنے پر آمادہ کیا۔

اور عطیہ فٹ پاتھ پر منے کا ایک ہاتھ تھامے اور دوسرے منے کو پیٹ میں چھپائے عجیب قسم کے دردِ زہ میں مبتلا رہی۔ نہ اس نے منہ کھول کر آہ بھری نہ دانت بھینچے۔ بس خاموشی سے درد کی لہریں اپنے اندر جذب کرتی رہی۔

اس شام ٹھہر ٹھہر کر ہوا چلتی تھی۔

آنگن میں جامن کے پتے رکے ہوئے آنسوؤں کی طرح اچانک گرتے تھے۔ میں کلینک پر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ عطیہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ سے بولی ___ "آپ زیبا کو بلا لیجئے۔ منا اس سے بہت ہلا ہوا ہے۔"

میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ___ "کیا بات ہے عطیہ ..... میں

خالہ جان کو تار دے دوں ..... "

"نہیں۔ امی آ کر کیا کریں گی۔ آپ زیبا کو بلا لائیے۔ اس کے ساتھ منا اداس نہیں ہوگا۔"

میں نے پلنگ پر عطیہ کو لٹا کر اس کے پیٹ کا معائنہ کیا۔ بچے کی گردش تیز تھی۔ بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا اور درد کی پہلی علامتیں شروع تھیں۔

"کسی کو نہ بلائیے۔ صرف زیبا کو بلا لائیے ..... "

جس وقت میں عطیہ کو لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہوا۔ زیبا منے کو گود میں لئے برآمدے میں کھڑی تھی۔ عطیہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر ٹانسے کی چادر تھی اور وہ بار بار لب کاٹتی تھی۔ اس لمحے مجھے ایک بھیانک ٹریجڈی کا احساس ہوا جیسے انسان اپنے ہی بیٹے کا گلا گھونٹ دے۔

عطیہ نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ منے کی طرف نگاہ کی نہ اپنے گھر کو دیکھا۔

سونی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی کیفیت تھی۔ سومناتھ کا مندر کھونے والے پجاریوں کی بے چارگی .....

اس رات ٹھہر ٹھہر کر ہوا چلتی تھی۔

اور جامن کے پیڑ سے سوکھے پتے جھڑ کر پکے آنگن پر گرتے تھے۔

میں ڈیلیوری روم میں عطیہ کے ساتھ تو نہ جا سکا لیکن ہسپتال کے باہر کار کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے میری نظروں میں وہ سب مرحلے تھے جن سے عطیہ گزر رہی تھی۔ رہ رہ کے ایک تصویر سی ونڈ سکرین پر ابھرتی تھی۔

عطیہ درد سے کراہ رہی تھی۔

عطیہ کے بازو میں گلوکوز لگا تھا۔

عطیہ آہنی پلنگ کی پٹیاں پکڑے سانس روک کے درد سے اپنا بچہ مانگ رہی تھی۔ اس کے بال پسینے سے بھیگ چکے تھے۔ نرسیں اسے بھی معمولی کیس سمجھ کر اپنی ہی باتیں کئے جا رہی تھیں۔

عطیہ ایک ایسے آدمی کا بچہ جن رہی تھی جس کا اس کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق نہ تھا۔
پھر بیٹھے بیٹھے ونڈسکرین دھل جاتی۔ عطیہ کی شبیہ مٹ جاتی اور زمبا منے کو گود میں اٹھائے ونڈسکرین پر مرتسم ہو جاتی۔

منا اور زمبا ـــــ کتنی مشابہت تھی دونوں میں۔

زمبا نے منے کو کس قدر محبت سے اٹھا رکھا تھا۔

وہ ایک ایسے بچے کو اپنی ساری محبت دے رہی تھی جو اس کی کوکھ سے پیدا نہ ہوا تھا۔
جب رات کے پچھلے پہر میں ڈیلوری روم میں گیا تو عطیہ گیس کے ٹینٹ میں اونچے اونچے سانس لے رہی تھی۔ اس کے ایک بازو میں بلڈ لگا ہوا تھا اور نرسیں اس بچے کا آنول کاٹ رہی تھیں جو پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا۔

پچھلی محبت کا مردہ بچہ . . . . .
نیلگوں رنگت، بھنچی ہوئی مٹھیوں اور ادھ کھلی آنکھوں سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ زندہ رہنے کی خواہش تھی نہ ترس کی بھیک مانگنے کی خواہش۔
وہ تو ایک بن ماں باپ کا بچہ تھا جو فطرت نے اپنے قانون کے تحت غلطی سے بھیج دیا تھا۔
وہ اپنے وجود میں کھویا ہوا ـــــ گم سم اس لمحے کی طرح ساکت تھا جو گزر تو جاتا ہے لیکن کبھی یاد نہیں آتا۔ جب میں عطیہ کو پرائیویٹ روم میں چھوڑ کر گھر لوٹا تو اذان کا وقت قریب تھا۔

ہوا ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھی۔
دور کہیں کوئی گھائل ہو کر کوکنے لگی تھی۔ جامن کے سوکھے پتے رک رک کر گر رہے تھے۔

بیڈ لیمپ روشن تھا۔
زمبا عطیہ کے تکئے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی پر منے کا گال تھا اور روشنی کا ایک ہالا دونوں کے سروں پر پڑ رہا تھا۔
مجھے معلوم نہیں عطیہ کہاں ختم ہوئی اور زمبا کہاں شروع ہو گئی؟

میں نہیں جانتا کہ پہلا ڈبہ کس لمحے کٹ گیا اور نئے کوپے انجن کے ساتھ کیسے جوڑ دیئے گئے؟ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس رات اذان سے کچھ دیر پہلے میں وثوق کے ساتھ اس ایوان میں داخل ہوا۔
گندھی ہوئی مٹی چاک پر چڑھی اور ایک اور کاسہ تیار ہو گیا ـــــ محبت کی دہلیز پر پڑا ہوا خالی کاسہ۔
. . . . . پچھلی محبت کا بچہ میں نے دفنا دیا کیونکہ لاشوں کو ہمیشہ تو گھر پر نہیں رکھا جا سکتا۔ نئی محبت کے صحت مند بچے کا آنول کاٹا اور اس کے رونے سے کمرے میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔

میں جانتا ہوں عطیہ کی موت حادثہ نہیں ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں یہ فطری موت نہ تھی۔

ہسپتال والے اسے حادثہ کہہ سکتے ہیں۔

کیونکہ ان کے نزدیک صحت مند ہو کر مریض کا مر جانا حادثہ ہے۔
لیکن میں خوب جانتا ہوں ڈاکٹر کی بیوی ہو کر وہ غلطی سے اتنی تعداد میں سونرل نہیں کھا سکتی تھی۔

ہسپتال والے چاہے اسے حادثہ کہیں لیکن میں خوب جانتا ہوں۔

حالانکہ مجھ سے عطیہ نے کچھ نہیں کہا۔

حالانکہ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔

حالانکہ عطیہ کے گھر آنے کے بعد زمبا افریقہ لوٹ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

حالانکہ میں اور منا ـــــ اور میرا گھر سب اس کے منتظر تھے۔
وہ ایک رات سسٹر کے کمرے میں گئی اور مٹھی بھر خواب آور گولیاں لے آئی جب اسے گھر آنا چاہئے تھا وہ ایک اور سفر پر روانہ ہو گئی۔

میں نے عطیہ کو کچھ نہیں بتایا۔
اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔
اس کے باوجود میری طرح وہ بھی وثوق کے ایوان میں داخل ہو چکی تھی۔

اب زمبا اور میں محبت سے رہتے ہیں۔
میں جانتا ہوں میرے لئے اب کوئی اور لڑکی کبھی نہیں آئے گی۔ لیکن جب رات کے پچھلے پہر کوئل کُوکتی ہے اور جامن کے پتے گرتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں زمبا سے کہوں:

"جب مجھے یقین ہو گیا کہ تمہاری خوشی کسی اور سے وابستہ ہے تو میں چپ چاپ تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا جیسے کھلے کواڑ سے کسیلے پتوں کا دھواں"۔

لیکن یہ بات میرے منہ سے نہیں نکلتی ـــــ عطیہ میرے پاس آبیٹھتی ہے اور چپ چاپ میرا منہ تکے جاتی ہے۔

عطیہ ہمارے اعصاب پر، ہمارے وجود، ہماری خوشیوں پہ یوں چھا گئی ہے جیسے برفپوش چوٹیوں پہ یخ بستہ ٹھنڈ ـــــ

ہماری زندگی نے عطیہ کا تنبو تان لیا ہے۔ زمبا اور میں نے مل کر عطیہ کا وہ بُت تراشا ہے جو سومنات کے بت سے بھی بڑا ہے۔ جولات و منات سے بھی زیادہ پُر شکوہ ہے۔ جو بدھ کے بت سے بھی زیادہ پراسرار ہے۔ اپریل کی راتوں کو ہوا ٹھہر ٹھہر کر چلتی ہے۔

اور جامن کے درخت سے سوکھے پتے جھڑ کر پکے فرش پہ گرتے ہیں تو تڑپ کر کوئل کُوکتی ہے۔

میں کھڑکی میں بیٹھ کر زمبا کا چہرہ دیکھتا ہوں۔ اس کے چہرے پر اب مہاسوں کے ویسے ہی داغ ہیں جو کبھی عطیہ کے چہرے پر نظر آیا کرتے تھے۔ مجھے اس کا سویا چہرہ جاگتا نظر آتا ہے۔ میں زمبا کی انگلی پکڑ کر عطیہ کے حضور جا کھڑا ہوتا ہوں . . . . اور پرانے حساب چکانے لگتا ہوں . . . . !

اتنے سارے سفر نے ایک ایسی محبت عطا کی ہے جو نہ عطیہ سے تھی نہ زمبا سے ہے۔ بس ایک ادھ ڈوبی کشتی کی طرح ڈوبنے اور ابھرنے کے درمیان غوطہ زن رہتا ہوں۔ اس درد کی کوئی تشخیص ہی نہیں کر سکتا۔ اس درد کے لئے کوئی اینٹی بایوٹک نہیں۔ کوئی ونڈر ڈرگ نہیں بنی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر عطیہ واپس آجاتی اور زمبا افریقہ چلی جاتی۔ پھر ہم دونوں اکٹھے رہتے اور میں ـــــ پھر بھی میں اس خوشی کو کبھی چھو نہ سکتا جو زمبا کے آنے سے پہلے ہماری تھی کیونکہ تجربے زندگی کو واپس نہیں کئے جاتے یہ سودا لوٹانے کے لئے نہیں خریدا جاتا۔

سنا ہے پچھلی جنگ میں جب جاپانیوں کے ہاتھ کچھ جنگی قیدی آجاتے اور انہیں سخت ترین سزا دینا مطلوب ہوتا تو قیدی کے سر کے بال منڈھوا کر اسے ایک ایسی ٹونٹی تلے باندھ کر بٹھا دیتے جس سے قطرہ قطرہ پانی کی بوند گرتی اور اس کے گنجے سر پر تواتر کا ہتھوڑا مارتی۔

یہی ایک بوند اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی۔

زمبا نے مجھے وہ سب کچھ دیا جس کی کوئی مرد خواہش کر سکتا ہے۔
عطیہ نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو ایک عورت کسی کے قدموں میں نچھاور کر سکتی ہے۔
میں نے ان دونوں سے ویسی ہی محبت کی جیسی کوئی سمندر کرتا ہے اپنے پرانے پانیوں سے اور اپنے نئے پانیوں سے۔

ہم تینوں نے کچھ نہیں کہا۔ کبھی ایک دوسرے سے نفرت نہیں کی، کسی پر الزام نہیں دھرا۔
ہم نے محبت کے زہر سے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔
پانی کی ایک ایک بوند سے،
قطرہ قطرہ ٹپکا کر . . . . .

سوغات

کوٹھے کی چھت سے نچلی منزل کے صحن تک کل سولہ سیڑھیاں تھیں لیکن شریفاں کو یوں لگتا تھا جیسے ایک ایک سیڑھی پر کنڈلی مارے ترشولی قشقہ لگائے کلر کے ناگ بیٹھے ہیں۔ سارے جسم سے اگست کے مہینے کی گرمی اُبل رہی تھی۔ پنڈلیاں جھوٹی پڑ چکی تھیں اور ایڑیوں کی پھٹی وائیوں میں خون سڑنے لگا تھا۔

وہ تلی ٹیک کتنی ہی دیر پہلی سیڑھی پر بیٹھی رہی۔ ریشمی ازار بند سے بندھا ہوا چابیوں کا گچھا چھوٹے بچے کے پیشاب کی طرح دوسری سیڑھی پر لٹکا رہا اور وہ جاگو میٹی گھر کی ٹلی ٹا کی سے بے خبر بیٹھی یوں فضا کو تکتی رہی جیسے کیکلی میں کسی ساتھن نے انگلیاں چھوڑ دی ہوں۔

کانوں میں ابھی تک تاجے کی آواز اُسے کیل رہی تھی۔

"تجھے نواستانی ہونا چاہیئے تھا۔ مولویانی ہوتی۔ جمعرات کی باسی تر باسی روٹیاں کھاتی تو عقل ٹھکانے رہتی تیری۔ ہزار بار تیرے لئے گوجرانوالہ سے تکے کباب لایا۔ جب کبھی وزیر آباد گیا تو کتنے کمانی دار چاقو آئے تیرے لئے۔ قصوری میتھی سے سارا گھر بھر دیا۔ جدھر جدھر میرا ٹرک گیا بول، سوغاتیں لایا تیرے لئے کہ نہیں؟ پر تجھے تو میرے اخلاق کی پڑی رہتی ہے۔ اپنی شرافت کی دھونس دے دے کر میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے تو نے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تو کنجری ہوتی بے عصمت ٹکرتی مجھے۔ کوئی پھنا تو نہ ہوتا ہمارے درمیان۔ جا جا کے کہیں منہ کالا کر لے خود بھی

جی اور مجھے بھی جینے دے۔ ایک یار چھوڑ دس یار بنا۔ پر مجھے آرام سے رہنے دے۔ کہیں جو تو پاک نہ بنی رہے تو میں کیوں مردوں ضمیر کی آگ میں بل جل کر۔ ایسا ہی جو تجھے مجھ سے پیار ہے تو ایکبار میری خاطر ہی کسی غیر کے ساتھ سو رہ۔ پھر تو مجھے کچھ کہنے جوگی تو نہ رہ جائے گی۔ بعد میں ہم دونوں برابر ہو جائیں ایکبار۔ ایک دفعہ سچا تو پیار ہو ہمارے درمیان ——— سچا پیار"۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ صبح عید میلاد النبی تھی۔ یوں تو عام طور پر اس وقت رات کو چپ سی لگ جایا کرتی تھی پر آج بازار سے بھونپو پر نعتیں پڑھنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ شریفاں بار بار سر جھٹکتی، کانوں میں انگلیاں لیتی پر نہ جانے کیا بات تھی لاؤڈ سپیکروں سے ماہی یثرب والے کے حضور نذرانہ عقیدت کسی موڑ پر کسی جگہ رکتا اور تاجے کی آواز نعت کی جگہ رات کی خاموشی میں گرجتی:

"پھر تو مجھے کچھ کہنے جوگی تو نہ رہ جائے گی بعد میں"۔

"ایسا ہی جو تجھے مجھ سے پیار ہے تو ایکبار میری خاطر ہی کسی غیر کے ساتھ سو رہ"۔

"تو نے اپنی شرافت کی دھونس دے دے کر میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے"۔

قافیہ ردیف کی قید سے آزاد یہ کلام اتنا ہی اونچا تھا جتنی کسی عقیدتمند کی آنسوؤں سے بھیگی آواز۔

ابھی تک تاجے کا ٹرک مسجد کے پچھلے احاطے میں نہ آیا تھا ورنہ یہاں تک اس کے ریس دیکر ٹرک بند کرنے کی آواز تاجے سے پہلے آتی۔ اس کے دائیں ہاتھ پچھلی ٹریفک دکھلانے والے آئینے کے ساتھ ہمیشہ ایک سیاہ موباف بندھا رہتا تھا۔ جب یہ ٹرک سڑک سے اوپر جانے والی کاروں کو بھی کراس کر کے سیدھی سڑک پر آگے نکلتا تو یہ موباف گویا ہاتھ ہلا ہلا کر پیچھے رہ جانے والی گاڑیوں کو الوداع کہتا۔ ٹرک کے پچھلے تختے پر آتشی گلابی پھولوں کی بیل کے اندر خدا حافظ کے اوپر لکھا تھا:

"جلنے والے جلا کریں"۔

خدا جانے تاجا کس کس سے یہ کہہ چکا تھا؟

شریفاں کو آج شبہ ہو رہا تھا کہ اب تاجے کو خدا کبھی گھر نہیں لائے گا۔ نشے میں چڑھی ہوئی شربتی آنکھیں، قمیض سے ذرا نیچے لٹکتا ہوا ازاربند، جیب میں دوسرے شو کی ٹکٹ کا آدھا پھٹا ہوا حصہ اور سر میں نہ جانے کس کے خواب؟ آج شریفاں کو یہ لگتا تھا کہ جیسے تاجے کی رہند کھوند میں سے جو آدمی رات کو پچھلے پہر آیا کرتا تھا شاید وہ بھی آج نہ آئے۔ اس خیال سے باری کے بخار میں جیسے اس کا جسم لرز اٹھا۔

کل سولہ سیڑھیاں تو تھیں۔ پرانی شریفاں ہوتی تو دو چار ڈنگے مار کر نچلے صحن میں جا پہنچتی۔ پر آج تو وہ لوگڑ کی بنی ہوئی گڈی تھی۔ پہلی سیڑھی پر بیٹھی کبھی ماضی کریدنے بیٹھ جاتی کبھی مستقبل کریدنے لگتی۔ اسے اپنے باپ کی باتیں یاد آتیں:

"بیٹا۔ ساری خلقت یا تو ماضی کے لئے روتی دھوتی ہے یا مستقبل کے خوابوں کیلئے پریشان رہتی ہے۔ اصلی خدا کا بندہ وہ ہے جو حال میں زندہ رہے۔ آج کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے۔ نہ مستقبل کے لئے پریشان ہو نہ ماضی کا احتساب کرے"۔

شریفاں کا باپ پڑھا لکھا تو نہ تھا پر لارنس باغ کی مسجد کے پاس گلاب کے تختوں کی گوڈی نلائی کرتے کرتے خدا جانے کیا کیا اس کے کان میں پڑتا رہا تھا کہ اس کی زندگی دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے کی طرح کلف زدہ، استری شدہ اور بے داغ تھی۔

جب پہلی بار شریفاں کا بھائی گلزار بڑے ہوٹل میں لفٹ گیری کرتا ایک دن شراب میں غٹ گھر آیا تو ابا کے کھردرے ہاتھوں پر سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ماں ہاں ہاں کرتی رہی لیکن ابا نے کھرپے کا ایک ہی وار ایسا کیا کہ بازو کا گوشت پھاڑ کر ہڈی تک اتر گیا اور لہو تراٹے سے نکلنے لگا۔

اماں میں اتنی ہمت تو نہ تھی کہ ابا کے سامنے اسے لعنت ملامت کرتی پر جب گلزار کی پٹی بندھ چکی اور وہ اسے گرم گھی اور دودھ پلا چکی تو اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اماں کے منہ سے ایک ہی بات نکلتی:

"میرا گلزار کب پینے والا تھا! روز ہی جو اس کے دماغ میں ایک ہی خیال بھرنے والوں نے

جھس دیا تو آخر انسان تھا، پینے پہ آمادہ ہو ہی گیا اُلّو۔ اس نے تو کبھی سالن کے ساتھ کچے پیاز نہیں کھائے بُو کی وجہ سے۔ وِسکی اور سوڈے سے کیا غرض اسے! پر ساتھیوں نے قسمیں دلا دلا کر صبح شام مراہندی پواندی بیٹھ بیٹھ کر پٹیاں پڑھائیں۔ آدمی کا بچہ کب تک کنارے بیٹھا رہتا۔ آخر کو کیچڑ میں لڑھک گیا نادان"۔

اصل واقعہ خدا جانے کیا تھا لیکن جب چوتھے پانچویں گلزار بولنے جوگا ہوا تو اس نے ساری باتیں شریفاں کو بتائیں۔ کہاں تو شریفاں نے اس کے کمرے میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب گھُتّی کی گیند بنی ہمیشہ اسی کے کمرے میں بیٹھی رہتی۔

ساری گلی میں صرف گلزار نے پانچ منزلہ مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ فائیو سٹار ہوٹل اندر باہر سے دیکھا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں معمولی لفٹ مین تھا اور کئی سیاسی لیڈر، مشہور فلمی ایکٹرسیں، گول گول پیٹوں والے سرکاری افسر جو لفٹ میں دبی دبی ڈکاریں لیا کرتے تھے اور جو سب کے سب تبخیرِ معدہ کے مریض تھے، بہت قریب سے دیکھے تھے۔ جب شہر اور ملک کی معزز، مقتدر اور صاحبِ اقتدار ہستیاں اس کے ساتھ لفٹ میں بند ہو جاتیں اور وہ اپنی ٹریننگ کے مطابق نظریں صرف بٹن پر رکھتا تو اس کے کان مائیکروفون کی طرح تیز ہو جاتے۔ چھ مہینوں میں اس کی کئی قدروں پہ پانی پھر گیا۔ کئی باتیں جو اس کے نزدیک بڑی معیوب تھیں اب قابلِ تحسین ہو گئیں۔ کئی باتیں جو قابلِ تحسین تھیں اب مضحکہ خیز نظر آنے لگیں۔ چھ ہی مہینے میں اس کا حال بالکل ایسا ہو گیا جیسے دستانہ اندر سے باہر کر دیا گیا ہو۔

لیکن امیر لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کے باوجود ایئر کنڈیشنر سے شگفتہ بند ہوٹل میں رہنے کے باوصف گلزار تھا بہت پرانے خیالات کا آدمی۔ کچھ باپ کا خوف غالب تھا کچھ بچپن کی ٹریننگ میں حرام حلال کے درمیان بار بار اتنی گہری کھائی کھود دی گئی تھی کہ بیچارہ BASEMENT میں کھانا کھانے جاتا تو چپ چاپ نظریں ملائے بغیر کھانا کھا کر چلا جاتا۔ پر آخر تو دلہن کا گھونگھٹ کھلتا ہے اور آدمی آدمی سے بات کرتا ہے۔ بیرا برادری، دھوبی، ہیلپر، روم سروس والے روز ملنے لگے اور اُسے

وردی میں چھپے ہوئے چہروں اور آوازوں کی شناخت ہونے لگی تو رابطے بڑھے، بے تکلفیاں پیدا ہوئیں اور خدا بخش، قادر اور یار محمد کے ساتھ اس کی گاڑھی چھننے لگی۔ ہوٹل کے اوقات کے بعد وہ تینوں اکٹھے ہی اس کے ساتھ ہوٹل سے نکلتے اور صبح وردیاں پہننے کے وقت بھی کیو میں وہ عموماً آگے پیچھے ہوتے۔

یہ تینوں بدیسی مسافروں کو بہت پسند کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں DRINKS پلایا کرتے۔ خدا بخش بھوری مونچھوں والا کڑکا کیڑا حسین قسم کا جوان تھا اور مالاکنڈ سے آیا تھا۔ قادر کا بچپن سندھ میں گزرا اس لئے وہ جی سائیں اور انشاءاللہ کا استعمال بہت کرتا۔ یار محمد کے کچھ دھولے آ چکے تھے اور وہ کبھی کبھی دانت کے درد کا رونا بھی رویا کرتا تھا لیکن تھے تینوں یار زندہ صحبت، باقی قسم کے فرد۔ بڑی سے بڑی انکوائری کو ہیچ سمجھتے۔ جب بیئر کی بوتلوں پر گھپلا پڑا اور سٹور کی انچارج اطالوی میڈم نے سارے ملازموں کو فال اِن کرایا تو ان تینوں کے علاوہ سب کے چہروں پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں حالانکہ بیئر کی بوتلیں بیچ کھیت انہوں نے غتر بود کی تھیں۔

جب بھی خدا بخش وِسکی کو منہ سے لگاتا تو ایک ہی بات کہتا:

"خدا قسم! گلزار تم بے نصیب اے۔ تم ایک دفعہ پیدا ہوا ہے چھپکلی کی زندگی بسر کرے گا اور چوہے کی موت مرے گا۔ ہم شیر کی زندگی بسر کرے گا اور شہید کی موت مرے گا۔ سینے پر گولی کھا کر۔ تم تو زنانی ہے زنانی"

قادر شہباز قلندر کی قسم کھاتا۔ پھر سیہون شریف کے گہرے پانیوں کو یاد کرتا اور حاملہ عورتوں کی طرح ابکائی لے کر کہتا:

"پی لے یار گلزار، میری خاطر پی لے۔ سارا گناہ خدا قسم میرے سر۔ میں تجھے اللہ قسم کیسے بتاؤں میرا پیر کتنا تگڑا اے۔ یہ تو شراب ہے جو تو قتل بھی کر دے تو بخشوا دوں سچی سرکار سے۔"

سب سے چاتر کھچڑی پکے بالوں والا یار محمد تھا وہ مونچھوں کو زبان سے چاٹتا ہوا بولتا:

"یہ ہمیں شرمندہ کرتا ہے خدا بخش! ہمیں سمجھاتا ہے کہ یہ اتنا اونچا ہے اور ہم . . . .

یہاں ہیں، یہاں!"

وہ ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا اور دوسرا پیروں کی طرف۔

جس روز گلزار شراب پی کر گھر آیا اس روز نیو ایئر ڈے تھا۔ گلزار گھر کہہ گیا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا اس لئے سب جلدی سو گئے اور ماں نے اس کے لئے کھانا نہ رکھا تھا۔ جب رات کو نو بجیں دغیں، ناچ والے ہال میں زور زور سے تاشے بجے، بتیاں بجھا کر سارے لوگوں نے اونچے اونچے شراب کے پیالے اٹھائے اور ہیپی نیو ایئر ٹو یو کے نعرے سن کر گلزار کے لوں کنڈے کھڑے ہو گئے تو اسے لگا کہ واقعی نیا سال خوشیوں کے پالنے میں جھولنے والا نوزائدہ بچہ ہے جو اسکی آغوش میں پھلے پھولے گا۔ سارے ہال میں مسکراہٹیں تھیں، موسیقی تھی اور شراب کی خوشبو تھی۔ ایک بار ماں کچھ انجیریں چھابے میں رکھ کر بھول گئی تھی۔ صبح سارے گھر سے ایسی ہی خوشبو کے بھبکے اٹھتے تھے اب گلزار کو یہ پینے پلانے والے بہت معصوم نظر آنے لگے تھے۔ وہ روز روز یہ منظر دیکھ کر اب اسکے ساتھ گناہ کا تصور لانا بھول چکا تھا۔ خدا بخش، قادر اور یار محمد ویسے بھی پینے پلاتے اسے بُرے نہ لگتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے کبھی خود شراب کو منہ نہ لگایا تھا۔

اس روز BASEMENT میں بھوسوں کے انبار کے پیچھے جب خدا بخش لڑکھڑا کر بوتل اس کی طرف لے کر بڑھا تو گلزار اندر ہی اندر لرز گیا۔

"یار تھوڑی سی پیو۔ ایک دفعہ دیکھو تو سہی کیسا مزہ ہے۔ اس کا مزہ چکھے بغیر ہی مر جائے گا ظالم!"

گلزار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"مت کہو اسے پینے کو۔ تمہارے کہنے سے یہ مان سکتا ہے؟ یہ میری مانے گا۔ لو گلزار! آج پی لو۔ پھر کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ خدا قسم! نئے سال کا شگون ہے۔ پی لے میرے یار!"

"مت کہو اسے۔ جانے دو اسے جنت میں۔ بننے دو ہمیں دوزخ کی آگ۔ یہ یاروں کا یار ہی نہیں ہے۔ اس کی چادر میلی مت کرو۔ جا بھئی گلزار لفٹ چلا جا کر۔ ہم بیرا برادری میں کیوں

آگیا ہے دوزخیوں کے پاس۔"

خدا جانے کیا بات تھی پر آج یار محمد تھوڑی سی بلیک اینڈ وائٹ چڑھا کر سسکنے لگا۔ اس پر عجیب قسم کی ندامت و پریشانی اور زود رنجی طاری تھی۔

"میں تمہارا دوست ہوں یار محمد۔" گلزار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"پلید آدمیوں کا کون یار ہوتا ہے گلزار میاں۔ ہم تو دوزخ کے قابل ہیں۔ دوزخ کی آگ جلتی ہے ہمارے جسموں سے۔ تجھے جنت کی ہوائیں راس آئیں۔ اللہ خوش رکھے تجھے۔ تیرا ہمارا کیا ساتھ...

جانے دو اسے دوستو۔ خواہ مخواہ ——"

یار محمد اپنے سفید بالوں سمیت چھوٹے بچوں کی طرح رونے لگا۔ گلزار اس کے پاس بیٹھ کر بڑی ندامت سے سمجھانے لگا —— "خدا کے لئے مت روؤ یار محمد! میں معذور ہوں میری طبیعت نہیں مانتی۔ میں نے اب تک کبھی اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ مجھے معلوم بھی نہیں کہ اس مردود کا مزہ کیسا ہے مجھے اس سے ہمک آتی ہے۔"

یار محمد خود ترسی کے کنوئیں میں اور گر گیا۔

"یاروں کے یار وہ ہوتے ہیں جو انجام نہیں دیکھتے۔ جو پوچھتے نہیں کہ کیوں اور کیسے... جو بن پوچھے پھانسی چڑھتے ہیں۔ پر ہمارا کون دوست۔ ہمارا کون سا یار؟"

"میں تمہارا دوست ہوں۔" گلزار پر نیو ایئر کی رات کا عجب کیف آور سا اثر تھا جیسے نئے سال نے اس سے خوشیوں کا وعدہ کر لیا تھا چپکے چپکے۔

"میں تجھے نہیں کہتا کہ پی تیارہ۔ ہماری طرح عادی ہو جا اس کپتی چیز کا۔ میں تو تجھے کبھی برباد نہ ہونے دوں اس بدبخت کے لئے۔ پر ہم سے اونچا رہ کر تو نہ سوچ۔ ہمارے پاس تو برائیوں کی سوغات ہے۔ تو دوست ہے تو ایک بار منہ لگا۔ ہماری سطح پر آ جا۔ پھر چاہے واپس چلا جانا۔ ہم تیری نگاہوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تیرے ساتھ رہ کر ہمیں اپنے آپ سے بُو آتی ہے۔"

پھر یار محمد پر رونے کا دورہ پڑ گیا۔

جب سے گلزار اس منڈلی کا سرپنچ ہوا تھا شراب پینا گناہ تو رہا ہی نہ تھا۔ بس ایک رڑک سی لگی تھی، ایک جھجک سی تھی جیسے کنڈی سیدھی لگی ہو۔ دائیں بائیں موڑ کر مضبوط نہ کی گئی ہو۔ ذرا سا دھکا لگے اور کھٹ سے آپ ہی آپ کھل جائے ـــــ جب گلزار نے وسکی کا گلاس ہاتھ میں لیا تو وہ صرف اپنے دوستوں کو خوش کرنے کی آرزو دل میں رکھتا تھا۔ ان تینوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ گلزار کے کانوں میں ہیپی نیو ایئر کے نعرے اور زور زور سے تاشے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسنے ایک ہی ڈیک میں آدھا گلاس چڑھا لیا۔

تینوں دوست اس سے لپٹ کر بے تحاشا اسے چومنے لگے۔ گلزار کی آنکھوں کے عین پیچھے محدب شیشے میں جو دو موم بتیاں روشن تھیں وہ ان بوسوں کے ارتعاش سے بجھ گئیں۔

عید میلادالنبیؐ کی وجہ سے ابھی بھی بازار کی طرف سے لاؤڈ سپیکر پر بجتی بجھی آوازیں کوئی گا رہا تھا۔ ۔

کتھے مہر علیؒ، کتھے تیری ثناؐ

گستاخ اکھیں کتھے جا لڑیاں

شریفاں اوپر والی سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ نیچے سولہ سیڑھیاں اتر کر صحن میں زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں چنبیلی کا بوٹا ٹوٹے ہوئے کنستر میں اکھڑا اکھڑا کھڑا تھا جیسے گھر جانے کی اجازت طلب کر رہا ہو لیکن دل ہی دل میں ڈرتا بھی ہو۔

شریفاں کا دل ہر قسم کے دکھ سے خالی تھا۔ بارش کے بعد دھلے ہوئے آسمان کی طرح ایک بھی غم اس کے دل پر نہ تھا اور پھر بھی دل تھا کہ پنی ہوئی چھاچھ کی طرح بالکل خالی سا تھا۔ آج اسے ذرا فکر نہ تھی کہ اگر ٹرک کی کہیں ٹکر ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اس کے ذہن میں تاجے کے تیز رفتار ٹرک سے اسکا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ تاجے کو تو شروع دن سے اس سے محبت نہ ہوئی پر جو یک طرفہ ٹریفک شریفاں کے دل کی طرف سے جاری تھا وہ بھی یکدم بند ہو گیا۔

تاجے نے بڑے ترلے منتوں سے شریفاں کے ساتھ شادی کروائی تھی۔ شریفاں کا باپ تھا تو

لارنس گارڈن کا مالی پر ساری برادری میں اس خاندان کی بڑی دھوئی دھائی سی عزت قائم تھی تاجے کے ٹرک کا صرف ان رشتہ داروں پر کچھ رعب نہ گٹھتا تھا۔ تاجے کی ماں نے بڑی لڑکیوں کے نام گنوائے پر تاجے کے دل میں تو ایک ہی شریفاں کی بیچ کا نٹھ پڑ گئی تھی۔ شریفاں کو پسند کرنے کا اس منظر کچھ اتنا انوکھا تو نہ تھا پر تاجے کو متاثر ضرور کر گیا تھا۔

بہن خورشید کے منجھلے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ خوب ذات برادری کا اکٹھ ہوا۔ تین دیگیں پلاؤ کی اور ایک دیگ زردے کی اتری تھی۔ تام چینی کی تھالیوں میں ٹیسی ٹیسی اٹھتے ہوئے پلاؤ پر ایک بوٹی اور روغنی پیالوں میں دو دو آلو اور ایک ایک بوٹی کا حساب لگاتی خورشید پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ براؤن پالش سا اس کا رنگ اس کھیچل سے تتا ہوا تھا۔ وہ حصے بانٹتی جاتی تھی اور گھر کی جوان لڑکیاں لپک جھپک کر پلاؤ کی پلیٹیں اور پیالے اندر مہمانوں کو پہنچا رہی تھیں۔ ٹھیکے ہوئے دستر خوانوں پر جا بجا چاول بکھرے ہوئے تھے۔ بچے ضدیں کر رہے تھے۔ عورتیں آتشی گلابی، گہرے فیروزی اور طوطیا ہرے رنگ نائیلون کے سروں پر سے کھسکتے دوپٹے سنبھالتی پلاؤ شوربہ کھانے میں مشغول تھیں۔

فرش پر بکھرے ہوئے چاولوں کے مارے شریفاں پنجوں کے بل چلتی تیز تیز خورشید تک پہنچتی اور پھر تھالیاں اٹھائے اندر سیلے کمروں کی طرف چلی جاتی۔ ایسے میں جو ایک بار گزری تو تاجا دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ چلتی پھرتی لڑکیوں سے بھڑ کر گزر جانا اس کا معمول تھا۔ شریفاں کے چھوٹے سے ناک پر پسینے کے ننھے ننھے بلوریں قطرے تھے۔ اوپر والے ہونٹ پر ایک ابھرواں سا تل تھا۔ آنکھیں چیتے کی طرح زردی مائل اور بالوں کا رنگ بھورا تھا۔ کانوں میں پلاسٹک کے بندے اور کلائیوں پر کانچ کی سرخ چوڑیاں تھیں۔ شریفاں کی سجاوٹ کچھ اپنے طبقے کی سستی اور معمولی زیبائش سے مختلف نہ تھی لیکن نائلون کے کپڑوں اور پلاسٹک کے زیوروں کے باوجود وہ اس سارے مجمع میں بڑی علیحدہ قد آور مہارانی سی لگ رہی تھی۔

تاجا شریفاں کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ ہمیشہ سے وہ ایک ہی مقولے پر عمل کرتا رہا تھا کہ ہنسی اور پھنسی، چبھتی سی کوئی بات، کئی گھسے پٹے لطیفے، ویدہ دلیری، کئی دھوبی پٹڑے اسے یاد تھے۔

پر اب شریفاں کو ہنسانے کے لئے وہ لاکھ لاکھ سوچتا رہا لیکن جتنی بار شریفاں زناٹے سے گزری اتنی ہی بار وہ دہلیز تک پہنچا اور پھر راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

خورشید کے بیٹے کا عقیقہ کیا ہوا تلجے پر تو شادی کا بھوت سوار ہو گیا۔ پہلے جب کبھی وہ کسی نالے کے کنارے پر سے بجری بھر کر اپنی ٹرک میں لایا کرتا تو یہی خواہش کرتا کہ ساری عمر شادی نہ ہو۔ گجرات میں اس کے کئی ٹھکانے تھے۔ گوجرانوالے میں اس کی کئی واقفیتیں تھیں۔ ایمن آباد، وزیر آباد گکھڑ، سیالکوٹ جہاں کہیں بھی وہ جاتا خدا جانے کیسے اس کے گرد کہانیاں ہی کہانیاں لپٹ جاتیں۔ تلجے کی کاٹھی بڑی خوبصورت تھی۔ اوپر سے کشمیری رنگت اور پٹھانوں جیسی مضبوطی۔ قد بھی کھڑے کھمبے جیسا تھا۔ اگر پینٹ کوٹ پہنا دیا جاتا تو کسی فارن فلم کا دلِن نظر آنے لگتا۔ اب بھی سفید شلوار قمیض کے اوپر گلے میں مفلر ڈالے اور ماتھے پہ بالوں کو کھلا چھوڑے کسی در کو کھٹکھٹاتا تو اندر کھڑکیوں اور کواڑوں کے پیچھے سے لڑکیاں اسے ایک نظر ضرور دیکھتیں۔

شریفاں سے شادی ہوئی تو اس کے کچھ یہ معنی نہ تھے کہ تاجا عشق کا گھائل ہو گیا تھا۔ تاجے کے دل میں بیوی اور گھر والی کا جو تصور رہا اس تصور پہ . . . . . ایک سے زاویوں کی طرح شریفاں فِٹ آتی تھی۔ جب تلجے نے شریفاں کا گھونگھٹ اٹھایا تو شعلہ پوری نہر کے پلے کی پشت میں دمکتا چاند دیکھ کر تاجا کچھ دیر کے لئے گنگ ہو گیا۔ پنجابی فلموں کی ایکٹرسوں کی مانند شریفاں بڑی صحت مند اور جی دار نظر آئی اور تاجا تو دن میں تین تین شو دیکھنے والا شوقین تھا، بری طرح شریفاں کے درپے ہوا۔

اپنے طور پر اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق تلجے نے شریفاں سے بڑی بھرپور محبت کی لیکن منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے یا بطور نقل جب کبھی وہ ادھر ادھر دل لگا بیٹھتا اور شراب کے نشے میں شریفاں کو سارے حالات بھی بتا دیتا تو بڑی سرد جنگ گھر پہ جاری ہو جاتی۔

شریفاں ٹھنڈی قلفی بن جاتی۔

دوسرے دن وہ علی الصبح ازار بند بننے کا اڈا دیوار کے ساتھ لگا کر بیٹھ جاتی اور اس کے انگوٹھے

انگلیاں اس تیزی سے تانے بانے میں سے گزرتے کہ لگتا چھوٹی چھوٹی چھریاں دھلے گھے بچا کر نکلتی جا رہی ہیں۔ شروع شروع میں تو تاجا پریشانی کے عالم میں دبک کر باہر نکل جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے اس خاموش جنگ سے چڑ ہو گئی۔ اب وہ گلے میں ریشمی مفلر لپیٹے چھوٹی موٹی جنگ کئے بغیر ٹرک کی چابی طاق سے نہ اٹھاتا۔

"کیا سمجھتی ہے تو اپنے آپ کو۔"

شریفاں سوا سوا انچی پلکیں اٹھاتی اور پھر جھکا لیتی۔

"بازاری عورت تھی وہ۔ پیسے دیئے تھے میں نے سوا سیر انگور خرید لیا ویسے۔"

شریفاں اب بھی انگوٹھے چلائے جاتی۔

"تو بولتی کیوں نہیں"۔

"کیا بولوں"۔

"تیرا خیال ہے کہ۔ کہ میں تجھ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تیرا خیال ہے کہ تیرے منہ بنانے سے بات بدل جائے گی۔ طبیعت میں فرق آجائے گا میری"۔

"میں یہ کب کہتی ہوں"۔ شریفاں آنسوؤں میں بھیگی آواز میں بولتی۔

"تو کیا کہتی ہے تو۔ میں کوئی دوسرا نکاح پڑھوانے جا رہا ہوں جو تو باگڑ بلی بنی ہوئی ہے"۔

اب شریفاں کے آنسو ٹپ ٹپ کھڑے زانو کے لٹھے میں جذب ہونے لگتے۔

"مجھے دھونس اچھی نہیں لگتی شریفاں۔ خدا قسم تو مجھے ان آنسوؤں کا رعب نہ دیا کر۔ جو تو سمجھتی ہے کہ میں دبکے میں آجاؤں گا تو غلط خیال ہے تیرا۔ عورتوں کے لئے اپنا طریقہ بدلنا مردوں کا کام نہیں۔ ہاں"۔

چھوٹی چھوٹی جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ دیگماں لگنے سے شریفاں کا پالش بھی اکھڑ گیا۔ پہلے وہ دبی زبان میں گلہ کرنے لگی:

"جا تلجے۔ دیکھی ہوئی ہے تیری محبت، رہنے دے بھائی پھیرو کے بیڑے۔ کوئی اثر نہیں ہوتا

ان سوغاتوں کا مجھ پر۔ محبت کوئی ان باتوں سے تھوڑی ہوتی ہے"۔

تاجا بلبلا کر اپنی وکالت کرتا:

"کیا کروں شریفاں۔ بری عادت پڑ گئی ہے۔ اچھی عورت دیکھ لوں تو پھر ارد گرد کچھ نظر نہیں آتا مجھے۔ خوب پتا ہوتا ہے کہ بس موسمی پھل ہے پر جب دل میں جھلار اٹھتی ہے تو دماغ کام نہیں کرتا۔ بول، میں کیا کروں؟ تو خواہ مخواہ دل نہ میلا کیا کر۔ دل میرا تو سدا بہار تیرا ہے"۔

ان جنگوں کے بعد سرزنش اور دھمکیوں کا دور آیا۔ میکے جانے اور زہر کھانے سے لے کر قتل کر دینے اور خاندان والوں میں حالات نشر کر دینے کی باتیں جب چل نکلتیں تو تاجا بھی چڑھی آندھی کی طرح بپھر جاتا۔

نلے میں کوئی ڈرتا ہوں کسی سے۔ تو میاں جی کو کیا سارے شہر کو بتا۔ ریڈیو پاکستان کی کمرشل سروس میں نکلوا دے کہ تاجا بے ایمان ہے۔ ہری چگ ہے۔ دوسری عورتوں سے اس کے تعلقات ہیں کہہ دے، کہہ دے سب سے۔ میں کوئی ڈرتا ہوں تجھ سے۔ میرا اپنا ٹرک ہے۔ کسی سے لے کر کھاتا ہوں میں کیسی کی کمائی کا آسرا ہے مجھے"۔

لڑائی کی پینگ جب خوب چڑھ جاتی تو تاجے کی طرف سے پسپائی کا رنگ ظاہر ہونے لگتا۔

"دیکھ بھلی لوک کیوں ہڈیاں تڑواتی ہے اپنی۔ جتنی ساری کھے ہیں کھاتا پھرتا ہوں اس کا بوجھ تجھ پر ڈالوں تو تیری ہڈیاں چور ہو جائیں۔ سمجھ تو سہی۔ کم بخت۔ اپنے ہاتھوں پہ کانچ کا برتن توڑ لوں"۔

اس لڑائی جھگڑے کا دور ٹھنڈا پڑتا تو شریفاں بڑی مذہبی ہو گئی۔ تڑکے نماز پڑھ کر وہ سات بار سورۃ الناس پڑھتی اور جب تاجے کے چہرے پر پھونک مارتی تو تاجا رضائی کے اندر منہ کر کے کہتا ——— "نہ کری جاجا دو۔ نہ پھونکیں مار میرے اوپر۔ رہنے دے میرے اندر شیطان کو بڑا انگ ملتا ہے اس سے رضائی جیسا"۔

جمعرات کے جمعرات گڑ کے چاول پکا کر وہ بچوں کو کھلاتی۔ گیارہویں شریف کی نیاز اب باقاعدہ دی جانے لگی۔ مسجد میں ایک دیا بھی اس کے نام کا روشن ہو گیا۔ قرآن شریف کی جولی نے آنسوؤں کے

کھاری پانی کی وجہ سے رنگ چھوڑ دیا لیکن بنانے والے نے جب تاجے کا رنگ نہ بدلا اور کوئی نصیحت اسے نہ کرائی تو شریفاں کدو کی ہری بیل میں سوکھے پھول کی طرح لٹکی رہ گئی۔ اب اٹھتے بیٹھتے لمبے ہوکے، سرد سرد آہیں، روئی روئی سی آنکھیں تھیں۔ چال میں عجیب ڈھیلا پن سا آگیا۔ چہرے پر وہ تازہ سیب کی سی چمک نہ رہی۔ اوپر والے ہونٹ کا تل اب کلیجی مائل لبوں پر نظر بھی نہ آتا۔

جب شریفاں تاجے کو مین لائن پر نہ لا سکی تو خود گھڈے لائن لگ گئی:

"کیا ہوا ہے تجھے اب"۔

یہ سوال کئی بار تاجا پوچھتا اور پھر خود ہی جواب دے دیتا: "میرا ہی قصور ہے سارا۔ نہ بتاتا تجھے اپنی باتیں۔ چپکے چپکے دودھ ملائی کھانے والی بلی اچھی۔ بھونک بھونک کر رانب کھانے والا کتا برا۔ خود کلہاڑی ماری میں نے اپنے پاؤں پر۔ خود دشمن بنایا میں نے تجھے اپنا۔ سارے مرد باہر جا کر جو کچھ کرتے ہیں کوئی گھر آ کر تھوڑی کرتوت بتا دیتے ہیں بیوی کو"۔

شریفاں ان دنوں بس حج پہ جانے کے خواب دیکھتی رہتی۔ محلے میں جو بھی عورت حج کر آتی اس کی دوست بن جاتی:

"شریفاں۔ مکے میں تو اللہ کی حاضری ہے پر روضۂ مبارک کو جب دیکھے گی تو غش کھا جائے گی۔ کالی کملی والے کے دربار میں تو کوئی دکھ رہتا ہی نہیں جی کو۔ سب کی سنتا ہے وہ۔ سب جانتا ہے وہ"۔

کوئی حجن مقامِ ابراہیمی کی باتیں کرتی۔ کوئی منا کی سناتی۔ کوئی جدہ کے سفر سے شروع ہو کر واپس جدہ تک پہنچتی۔ شریفاں نے دل ہی دل میں کئی بار شیطان کو کنکریاں بھی ماری تھیں۔ پر شیطان اتنی چھوٹی کنکریوں سے ماننے والا تھوڑا ہی تھا۔ وہ تو کوہِ سفید میں بھی دب جاتا تو کبھی نہ مانتا۔

ان ہی دنوں جب بہشتی زیور، یازدہ شریف اور تسبیح اس کی زندگی کا جزو ہوئی۔ وہ لمبی لمبی آہوں کے درمیان کبھی کبھی تاجے کو نصیحت کرنے لگتی:

"تاجے مجھے چھوڑ، میری خاطر نہ سہی اپنی خاطر یہ بے حیائی چھوڑ دے۔ خدا قسم بڑی سزا

ملے گی تجھے"۔

'کوڑھی ہو جاؤں گا۔ آتشک کا روگ ہو جائے گا مجھے۔ ہونے دے۔ میں سزا سے نہیں ڈرتا بادام کھاتے اگر دانت ٹوٹ جائیں تو کاہے کا ڈر۔"

عید میلاد النبیؐ سے پہلے کا ذکر ہے کہ تاجا بجری کا ٹرک گلبرگ اتار کر آیا۔ نہا دھو کر جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو شریفاں اس کے سامنے کھانا پروس کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر تاجا بھنڈیوں کے پکے پکے بیج نکال کر بھنڈیاں کھاتا رہا اور پھر گرج کر بولا:

'کہاں مر گئی ہے تُو۔ پاس آ کر کیوں نہیں بیٹھتی۔"

شریفاں چپ چاپ پاس آ کر بیٹھ گئی۔

'اب کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

'میں گلبرگ میں بجری ڈال کر آیا ہوں کسی معشوق کے گھر سے نہیں آیا۔"

شریفاں خاموشی سے اپنی گتھڑ پہ دھاگے کا آٹھ بناتی رہی۔

"بولتی کیوں نہیں۔"

"بول تو رہی ہوں۔"

"ہنس کر کیوں نہیں بولتی۔"

سوکھے ملٹے کی پھانک جیسی مسکراہٹ پیش کرتی ہوئی شریفاں بولی:

"تاجے! اخلاق بڑی چیز ہے۔ شرافت بڑی دولت ہے۔ یہ جو کھے سواہ کھاتا ہے تو کسی اچھی عورت سے نکاح ہی پڑھوا لے۔ جائز تو ہو سب کچھ۔"

'میں تیری طرح حرام حلال کے چکر میں نہیں پڑتا۔"

'میں سمجھ گئی ہوں تجھے۔ جیسی بیوی تجھے درکار تھی ویسی میں نہیں ہوں۔ میں تجھے روکتی تھوڑی ہوں۔ جس سے بھی تو شادی کرے گا میں اسے بہن سمجھوں گی۔ شرع شریعت میں شرم کیسی؟"

"اوئے لا کھ تجھے کہا ہے میں سوائے تیرے کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔ کوئی ایسی جمی ہے تیری بہن بننے والی۔ پر تُو مجھ سے گناہ کروا کے رہے گی دوسری شادی کا۔"

ٹھن سے پیتل کا گلاس چوکی سے گرا اور فرش پر جھیل سی بن گئی۔

"تاجے! خدا قسم مجھے تیرا بڑا فکر ہے۔ تُو حج کر لے پر یوں گلی گلی آوارہ نہ پھر۔ اللہ رسولؐ کے احکامات کو مان لے۔ دوزخ کی آگ سے بچ جائے گا۔ نبی کریمؐ نے کہا ہے۔۔۔۔"

منہ کی طرف اٹھا ہوا لقمہ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے تاجا اُٹھ گیا اور گرج کر بولا:

"خدا قسم روٹی حرام کر دی تُو نے۔ تجھے تو استانی ہونا چاہیئے تھا کسی پرائمری سکول میں۔ کسی مولوی کے گھر ہونا چاہیئے تھا۔ باسی تباسی روٹی کھاتی تو عقل ٹھکانے رہتی تیری۔ ہزار بار گوجرانوالے سے تکے کباب لایا تیرے لئے۔ بول کتنے کمانی دار چاقو آئے تیرے لئے۔ قصوری میتھی، اندر سے سیر دن کے حساب آئے۔ آئے کہ نہیں۔ جدھر ٹرک گیا میرا سوغاتیں لایا کہ نہیں تیرے لئے۔ پر تجھے تو میرے اخلاق کی پڑی رہتی ہے۔ اپنی شرافت کی دھونس دے دے کر زہر گھول دیا ہے میری زندگی میں۔ اس سے تو بہتر تھا تو کنجری ہوتی۔ بے عصمت ٹکرتی مجھے۔ کوئی تہنا تو نہ ہوتا ہمارے درمیان۔ جا، جا کے کہیں منہ کالا کر اپنا۔ خود بھی جی۔ مجھے بھی جینے دے۔ ایک چھوڑ دس یار بنا۔ خدا قسم جو مجھ سے ایسا ہی پیار ہے تو کسی غیر کے ساتھ سو رہ میری خاطر۔ تیری بھی زبان بند ہو جائے گی۔ میری طرح گنہ گار ہو کر کسی یار کے ساتھ نکل جا دو چار دن کے لئے۔ پھر ہم دونوں برابر تو ہو جائیں گے۔ کیوں مار رہی ہے مجھے ضمیر کی آگ میں جھونک کر۔"

تاجا بولتا گیا اور بولتا بولتا کنڈی کھول کر باہر چلا گیا پر شریفاں اپنی جگہ ہی مینخ گئی۔

بڑی دیر بعد اٹھی تو نچلے دھڑ میں عجیب قسم کا درد ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی تاجا ٹرک لے کر چلا جاتا وہ بڑے اطمینان سے گھر میں بیٹھی کام کاج میں مصروف رہتی پر آج تو گرے ہوئے گلاس سے بھی اسے خوف آ رہا تھا۔ کھڑے کھڑے جب پیروں میں سوئیاں چبھنے لگیں تو وہ اپنے ازار بند کا اڈا لیکر کوٹھے پر چڑھ گئی۔

نومبر کی نیم گرم دھوپ کمر پر دو تین گھنٹے پڑی اور گرمی سے چمڑے جلنے کی بو آنے لگی تو وہ اٹھ کر مُنڈیر سے تہ نشیں میں جا بیٹھی۔ اس سے پہلے یوں نیچی منڈیروں والے کوٹھے پر وہ اتنی دیر کیلئے نہ آئی تھی۔ عجیب سا محلہ تھا۔ دیوار کوٹھے پھلانگ کر آدمی سیدھا نکڑ والی پرچون کی دکان تک پہنچ سکتا تھا۔ بجلی کے کھمبے کوٹھوں پہ لگے نظر آتے تھے۔ اونچے مکانوں پر ٹیلی ویژنوں کے لگے ہوئے انٹینے، بانسوں سے بندھی ہوئی ڈوریاں اور تاریں اور ان پر کھلے آسنوں کی دھلی دھلائی شلواریں چوڑ چوٹ پڑی تھیں۔

آسمان بہت نیلا تھا اور اس دُھلے آسمان میں چیلیں چھوٹی چھوٹی پتنگوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔

پتا نہیں کیوں آج پہلی بار شریفاں زانوؤں پر ہتھیلیاں رکھے خالی الذہن بیٹھی تھی۔ سارے حربے ختم ہو چکے تھے۔ اس سے آگے کونسا راستہ ہے؟ اس سے آگے کونسی گلی کھلتی ہے؟ وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتی۔ پوچھتے پوچھتے اور سوچتے سوچتے جب اس کا ذہن خالی ڈبے کی طرح ہو گیا تو اس نے سامنے نگاہ کی۔ سنار حصے کے مکان سے لگلے مکان کی منڈیر پر دہ بیٹھا شیو کر رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی کئی بار شریفاں نے ایوب کو دیکھا تھا اسے معلوم تھا کہ ایوب مال کی ایک فیشن ایبل ڈرائی کلینرز کی دکان پہ ملازم تھا اور اسی لئے سارے محلے میں اس کے کپڑے اتنے اجلے ہوا کرتے تھے۔ پر کھلی آنکھوں اور خالی ذہن سے پہلی بار اس نے ایوب کا استقبال کیا۔ ادھر ایوب بھی غالباً دکانداری میں جی حضوری کرتا کرتا تھک گیا تھا۔ نومبر کی دھوپ میں تمتمایا چہرہ دیکھا تو اپی کلرک بھول گیا۔ ڈرائی کلینگ کی دکان پہ بڑے بڑے پرسوں والی عورتیں فینائل کی خوشبو میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے گٹھڑ لایا کرتی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے باوردی ڈرائیور بھی عموماً ہوا کرتے تھے۔ وہ دوپٹے کی رنگائی اور سوٹ کے ڈرائی کلینگ پر عموماً آٹھ آنے یا روپے کے لئے اس سے یا تو جھگڑتی تھیں یا فلرٹ کرنے کے انداز میں بڑی نرمی بھی ہو جاتی تھیں۔ آج پہلی بار شہ نشیں پر ایسی بیگات میں سے ایک بیٹھی ہوئی تھی لیکن نہ تو اس کا طریقہ نہ لباس ایسا تھا کہ ایوب مرعوب ہو جاتا۔

عید میلاد النبیؐ کی رات تھی۔

سیڑھیوں کی بتی جلا کر جب کوٹھے ہی کوٹھے شریفاں ایوب کی برساتی میں پہنچی اور ایوب نیچے

سے اپنا بستر اور ایک گاہک کی ساٹن کی سنجاف والا کمبل لے آیا تو شریفاں کو عجیب جھرجھری سی آ گئی۔ کوٹھے پر صرف ایک اینٹ کی جالی دار دیوار کا پردہ تھا۔ یہاں ڈھیلی چارپائی پہ بستر بچھا کر جب وہ دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے تو ایوب دروپدی کی ساڑھی کی طرح کھلتا ہی چلا گیا۔

"تم بہت خاموش ہو شریفاں"۔

سوا سوا انچی پلکیں اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

شریفاں کو ریل کے ڈبے جیسی یہ نیم چھتی، سڑک کے کھمبے سے در آتی روشنی، قریب والے بازار سے پکنے والے دودھ کی خوشبو، ڈرائی کلین کئے ہوئے ایوب کے کپڑے، سب سے عجیب قسم کی الجھن ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ ان سارے حالات میں ایک سنسنی خیز سا جسکا بھی مل رہا تھا۔ اس سے پہلے کسی نامحرم سے بات کرنے کا اتفاق بھی کم ہوا تھا اور اب وہ دونوں اس طرح جڑے بیٹھے تھے جیسے دو امرود ساتھ ساتھ ایک ہی ٹہنی سے اُگے ہوں۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہے شریفاں" ایوب نے بارہویں مرتبہ سوال کیا۔

اور شریفاں نے اپنے دوپٹے کی تاریں نکالتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

ابھی تک تاجے کا ٹرک احاطے میں داخل نہ ہوا تھا۔ شریفاں کے کان ادھر ہی کو لگے تھے۔ تاجا ہمیشہ ریس دے کر ٹرک بند کرتا۔ جونہی رات گئے اس کا ٹرک احاطے میں گھستا، دو تین کتے مسلسل بھونکنے لگتے اور بڑی دیر تک بھونکتے رہتے۔

"اب کیا سوچ رہی ہو شریفاں؟"

شریفاں نے ملاٹے کی خشک پھانک جیسی مسکراہٹ پیش کر دی۔

"بڑی خاموش ہو تم۔ جب کبھی میں تمہیں کوٹھے پہ دیکھتا تھا تو سوچا کرتا کہ خدا جانے کیسی آواز ہے اس کی۔ کیسی باتیں کرتی ہے۔ کس کس کا ذکر کرتی ہے اپنی باتوں میں۔ تم تو بالکل ہی خاموش فلم کی ہیروئن ہو"۔

وہ آہستہ سے بولی: "کیوں۔ کیا تمہیں چپ چاپ لوگ اچھے نہیں لگتے"۔

"لگتے ہیں پر کر یدی سی لگ جاتی ہے کہ وہ اندر ہی اندر کیا سوچ رہے ہیں۔ خدا کے لئے ایک بار کہہ دو تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں خدا قسم تمہیں تاجے سے چھین لوں گا۔ اس شرابی بدبخت ڈرائیور نے تمہاری قدر ہی نہ جانی۔ کہاں مرا رہتا ہے آدھی آدھی رات تک!"

شریفاں اب بھی چپ رہی۔ ایوب کے خیالات سے اس کو مکمل اتفاق تھا لیکن ان کا اظہار کسی اور کے ہونٹوں سے برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے منہ پرے کر لیا اور غصے میں آئے ہوئے آنسو پینے لگی۔

"بول شریفاں۔ بول جانی۔ تجھے مجھ سے محبت ہے کہ نہیں۔"

عید میلادالنبیؐ کی رات کا پہلا پہر تھا۔ بھونپو پہ ابھی سے لوگ نعتیں گانے لگے تھے۔ مٹھائی کی دکانیں نیچے سجائی جا رہی تھیں۔ بازار کی طرف سے رت جگے کا سا شور اٹھ رہا تھا۔ ایوب اور اس میں اب کوئی دوئی نہ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کے کان ابھی تک ٹرک کی آواز پر لگے تھے۔

"بول شریفاں۔ اب تو ہم اک مِک ہو گئے ہیں۔ اب بھی تجھے مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔"

ٹرک بہت آہستہ آہستہ مسجد کے پچھلے احاطے میں داخل ہوا۔ نہ ریس دینے کی آواز آئی نہ کتے بھونکے۔ خدا جانے اس سوال کو پلے سے باندھ کر شریفاں کس وقت اپنی سیڑھیوں میں آ بیٹھی۔ سیڑھیوں میں مدھم سا بلب روشن تھا۔ وہ سیڑھیوں پہ جمی بیٹھی تھی جب تاجا آنگن میں آیا۔ باہر کے دروازے کو تاجا ہمیشہ خود مقفل کر کے جایا کرتا تھا۔ شریفاں تلی ٹیک کر پہلی سیڑھی پر بھونچکی سی بیٹھی رہ گئی۔

آج تاجے کے ساتھ ایک غیر عورت بھی تھی۔ اس نے نسواری رنگ کا برقعہ پہن رکھا تھا اور چہرے پر سستی گلابی لپ سٹک لگا رکھی تھی۔

"کہاں ہے تو شریفاں۔ دیکھ تو۔ کیا سوغات لایا ہوں تیرے لئے۔ کہاں ہے تو شریفاں۔ دیکھ اس کے بعد میں حرام نہیں کھاؤں گا۔"

تاجا آوازیں دیئے جا رہا تھا اور اندر کوٹھڑی کی طرف اچک اچک کر دیکھ رہا تھا۔ سیڑھیوں کی

روشنی نسواری برقعے والی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

کل سولہ سیڑھیاں ہی تو تھیں لیکن آج یہ سیڑھیاں اترنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ریشمی ازار بند سے بندھا ہوا چابیوں کا گچھا چھوٹے بچے کے موت کی طرح دوسری سیڑھی پر لٹکا ہوا تھا۔ کانوں میں تاجے کی آواز رات کو جاگنے والے جھینگر کی طرح اونچے اونچے کہہ رہی تھی:

"ایسا ہی تجھے مجھ سے پیار ہے تو ایک بار میری خاطر کسی غیر کے ساتھ سو رہ۔ پھر تو مجھے بعد میں کچھ کہنے جوگی تو نہ رہ جائے۔ تو اور میں ایک سطح پر آ کر پیار کر سکیں۔ کوئی طعنہ نہ ہو ہمارے درمیان۔ جا کہیں منہ کالا کر آ۔ شریفاں۔ نہ تو اتنی سفید ہوتی نہ مجھے ایسا وخت پڑتا۔ پھر ہم میں سچا پیار ہوتا۔ سچا پیار۔"

نیچے رات کی خنک سردی میں نسواری برقعے والی کھڑی تھی۔ تاجے کا ہاتھ اس کے کندھے پر تھا اور وہ اونچے اونچے پکار رہا تھا:

"شریفاں! کہاں ہے تو؟ بولتی کیوں نہیں۔ دیکھ تو اس بار میں تیرے لئے کیا سوغات لایا ہوں۔"

کل سولہ ہی تو سیڑھیاں تھیں لیکن وہ جاگو میٹی گھر کی ٹلی ٹاکی سے بے خبریوں نیچے تاکے گئی جیسے بھری کیکلی میں کسی ساتھن نے ہاتھ چھوڑ دیئے ہوں!

کتنے سو سال ؟

ہر درشن کور تو ایک ایسا پودا تھا جو نہ بیج سے اگتا ہے نہ جس کی کوئی جڑ ہوتی ہے بلکہ جو پیوندی
آم کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے کھٹے اچاری آم سے سفوف کے بغیر رس دار انور راٹول میں بدل جاتا ہے۔ وہ
تو اس منی پلانٹ کی طرح تھی جس کا ایک پتہ چھوٹی سی ڈالی کی جگہ سے کاٹ کر لگا دو تو آپ سے آپ
ہری بھری بیل میں بدل جاتا ہے۔

ہر درشن کور جب پیدا ہوئی اور دائی نے اس کے گلے میں الجھی ہوئی آنول کو جلدی سے اتار کر
اس کے نیلے بدن کو لال کالے چوکوروں والے کھیس میں لپیٹا تو اس کی ماں نے لمبا سانس لیا اور واہگرو
کی جے کہہ کر مٹھیاں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ باپ ایک رات زمین میں ہل جوتنے گیا تو صبح جس وقت چاند ڈوبا
کسی نے گھر آ کر خبر دی کہ جسونت سیاں سیاڑ پر منہ کے بل گرا ہے اور اس کے جسم پر ٹوکے کے پورے
بائیس نشان ہیں۔

اب حویلی میں دو جوان بھائی اور پلنے میں پاؤں کا انگوٹھا چوستی ہر درشن کور رہ گئی۔
کشمیری ڈھونگے جیسی پگڑیاں پہننے والے دونوں سرداروں نے اس ربڑ کی گڑیا کی طرف دیکھا اور
ذمہ داری کے بوجھ سے یوں جھکے جیسے سروٹ کی ڈالیاں چڑیوں کے بیٹھنے پر زمین کی جانب جھکتی ہیں۔
لیکن جوان جسم ذمہ داریوں کو کچھ دل سے قبول نہیں کرتا۔ سوتیلے اور بھائیوں کے درمیان ہر درشن اس
کچے امرود کی طرح لڑھکتی پھری جیسے بچے گیند سمجھ کر کرکٹ کھیلتے پھریں۔ گھٹنے گھٹنے میلے کمروں میں درشن

مکھن دودھ پر پلی ہوئی مٹکو سی گھومتی پھرتی۔ دیواروں سے کھرچ کھرچ کر مٹی کھاتی۔ کیڑوں کو ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کر دیکھتی اور بالآخر سؤر گیاشی بے جی کے نواڑی پلنگ کے نیچے گھس جاتی۔ پلنگ کے نیچے درشن کی کائنات تھی۔ یہیں اس کے سلور کے چولہے دیگچیاں تھیں۔ کھٹے کی لکڑی سے بنا ہوا سنگار بکس چھوٹی سی چارپائی اور چارپائی پر کپڑے کی گڑیا تھی جو اس کی طرح نہایت بے سرو سامانی کے دن بسر کر رہی تھی۔ درشن کور کو ان کھلونوں سے بہت کم دلچسپی تھی۔ بس بے جی کے پلنگ تلے کا اندھیرا اسے اچھا لگتا تھا۔ پھر نواڑ کا ایک ڈھیلا لڑ پائنتی کی طرف تھا، اس میں بیٹھ کر کتنی کتنی دیر جھولا جھولتی رہتی اور گاتی رہتی۔ یہ سارے گانے اس کے خود ساختہ ہوتے تھے کیونکہ سردار ہربیل سنگھ کے گھر میں کسی کا آنا جانا نہ تھا۔

بھائیوں کی لاڈلی کے بہت سے نام تھے لیکن آگے چل کر جو نام پکا ہو گیا وہ کرنیل کور تھا۔ بلبیر سنگھ اور ہربیل سنگھ چھوٹی سی بچی کو اپنی کرپان پکڑا کر کہا کرتے :

"دیکھو تو خالصہ فوج کی کرنیل نظر آتی ہے"۔

ویسے بھی دونوں بھائی اسے باپ کے رکھے ہوئے نام سے بلاتے ڈرتے تھے جیسے وہ کوئی بے ادبی کر رہے ہوں۔

گیندا رنگے سوٹ میں وہ پنڈاروں کے ساتھ ڈاکہ زنی کرنے والی شیر دل لڑکی لگا کرتی۔ چہرے کا رنگ تپتی ہوئی اینٹ جیسا اور آنکھیں کرنجی تھیں۔ ماتھا رانی جنداں کی طرح فراخ اور با نصیب نظر آتا۔ اور ہونٹوں کا خم اپنے فیصلے آپ کرنے کی نشاندہی کرتے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تجسس، ذہانت اور غیرت مندی کا عکس پڑا رہتا۔

حویلی کے سائے میں دیوار پار بھری رہتی تھی۔ بھری ذات کی میراثن تھی اور تیلی دادو کی بیوی تھی۔ کھل بنولے میں رہ کر اس کی رنگت کمائے ہوئے چمڑے کی طرح چمکدار اور صندلی ہو گئی تھی۔ بس پردے اور صوم و صلوٰۃ کی بہت پابند تھی۔ جونہی حویلی کی چھت پر ذرا سی آہٹ ہوتی تو فوراً کولہو کے پاس سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی جاتی۔ لیکن اچانک ایک دن اسے یہ پردہ چھوڑنا پڑا۔

کرنیل کور رہتی والے نلکے تلے پیڑھی رکھے نہا رہی تھی۔ خود ہی نلکہ چلاتی اور نالی کے آگے ہاتھ رکھتی

اور پھر خود ہی پھدک کر نالی کے نیچے بیٹھ جاتی۔ اس بندر والی اچک پھاند میں اچانک پیڑھی پر اوچھا پاؤں پڑا۔ پیڑھی گھسٹتی چلی گئی اور کرنیل کور کی کہنی لہو لہان ہو گئی۔ اس وقت صرف ہربیل سنگھ گھر پہ تھا۔ پہلے تو اس نے دھویا لیکن لہو بری طرح بہہ رہا تھا۔ ادھر کرنیل کا چہرہ اتنا سارا لہو دیکھ کر گیندے کے پھول سے بھی زیادہ پیلا ہو رہا تھا۔ میراثن کے گھر اور حویلی کی سانجھی دیوار میں ایک کھڑکی حویلی کی جانب تھی جو آج تک کبھی نہ کھلی تھی۔ ہربیل سنگھ نے چھوٹی سی جندری کو جھٹکا دے کر توڑا اور کواڑ کھول کر اوٹ میں ہو کر بھری کو آواز دی۔

جب لہو تھم گیا اور کرنیل کور سو گئی تو بھری چپ چاپ اٹھ کر گھر چلی گئی۔ اس کے دوپٹے پر جا بجا لہو کے دھبے تھے لیکن اسے ان سے گھن نہ آ رہی تھی۔ آج اتنے برسوں بعد اس کی گود میں کوئی سویا تھا۔ دادو اور بھری بن بچوں والے گھر میں یوں خاموش خاموش رہتے تھے جیسے کسی کتب گھر میں کتابیں۔ ان کے اندر تو بہت سی کہانیاں تھیں لیکن وہ یہ کہانیاں عموماً بند ہی رکھتے۔ بھری کی ملنے ملانے والیاں اسے عموماً مشورہ دیتیں کہ وہ دادو کو بڑے ہسپتال لے جائے وہاں ایک امریکن ڈاکٹر آیا ہوا تھا جو مردوں کے علاج خوب کرتا تھا لیکن بھری یہ کہہ کر چپ ہو جاتی کہ جب اللہ رسول کا حکم ہو گا آپی بچہ ہو جائے گا۔ میں اپنے جنے کو لوگوں کے سامنے کیوں بدنام کروں ؟

بھری کا پردہ کیا ٹوٹا ہربیل سنگھ نے پہلی بار سکھ کا سانس لیا۔ ڈیوڑھی کی کھڑکی کھول کر آواز دے دیتا : "بہن بھری! کرنیل کا دھیان رکھنا میں کھیتوں پہ جا رہا ہوں"۔

ادھر بھری کو بھی کیا ملی خوشیوں کا باب کھل گیا۔ کرنیل کور کو اپنے گھر لا کر وہ اس کا منہ ہاتھ کھلی سے دھوتی۔ پھر اس کے بالوں میں اصلی سرسوں کا تیل ڈالتی۔ ناک کی سیدھ مانگ نکال کر چوٹی کرتی اور پیچھے لمبا سا سوباف ڈالتی۔ یوں اپنی گڑیا کو بنا سنوار کر وہ چارپائی پر بٹھا کر کہتی —— "لے اب تو کھیل اور میں ہانڈی روٹی پکا لوں" —— کرنیل دادو کو دیکھنے لگتی۔ جتنی بھری خوبصورت تھی اسی قدر دادو آنکھوں کو برا لگتا تھا۔ گدلی گدلی آنکھیں، تنگ ماتھا، آگے سے کٹی ہوئی سی ناک اور بڑے بڑے کان۔ سارا دن اڈے پر بیٹھا گدھے کو ہانکتا ہوا ناک سے چھپے نکالتا رہتا۔ کرنیل کور کو دادو کی سب سے

بری یہ بات لگتی تھی کہ اس کے تنگ سینے پر ایک بھی بال نہ تھا۔ بیر جی کے سینے پر تو سیاہ بالوں کی گھنی گھاس اُگی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ درشن کا سر اپنے سینے پر رکھ کر سو جاتے تو اسے بہت مزہ آتا۔ دادو کے چکنے بٹیرے سے سینے کو دیکھ کر کرنیل کا جی چاہتا کہ وہ دادو کو خوب مارے۔

اس غصے کے تحت ایک روز اس نے بھری سے کہا: 'ماسی ـــ یہ تیرا دادو نربخن ماچھی کا رشتے دار ہے'۔

بھری نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا اور جواب دیا: "ناں بیٹی ناں۔ وہ مونا سکھ اور ہم مسلمان۔ رشتہ داری کیسی!"

'تو دادو کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ ہمارے ساتھ حویلی میں رہ۔ بے جی کا پلنگ دونگی تجھے'۔

"اب تو اس کے قدموں میں رہنا ہے کرنیل"۔

یہ فلسفہ کرنیل کو سمجھ نہ آیا۔ بولی: "کیوں"۔

"کیوں۔ کیونکہ یہ میرا مجازی خدا ہے"۔

"وہ کیا ہوتا ہے ماسی"۔

'ہندو عورتیں جسے سواہی کہتی ہیں ناں 'وہ'۔

سوامی کیا ہوتا ہے ماسی"۔

"جسے سجدہ کرو تو گناہ نہیں ہوتا بیٹی"۔

کرنیل بات کو اپنی عقل سے بڑا پا کر خاموش ہو گئی اور نفرت سے دادو کی طرف دیکھنے لگی جس نے آنکھوں میں لال دوا ڈال رکھی تھی اور تت تت کرتا مریل کٹے کو ہنکانے میں مشغول تھا۔

اب ڈیوڑھی والی وہ کھڑکی کھلی رہنے لگی جس کے آگے مضبوط آہنی سلاخوں کا جنگلا تھا۔ کرنیل کور کھڑکی کی سِل پر بیٹھ کر بھری کے گھر میں جھانکتی رہتی اور بھری نماز پڑھتی۔ کپڑے دھوتی۔ جھاڑو سے فرش صاف کرتی۔ تیل والنی سے پیسوں میں نیا تیل ڈالتی۔ کرنیل کے وجود میں کھوئی رہتی۔

'کیا کر رہی ہے ماسی!"

'وضو کرنے لگی ہوں کرنیل'۔

'وضو کیا ہوتا ہے ماسی'۔

"عبادت کے لئے پانی سے بدن پاک صاف کرنا"۔

'اور عبادت کیا ہوتی ہے ماسی'۔

"عبادت! ـــ عبادت بیٹی اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کو کہتے ہیں"۔

'اور نعمتیں کیا ہیں ماسی'۔

"دادو سا شوہر ـــ یہ گھر ـــ کھانے کو دو وقت کھانا ـــ پہننے کا کپڑا ـــ کسی کی محتاجی نہیں۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا"۔

یہ بات تو کرنیل کور کو سمجھ نہ آئی۔ لیکن ماسی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی گڑوی میں پانی بھر کر اپنی گڑیا کو وضو کرایا۔ جیسے جیسے بھری وضو کرتی بالکل ویسے ہی کرنیل بھی اس کی نقل کرتی۔ جب کپڑے کی گڑیا اچھی طرح بھیگ گئی تو کرنیل کور کو.... لگا.... وہ بھی بڑوں کی فہرست میں شامل ہو گئی ہے کیونکہ وضو جیسا مشکل کام اس نے سیکھ لیا تھا۔

کوٹھے پر سب سے چھپ کر کرنیل کور نے گارے کے ساتھ ایک مسجد بنائی۔ اینٹوں کا تھڑا، اس پر گارے کا لیپ کیا۔ ٹیڑھی ٹیڑھی اینٹوں کا منبر بنایا اور پھر اس ساری جگہ کے گرد اینٹیں چن کر حد بندی کر لی۔

ویسے تو ہربیل سنگھ اور بلبیر سنگھ کرنیل کی وجہ سے کبھی رات باہر نہ رہتے تھے لیکن اب جو بھری کا سہارا ملا تو دونوں ہر کا میلہ دیکھنے چلے گئے اور کرنیل کو بھری کی تحویل میں دے گئے۔

جس روز پہلی بار کرنیل بھری کے ہاں رات بھر ٹھہری اس کے دوسرے دن جمعرات تھا۔ بھری نے ایک تھال میں تین خمیری روٹیاں رکھیں اور ساتھ ایک پیالے میں پتلا آلو شوربہ ڈالا۔ سر پر برقعہ اوڑھا اور کرنیل کی انگلی پکڑ کر مسجد کی طرف روانہ ہو گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں ماسی؟"

"مسجد کی طرف جا رہے ہیں کرنیل۔"

"وہاں کیا ہے ماسی؟"

"مولوی صاحب کے لئے روٹی لے جانی ہے۔"

"وہ اپنی روٹی آپ کیوں نہیں پکاتے؟"

"بیٹی۔ ثواب ہوتا ہے انہیں روٹی دے کر۔"

"اور ثواب کیا ہوتا ہے ماسی؟"

"ثواب ہوتا ہے روح کو۔ خاموشی سے چل۔ سڑک پر باتیں نہیں کرتے۔"

مسجد میں طاقچوں پر دیئے روشن تھے۔ صفوں پر نمازی جمع ہو رہے تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ دو چار لڑکے اب بھی بیٹھے سیپارے پڑھ رہے تھے اور مولوی صاحب کے حجرے سے گیس کی روشنی تختے کی صورت میں نکل کر باہر پڑ رہی تھی۔ جب کرنیل واپس حویلی میں آئی تو سب سے پہلے اس نے کوٹھے پر چڑھ کر اپنی مسجد میں کھجوری صف کا ایک ٹکڑا بچھایا۔ مکھو کمہار سے دو پیسے کا کورا بدھنا لیا اور چونترے پر کاغذوں کو کاٹ کر سیپارے کی شکل بنا کر رکھ لیا۔ اب وہ آزادی سے کوٹھے پر چڑھ کر پہروں وضو کرتی۔ پھر خود ہی اذان دیتی اور خود ہی ماسی بھری کی طرح نماز پڑھنے میں مشغول ہو جاتی۔

ایک روز ہربیل سنگھ کرنیل کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ تو اوپر نماز پڑھنے میں مشغول تھی بھری کو زمین دوز بچھو کر ہربیل سنگھ نے ڈیوڑھی والی کھڑکی کھولی اور آواز دی: "کرنیل کور۔"

ہینڈ پمپ کے سامنے چارپائی کھڑی کر کے بھری نہانے میں مشغول تھی۔ بھری کو دیکھ کر ہربیل کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں۔ اپنے جوڑے کو کھجاتے ہوئے اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اب تک وہ باپ کی کمائی سے پر بندھک پارٹیاں سکھ دل اور اکالی جتھے بنایا کرتا تھا۔ آج اچانک اس کا جی چاہا کہ ساری دنیا سے اس کا ناطہ ٹوٹ جائے اور ڈیوڑھی والی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہے۔ اس کے بالوں بھرے سینے میں

یک دم گرم گرم پسینہ آ گیا اور تن سے ایک ایسی خوشبو اٹھنے لگی جس کا اسے پہلے کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ کبھی جوتے پہنتا اور کبھی کھول دیتا۔ کبھی پگڑی پہنتا اور کبھی اتار دیتا۔ کبھی آئینے میں شکل دیکھتا اور کبھی مکھن سے سنے ہوئے ہاتھ داڑھی پر پھیر کر دل کو سمجھاتا کہ ہوش کر ہربیل سیاں ہوش کر..... بھری نے کبھی کیس اور داڑھی والے مرد کو دیکھا ہے کہ میں اپنا آپ دکھلانے کی کروں۔ ہوش کر ہربیل سنگھ ہوش کر

اس واقعے سے پہلے ہربیل سنگھ کے لئے بھری کو بے دھڑک آواز دینا آسان تھا اب دل کے چور نے منہ پر ڈھاٹا باندھ دیا تھا۔ ڈرتے رُکتے ہوئے کھڑکی کی زنجیری پر ہاتھ ڈالتا اور مری ہوئی آواز میں کہتا۔ "بھائی وادو ہم جا رہے ہیں باہر۔ کرنیل کور اکیلی ہے حویلی میں"۔

اگر کہیں سے اس کی آواز سن کر بھری آ جاتی تو ہربیل سنگھ کا منہ بسنتی ہو جاتا۔ گلے میں سنگھاڑوں کے کلنٹے ابھر آتے اور چھاتی کے بالوں میں ہلکا ہلکا پسینہ آ جاتا۔ ذات کی مراثن نے سوڈھیوں کے مودھی کا ایسا حال کر دیا جیسے خارشی کُتا کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہو۔

اس روز ہربیل سنگھ سبحان پور سے واپس لوٹا تو قلمی آموں کا ٹوکرا ساتھ تھا۔ ٹوکرا ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ اندر گیا تو مکان میں ایک بھی بتی روشن نہ پائی۔ رسوئیا بڑے کمرے کو تالا لگا کر غالباً فلم کا دوسرا شو دیکھنے جا چکا تھا۔ ہربیل نے کرنیل کور کو دو چار آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کرنیل کور ابھی بھری کے گھر سے نہیں لوٹی اور بلبیر سنگھ چھت پر غالباً گہری نیند سو چکا ہے۔

چھ فٹے فولادی جسم کے اندر دل... بجنے لگا..... آ زرھی میں کواڑ کھلا رہ گیا۔ پہلے اس نے دل بہلانے کے لئے آم بالٹی میں ڈالے اور پھر کنوئیں سے پانی نکال کر انہیں ٹھنڈا کیا۔ دو ایک آم کھانے کی کوشش بھی کی لیکن پہلی بار آموں میں نہ خوشبو تھی نہ مٹھاس۔ اس کے بال پسینے میں بھیگ رہے تھے اور اندر باہر اندھیروں سے گرمی ٹپک رہی تھی۔ بالآخر اس نے سارے آم ٹوکرے میں ڈالے اور ٹوکرا کندھے پر رکھ کر بھری کے گھر پہنچا تو تھال سا چاند منڈیر پر تماشا دیکھنے کے لئے آ ٹکا۔

ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ہربیل سنگھ آہستہ سے کھانسا۔

اندر سے خاموشی اور سرسوں کے تیل کی خوشبو نے اس کا سواگت کیا۔

"دادو بھائی ——" آواز یوں نکلی جیسے چھوٹی سی کنکری بڑے سے تالاب میں گری ہو۔

"دادو —— میں کرنیل کور کو لینے آیا ہوں"۔

اب بھی اندر خاموشی رہی تو متوحش ہو کر ہربیل سنگھ اور آگے بڑھا۔

دادو کی چارپائی خالی تھی اور ساتھ والی چارپائی پر بھری اور کرنیل کور ایک ہی تکئے پر سر رکھے سو رہی تھیں۔ چاند کی روشنی میں بھری کا وہ بازو جو کرنیل کے سر کے نیچے تھا ہاتھی دانت کا بنا ہوا نظر آتا تھا۔ ناک کا کوکا ننھے سے موتی کی طرح چمکنے لگا تھا اور ماتھے پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے تھے۔

بھری ویسے بھی رانی جنداں کا دوسرا روپ تھی پر چاند کی چاندنی میں یوں بدن ڈھیلا چھوڑے اور کولہے کا مٹکا آڑا دھرے تو وہ وسنت سینا کی طرح توبہ شکن لگ رہی تھی۔

ہربیل سنگھ چیڑھ کی خشک لکڑی کی طرح جلنے لگا۔

کبھی سوچتا بھاگ جاؤں اور لوٹ کر حویلی میں قدم نہ رکھوں۔ کبھی دل میں آتی کہ کلاوہ بھر کر بھری کی گٹھڑی بنا کر راون کی طرح کسی لنکا نگری میں جا کر چھپ رہوں۔

بالآخر جب بھری نے کروٹ لی اور آہستہ آہستہ پنکھے کی ڈنڈی اس کے ہاتھ میں ہلنے لگی تو وہ بولا —— "بھری"۔

بھری گھبرا کر اٹھی۔ آنکھوں میں نیند اور گرمی کی سرخی، گردن اور کندھے پر بکھرے ہوئے بال اور ان میں الجھی ہوئی چاندی کی ڈنڈیاں، اٹھی اور بغیر دوپٹے کے ہربیل سنگھ تک آپہنچی۔

"کیا بات ہے بھائی جی"؟

ہربیل سنگھ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیا بات ہے بھائی ہربیل سنگھ"؟ نیند کی ماتی نے سوال کیا۔

لیکن ہربیل تو پیدائشی تیندوے کے مریض کی طرح لاکھ کچھ کہنے کے باوجود زبان تک نہ ہلا سکتا تھا۔

"کرنیل میرے پاس ہے سو گئی ہے۔ صبح لے جانا اسے"۔ اپنا دوپٹہ پائے سے اٹھا کر بھری نے اوڑھتے ہوئے کہا۔

"دادو کہاں ہے"۔

"مائی مہراں کے ساتھ واڈے گیا ہے"۔ دادو کے پلنگ پر بیٹھ کر بھری بولی۔

وہ ڈرتے ڈرتے کرنیل کور کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کے گھٹنوں میں بمشکل تمام دو انگلوں کا فاصلہ تھا۔

"بات کیا ہے"۔ حیران ہو کر بھری نے پوچھا۔ "کہیں کوئی —— کہیں کوئی خون تو نہیں ہو گیا"۔

"ہو گیا ہے"۔

"خون —— کہاں ؟"

ہربیل سنگھ نے نظریں جھکا کر آہستہ سے اپنا ہاتھ بھری کے گھٹنے پر رکھ دیا اور ہولے سے بولا: "میں یہاں سو جاؤں رات کی رات.... کرنیل کور کے پاس"۔

ہربیل سنگھ کی ساری کشش اس کی آنکھوں میں تھی۔ یہ آنکھیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خوبصورت بیٹے دلیپ سنگھ کی آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھوں میں جب التجا ہوتی ہے تو اسے رد کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوتا۔ بھری نے اپنا آپ مارنے سے پہلے ایک لمبی سی جھرجھری لی اور آہستہ سے بولی: "دادو یہاں ہوتا تو آپ جم جم بڑی مدت سو جاتے۔ جب تک وہ نہ آئے بھائی جی میں کسی کو گھر کیسے رکھ سکتی ہوں"۔

ہربیل سنگھ کی نظروں میں دادو گھوم گیا۔ آنکھوں میں لال ڈورا ڈالنے والا دادو۔ . . . .

جب وہ گاڈی پر بیٹھ کر گدھا ہانکا کرتا تو اس کی ملائم ننگی چھاتی دیکھ کر وہ دونوں بھائی خوب ہنسا کرتے تھے۔ اس وقت اسے دادو اپنے پر ہنستا نظر آرہا تھا۔

"بھری! واہگورو کی سوگند! سوڈھی سکھ بہت غیرت والا ہوتا ہے اور اونٹ کی طرح بدلہ

لے کر رہتا ہے۔"

بھری نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ ہربیل کے کندھے پہ رکھا اور چاندنی کرنوں جیسی ٹھنڈی آواز میں بولی: "میں ذات کی میراثن۔ نیلی کی بیوی۔ تجھ جیسا سردار مجھ جیسی عورت سے بدلہ لے کر کیا کرے گا۔"

ہربیل سنگھ چپ سا ہو گیا۔

"تو نے میری بڑی عزت بڑھائی ہے یہ بات کہہ کر۔ لیکن اب جوانمردی اسی میں ہے کہ مجھے مجبور سمجھ کر جس طرح آیا تھا اسی طرح لوٹ جا۔ مجھے کوئی کسی نے قید تھوڑی کر رکھا ہے کہ تو چھڑانے آیا ہے۔ میں نے تو خود اپنی مرضی سے زنجیر پہن رکھی ہے۔ یہ کڑا نہیں دیکھتا میرے ہاتھ میں۔ سنگھار کے لئے کوئی بوجھ تھوڑی ہے؟"

ہربیل سنگھ خلا ستوا کی گرمی سے نکل کر یکدم کوہِ فراقرم کی پہاڑیوں میں جا پہنچا۔ بھری کی کلائی اس سے تھوڑی دور تھی۔ اس نے اپنے جلتے ہونٹ اس ٹھنڈے رولڈ گولڈ کے کڑے پر رکھ دیئے لمحہ بھر کو سو ڈھیروں کا سارا مان بھری کے قدموں میں ڈھیر کیا اور پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کی ساری داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔

اس دن کے بعد ہربیل سنگھ نے پھر کبھی ڈیوڑھی کی کھڑکی نہ کھولی۔ اب بلبیر ہی کرنیل کور کو لے جاتا اور گھر واپس لاتا۔ لیکن پھر بلبیر کی ملاقات لدھیانے کے سٹیشن پر ایک لڑکی سے ہو گئی جو سکھ نہیں تھی۔ اور اس کے گھر والے لدھیانے میں ٹانسا بناتے تھے۔ بلبیر نے زمینوں سے ناطہ توڑ لیا اور اس لڑکی سے شادی کر کے خود بھی لدھیانے میں ٹانسے کی کھڈیوں پر کام کرنے لگا لیکن اب تو کرنیل کور سیانی ہو چکی تھی اور خود ہی بھری کے گھر کے پھیرے لگانے لگی تھی اس لئے ہربیل سنگھ کو ڈیوڑھی کی کھڑکی کھولنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔ ویسے بھی اب اس کے بالوں میں چٹے آ گئے تھے اور وہ ہل چلاتا تھک جایا کرتا تھا۔

کرنیل کور سکول سے واپسی پر صرف بستہ چھوڑنے گھر آتی۔ پھر سکول کے کپڑے اتار کر بھری کی

طرف چلی جاتی۔ اس نے تو بھری سے اتنے سارے کھانے بھی پکانے سیکھ لئے تھے۔ ہر با جب وہ کچھ پکا کر ہربیل کے آگے رکھتی تو وہ پوچھتا: "بڑا سواد ہے تیرے ہاتھ میں کرنیل۔ بے جی کی طرح۔ تیری استانیاں تو بڑی قابل ہیں۔"

"استانیوں کو کچھ نہیں آتا بیر جی۔ سب ماسی بھری سکھاتی ہے مجھے۔" وہ ترش کہتی۔

حالانکہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ سب کچھ بھری سکھاتی ہے لیکن کرنیل کے منہ سے یہ سن کر اسے عجب طرح کی خوشی سی حاصل ہوتی۔

"اسے تو کھلی سے نہانا آتا ہے اور کچھ نہیں آتا اسے"۔

"نہ بیر جی۔ ماسی بھری کو تو سب کچھ آتا ہے۔ یہ دیکھو کیا کشیدہ کیا ہے۔ مجھے میری استانی کہتی ہے کہ ایسا کشیدہ تو ہیڈ مسٹریس بھی نہیں کر سکتی۔"

نمونے کے کڑھے ہوئے تکیے کے غلاف کو ہربیل سنگھ ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھتا رہتا۔ ایسے تکیے پر سر رکھ کر سونے کی اسے کتنی تمنا تھی۔

ایک روز کرنیل نے بھری سے کہا: "ماسی تو ایک تکیہ غلاف بیر جی کے لئے بھی بنا دے۔ وہ بہت تعریف کرتے ہیں تیرے کشیدے کی"۔

بھری نے گادی پہ بیٹھے دادو پر نگاہ ڈالی اور مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اگر فرصت ملے گی تو بنا دوں گی"۔

"یہ جو تو سارا دن برقعے کی ٹوپی پر کڑھائی کرتی رہتی ہے تو ایک تکیہ غلاف نہیں بنا سکتی ماسی بیر جی کے لئے۔"

"برقعہ تو ضرورت کی چیز ہے کرنیل۔ اس کے بغیر کوئی گزارہ ہو سکتا ہے۔ غلاف تو سادہ بھی ہو سکتا ہے۔ کڑھائی کے بغیر!"

بات بودی تھی لیکن اس وقت چل گئی۔ کرنیل کی توجہ غلاف سے ہٹ کر برقعے کی طرف ہٹ گئی۔

"یہ برقعہ کیوں پہنا جاتا ہے ماسی!"

"تاکہ اپنی زینت پر دوسروں کی نگاہ نہ پڑے اور ان کا ایمان قائم رہے۔ کسی کو آزمائش میں ڈالنا گناہ ہے بیٹی۔ مرد کے دل میں عورت کے لئے بڑی رغبت رکھی ہے اللہ نے۔"

کرنیل کور نے اپنی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی: "ماسی . . . . . مجھے برقعہ پہننا چاہئے ناں۔ مجھے دیکھ کر لوگ آزمائش میں پڑے ہوں گے ناں"

"پہننا تو چاہئے۔ پر شاید تمہارے ہیر جی پسند نہ کریں۔"

جس روز وہ سیاہ برقعہ بازو پہ دھرے ہربیل سنگھ کے کمرے میں پہنچی اس وقت ہربیل سنگھ پلنگ پر لیٹا بلبیر سنگھ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یادیں بھی پیتل کا برتن ہیں۔ اگر مانجھتے رہو تو دمکتی ہیں ورنہ ان پر بھی کائی کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ ہربیل سنگھ نے تو پچھلی یادوں کو چمکا چمکا کر اس طرح کر دیا تھا جیسے سیڑھیوں کے ساتھ لگی ہوئی ریلنگ ہاتھوں کی رگڑ سے چکنی ہو جایا کرتی ہے۔

"ہیر جی"۔

"کون ہے؟"

"میں جی۔ کرنیل"۔

ہربیل سنگھ اٹھ بیٹھا۔

"آ جا۔ کھڑی کیوں ہے"۔

"میں برقعہ پہن لوں"۔

"برقعہ؟" حیران ہو کر ہربیل سنگھ نے پوچھا۔

"ماسی بھری کہتی ہے کہ ــــ کہ جوان لڑکی کو برقعہ پہننا چاہئے۔ سب آزمائش میں پڑ جاتے ہیں مجھے دیکھ کر۔"

اپنی کھڑ بڑی داڑھی میں انگلی پھیر کر ہربیل سنگھ نے لمبی سانس لی اور بولا۔ "اب کیا کہتی ہے بھری؟"

"برقعہ۔ میں پہن لوں ہیر جی"۔

ہربیل کو اپنی دادی یاد آ گئی جو برقعہ پہنا کرتی تھی۔

"تو مجھ سے کیوں پوچھتی ہے۔ بھری نے کبھی کوئی غلط بات بھی کہی ہے۔ پہن لے برقعہ"۔

"وہ ــــ وہ ماسی کہتی تھی کہ ــــ کہ مسلمانوں کا رواج ہے ــــ آپ سوچ لیں۔"

ہربیل سنگھ آہستہ سے ہنسا اور پھر بولا ــــ "رواج تو رواج ہوتے ہیں۔ نہ رواج ہندو ہوتا ہے نہ سکھ نہ مسلمان۔ کپڑے میں کیا دھرا ہے۔ پہن لے جو تیرا جی چاہے"ــــ پھر ہربیل نے دور دیکھتے ہوئے اور بھی آہستہ سے کہا ــــ "اور میں کوئی اس لئے اجازت تو نہیں دے رہا کہ . . .

. . . یہ اچھی چیز ہے۔ میں تو ــــ خیر چھوڑ اس بات کو۔ اب پہن کر دکھا اپنا برقعہ"۔

برقعہ پہن کر وہ ہربیل سنگھ کو دکھانے کے بجائے سیدھی ماسی بھری کے گھر پہنچی۔ بھری دیوار سے اُپلے اتار رہی تھی۔

کرنیل نے گھستے ہی آواز دی ــــ "ماسی ــــ ماسی دیکھ تو کیسی لگتی ہوں میں"۔

بھری کے ہاتھ رک گئے۔

"خدا کی قسم! تھوڑی دیر کے لئے تو میں سمجھی کہ عذرا ہے"۔

ڈوری کھولتے ہوئے کرنیل نے پوچھا۔ "عذرا کون ماسی؟"

"میری بہن تھی۔ بڑی خوبصورت تیری طرح۔ ایسی ہی آنکھیں تھیں۔ نمبردار کے گھر منگنی ہوئی تھی۔ منگنی کے دسویں دن پھول ماتا نکلی۔ سارا پنڈا پک گیا تھا۔ مری ہے تو پہچانی نہیں جاتی تھی"۔

بھری کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"جن سے پیار کرو وہ کبھی پاس نہیں رہتے۔ پھر زندگی کا فائدہ بھلا۔" بھری نے دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

کرنیل نے ماسی کے گلے میں بانہہ ڈال دیئے اور اس کے سر کو چوم کر کہا: "تو مجھے عذرا ہی سمجھ ماسی بھری!"

"وہی ناک نقشہ ہے وہی رنگ وہی قد بُت"۔

"تو مجھے عذرا کہا کر ماسی اب تم سے"۔

اس طرح کرنیل کور کو جو اصل میں ہر درشن کور تھی ایک اور نام کا چتیمہ ملا۔

شب معراج کا ذکر ہے۔ شام کو بھری نے نہا دھو کر عطر حنا لگایا۔ ہاتھوں میں گو وہ ہاتھی دانت کی سی سفیدی نہ رہی تھی لیکن مہندی کا رنگ خوب کھلا۔ کھیر پکا کر دادو کے ہاتھ مسجد بھیجی اور کڑوے تیل سے دیئے بھرنے لگی تو کرنیل کور آ گئی۔ ہر سال اسی طرح اس کے چھوٹے سے گھر میں شب معراج کو دیئے جلا کرتے تھے۔ اور مسجد میں کھیر جاتی تھی لیکن کوئی کوئی دن کوئی کوئی لمحہ کٹاری کی طرح تیز ہوتا ہے اور دل کے آر پار چلا جاتا ہے۔

کرنیل کی آہٹ پا کر بھری نے پوچھا: "کون ہے"

"میں ہوں ماسی۔ عذرا۔"

"آ جا عذرا۔ باہر کیوں کھڑی ہے دہلیز پہ"۔

کرنیل کور نے کروشیے کی جالی سے ڈھکی ہوئی پلیٹ کھول کر کہا: "کڑاہ لائی ہوں ماسی"۔

"تو اندر رکھ آ طاق میں۔ دادو مسجد سے آئے تو اسے کھلاؤں گی"۔

"رکھنے کے لئے نہیں ماسی۔ خیرات کرنے کے لئے لائی ہوں اللہ واسطے ——— آج خوشی کا دن ہے ناں ماسی۔ خوشی کے دن کچھ خیرات کرنی چاہئے ناں!"

"ابھی تھوڑی دیر میں اللہ ہو والا بابا آئے گا اُسے دیں گے حلوہ۔ اندر رکھ آ۔"

پھر دونوں نے مل کر دیئے جلائے۔ منہ سے اللہ اور سینے سے ہو کی آواز نکالنے والے بابا کو حلوہ دیا دادو ساری رات کھانستا رہا اور بتیاں ٹمٹما ٹمٹما کر آخر کار بجھ گئیں۔

"گھر نہیں جاؤ گی عذرا" بھری نے رات گہری ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں ماسی۔ آج بیرجی ادھیلنے گئے ہوئے ہیں"۔

جب کرنیل چارپائی پر لیٹنے لگی تو اس نے دیکھا کہ بھری سامنے چبوترے پر جہاں صبح کے وقت

تیل کے کنستر رکھے جاتے تھے چٹائی پر سفید کھیس بچھا کر بیٹھ گئی ہے اور سامنے رحل پر قرآن شریف رکھ کر اگربتیاں جلانے لگی۔

کرنیل کی آنکھوں میں نیند بھری تھی لیکن اگربتی کی خوشبو نے اسے جگا سا دیا۔ بھری کے پاس پہنچ کر اس نے پوچھا: "تو نہیں سوئے گی ماسی؟"

"آج کی رات کوئی ناخلف ہی سوتا ہے کرنیل۔ جاگنے کا بڑا ثواب ہے۔ رسولِ مقبول عرش پر گئے تھے آج کی رات"۔

کرنیل نے زمین کی چھت پر نظر ڈالی جس پہ ہزاروں تارے جل بجھ رہے تھے۔

"بہشت میں ایک بہت بڑا درخت ہے عذرا۔ اس درخت کی لاکھوں ڈالیاں ہیں اور ہر ڈالی پر ان گنت پتے ہیں۔ ہر پتے پر کسی نہ کسی انسان کا نام لکھا ہے جس آدمی کے نام کا پتہ جھڑ جاتا ہے وہ سال کے اندر اندر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے"۔

کرنیل کو ایسے درخت کے تصور سے خوف آنے لگا۔ وہ بھری کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"یہ عبادت کی رات ہے کرنیل کور۔ یہ ساری رات مومن لوگ عبادت میں گزارتے ہیں۔ رات کا ایک پہر ایسا ضرور آتا ہے جب کائنات کی ہر چیز سجدے میں چلی جاتی ہے ———"

"وہ کیوں ماسی!"

"جس گھڑی حضور مقبول عرش پر گئے تھے عین اس گھڑی آج بھی ہر چیز سجدے میں چلی جاتی ہے ———"

کرنیل کا بدن آہستہ آہستہ کانپنے لگا۔

"ماسی یہ گھر ..... یہ درخت سب ....."

"ہر جاندار، ہر غیر جاندار سب ....."

"کسی نے انہیں سجدہ کرتے دیکھا ہے ماسی"۔

"بہت سے ولیوں نے اللہ کے پیاروں نے دیکھا ہے بیٹی جو یہ منظر دیکھ لیتا ہے اسکے

دل کا ہر قفل ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اس کا دل اللہ کا گھر بن جاتا ہے۔ اس میں کسی آدمی کا بسیرا نہیں ہو سکتا کرنیل! ــــ کاش میرے دل کی جندری بھی ٹوٹ جائے"۔

کرنیل کا منہ سوکھنے لگا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں تو کرنیل کور کرپان سرہانے تلے رکھ کر سونے کی عادی تھی لیکن آج اسے نہ جانے کیوں چارپائی پر کرپان کے باوجود لیٹتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔ لیٹی تو کچھ سوئی سی کچھ جاگی سی ڈھیر رہی۔

تھوڑی دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو بصری دوہری ٹکٹکی مارے قرآن کھولنے والی تھی کرنیل نے ماسی کی تقلید میں دوپٹہ کانوں کے گرد اڑس کر ٹکٹکی ماری اور آہستہ سے بولی ــــ "ماسی! میں یہاں تیرے پاس بیٹھی رہوں"۔

"بیٹھی رہ بچی"۔

"کوئی گناہ تو نہیں ہوگا مجھے۔ مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے"۔

"تو تو فرشتہ ہے۔ فرشتوں کے بیٹھنے سے تو رحمت ہوتی ہے"۔

ڈرتے ڈرتے کرنیل نے ہاتھ قرآن کریم کی طرف بڑھایا اور بولی: "ماسی! میں تیرے قرآن کو ہاتھ لگا لوں؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔

"میرا قرآن کیسا درشن۔ یہ تو سب کا قرآن ہے۔ تیرا میرا۔ ساری دنیا کا۔ یہ تو چشمہ ہے نا پانی کا جس کا جی چاہے جتنا مرضی پی لے"۔

کرنیل کور نے ڈرتے ڈرتے قرآن کریم کو ہاتھ لگایا اور پھر اور ڈرتے ڈرتے ان انگلیوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

"اگر کہیں میں عربی پڑھنا جانتی تو ...... تیرا قرآن ضرور پڑھتی ماسی"۔

بصری چپ چاپ اندر گئی اور کوفی حروف والا نسخہ اٹھا لائی جس کی جلد پر چرمی جلد چڑھی ہوئی تھی اور کتابت بہت بڑی بڑی تھی۔ اس کو سامنے ٹکیے پہ رکھ کر بصری نے کہا:

"بیٹی۔ اگر پڑھنا نہیں آتا تو کیا ہوا۔ وہ بے پروا تو نیت دیکھتا ہے تو ہر سطر کے نیچے انگلی پھیرتی

جا اور بسم اللہ پڑھتی جا۔ تجھے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا قرآن پڑھنے کا ملتا ہے"۔

کرنیل کور کی کرنجی آنکھوں میں ہریاول سنگھو، آنکھوں کا سارا حسن آ گیا۔ بصری نے آنکھیں جھکا لیں۔

"سچ ماسی!"

"اور دیکھ۔ اللہ نے چاہا تو بہت رحمت ہوگی تجھ پہ"۔

کرنیل نے الف لام میم کے نیچے انگلی رکھی۔ آہستہ سے بسم اللہ پڑھی تو ایک کرنٹ انگلی سے نکل کر پیروں کے انگوٹھے تک چلا گیا۔ آہستہ آہستہ ایک کے لب ہلنے لگے اور وہ "صم بکم" انگلی پھیرتی رہی۔

یہ فجر اور تہجد کے درمیان کی بات ہے جب بصری قرآن پڑھتی پڑھتی اونگھ کر اپنے زانو پر سر دھرے سو رہی تھی اور دادو کی کھانسی بند تھی۔ کرنیل نے اپنے گھر کی طرف نگاہ کی۔ یہ حویلی اس کے دادا کنور سرجیت سنگھ نے بنوائی تھی۔ کنور کا خطاب اس کے دادا کو مہاراجہ کپورتھلہ نے دیا تھا اور سب کہتے تھے کہ حویلی دیکھ کر کپورتھلے کے شاہی محل یاد آتے ہیں۔ اب حویلی میں وہ آن بان نہ رہی تھی۔ سیل دیواروں میں ننھے ننھے پیپل کے پودے اگ آئے تھے۔ اندر آنگن میں لگا ہوا انجیر کا درخت آدھا بصری کے گھر جھکا ہوا تھا۔ باہر والا چوبی پھاٹک اور اونچے اونچے کنگروں والی دیوار۔ یہ حویلی پرانی تھی اور سوڈھی خاندان کی نجابت، شرافت اور شیر دلی کی امین تھی۔

کرنیل نے اس پرانی حویلی پر نگاہ کی تو اسے محسوس ہوا جیسے کنگروں والی حویلی کیرتن کرتی جھول رہی ہے۔ کنگرے سیس نوا رہے ہیں اور انجیر کے درخت کی ساری ڈالیاں ہاتھ جوڑتے پرنام کر رہی ہیں۔

گھبرا کر کرنیل نے بصری کے گھر کی طرف دیکھا۔ دادو کی چارپائی آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ گدھے کا ماتھا زمین پہ لگا تھا۔ ماسی کا مکان اس حد تک جھکا ہوا تھا کہ کرنیل کو لگا کہ ابھی وہ اس پہ گر جائے گا۔

کرنیل کور کے اندر سے دل پر لگا ہوا گجراتی تالا کھٹاک سے ٹوٹ گیا۔ سکھ یان وہ گرا اور گھر کے

تمام پرزے دور دور بکھر گئے۔ کرنیل نے جھک کر قرآن کو سینے سے لگا لیا اور ہونٹ اس کی سطح پر رکھ کر آہستہ سے بولی ــــ

"میں آگئی ہوں۔ میں تیرے حضور آگئی ہوں۔ یا اللہ میں نہیں جانتی کہ سیدھا راستہ کونسا ہے میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تیری کتاب میں کیا لکھا ہے اور میرے باپ دادا کی کتاب میں کیا نہیں لکھا۔ لیکن اے شبِ معراج! گواہ رہنا کہ آج کی رات میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اسی لبھری کے ایمان کو اپنا ایمان کہا ــــ اور ان جانداروں اور غیر جانداروں میں شامل ہوئی جو شبِ معراج کو سجدہ کرتے ہیں"۔

صبح ہوئی تو کرنیل کور کو سب کچھ عجیب عجیب سا لگا۔ وہی گھر وہی آنگن تھا وہی لبھری وہی دادو تھا لیکن وہ دھنک کی طرح زمین کو چھوتی ہوئی زمین سے بہت دور تھی۔ جو کیفیت اس پر رات گزری تھی۔ اس کا ذکر کسی سے ممکن نہ تھا۔ گھڑی پہنچ کر وہ سیدھی کوٹھے پر چلی گئی۔ بچپن میں جو مسجد اس نے بنائی تھی وہ اب بکھری ہوئی اینٹوں کی شکل میں نظر آئی۔ کرنیل ایک اینٹ پر بیٹھ گئی اور اس بدو کی طرح رونے لگی جو پیدل مدینے پہنچ جائے لیکن روضہ مبارک دیکھنے سے پہلے اندھا ہو جائے۔ یہ احساس غالباً زمین نے اس وقت محسوس کیا ہوگا جب وہ سورج سے کٹ کر پہلی بار اپنے محور پر گھومی ہوگی۔ اپنی بے مائیگی کا احساس، اپنی محرومی، اپنی تنہائی کا احساس، کسی کی زبان نہ سمجھ سکنے کا دکھ، اپنی بولی نہ سمجھا سکنے کا ملال!

اب تو کرنیل کور بالکل جزیرہ بن گئی۔ پہلے وہ سب باتیں لبھری سے کر لیتی تھی لیکن اب تو وہ نہ لبھری کے پاس بیٹھ کر چین میں رہتی نہ حویلی میں اسے قرار آتا۔ سارا دن اس چمگادڑ کی طرح چکر لگاتی رہتی جو اچانک سرِ شام کمرے میں داخل ہو جائے۔

ادھر کرنیل کور کے من میں بھلا لکھی پھوٹی تھی۔ ادھر سارے ملک میں آگ پھیل رہی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب گورداسپور ہندوستان میں آگیا تو ہربل سنگھ نے سکھ کا سانس لیا۔ جوان بہن کو اکیلا حویلی میں چھوڑ کر جانا کچھ اتنا آسان کام بھی نہ تھا۔ وہ کرنیل کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہتا تھا۔ کئی بار دل میں سوچا کہ بابیر سنگھ کو لدھیانے خط لکھے۔ لیکن پھر خیال آتا کہ جب اسے ہی خیال نہیں تو بات کرنا بیکار ہے۔

پاکستان بنے کوئی دسواں دن تھا۔ گرمی بے پناہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد عجیب سے عجیب خبر سننے میں آتی تھی۔ کئی برسوں سے ہربل سنگھ نے لبھری کے آنگن میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا یکدم جو ادھر سے رونے کی آواز آئی تو وہ کھلے سر اٹھا اور جلدی سے کھڑکی کھول کر آواز دی:

"دادو ــــ دادو بھائی ــــ کیا ہے"۔

لبھری آنگن میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر رونے لگی:

"کیا بات ہے لبھری؟"

"دادو کو کسی سکھ نے قتل کر دیا ہے۔ اللہ کرے مر جائیں سارے سکھ۔ بدبختو ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کسی کا کیا چھین لیا ہے میرے سر کی چھاؤں لے لی۔ میرا بھائی ــــ میرا مالک ــــ دادو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

ہربل سنگھ کے پاؤں چھوٹے پڑ گئے۔

"کہاں ہے دادو"۔

"ترمو روڈ پر۔ غارت گروں نے الٹیروں نے قتل کر دیا۔ اتنی لاشوں میں اس کی لاش کہاں ملتی ــــ اور جائے گا کون اس کی لاش لینے۔ ہائے تجھے کفن بھی نصیب نہ ہوا میرے سرتاج ــــ تیرے لئے قبر کا حکم بھی نہ ہوا ــــ ہائے میرے سوہنے دادو، میرے ہیرے دادو، ہائے میرا شیر جوان دادو"۔

لبھری کے بین سن کر ہربل سنگھ کو ہنسی آگئی اور عورتوں جیسے ملائم سینے والا دادو اس کی نظروں میں گھوم گیا۔

"تو ادھر حویلی میں آجا لبھری۔ وہاں اکیلی ۔ ۔"

"ادھر آجاؤں تاکہ تو اکیلی پا کر مجھے کرپان سے اس پار پہنچا دے۔ ہائے دادو کو بلاؤ کوئی"۔

ہربل سنگھ اندر جا کر پلنگ پر لیٹ کر ٹخنے کھجلانے لگا۔ یوں دوپٹہ پرے پھینکے سینہ پیٹتی لبھری کچھ اس لبھری سے کم نہیں تھی جس نے اس کی جانب اپنا کڑا بڑھایا تھا۔ اگر ادھر وہ حویلی میں آجائے تو برسوں کا قرض چکایا جا سکتا ہے۔ ایک انجانی خوشی کے ساتھ ہربل نے کرنیل کور کو آواز دی اور سارا

معاملہ سمجھاتے ہوئے کہا : "ادھر جاکر اپنی ماسی کو لے آ ڑ۔ دادو مر گیا ہے وہ اکیلی وہاں کیا کرے گی ویسے بھی جان کا خطرہ ہے"۔

لالٹین میں تیل کم تھا اور وہ بھک بھک کرکے اچانک جل اٹھتی تھی۔ گرمی زبان نکالے کتے کی طرح ہانپ رہی تھی۔ ہربیل سنگھ پر یہ رات عجیب تھی۔ جب اس کا شہد نچوڑا جا رہا تھا اور وہ خالی چھتے کے زرد دل کی طرح ادھر ادھر بکھرا جا رہا تھا۔ سارے گھر سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلیاں اپنے ساتھیوں کو نہ پاکر رو رہی تھیں۔ کواڑ رہ رہ کر چر چراتے تھے اور سیلے کمروں سے جھینگروں کی صدائیں آتی تھیں۔

بھری اور کرنیل ایک ہی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھیں۔ آج کرنیل کا بازو بھری کے سر تلے تھا۔ بھری کی رنگت آج بھی کمائے ہوئے چمڑے کی طرح چکنی تھی۔ صرف بالوں میں سفید بال آ گئے تھے۔ ناک میں وہی آبدار کوکا تھا۔ اور کانوں کی ڈنڈیاں بالوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم وقت کے ساتھ بھاری ہو گیا تھا لیکن یہ موٹاپا خوبصورت تھا۔ کلاسیکی تصویروں میں پینٹ کی ہوئی عورتوں کی طرح شاداب مولدا اور توجہ طلب۔

ہربیل سنگھ لکڑی کی چھوٹی سیڑھی پر بیٹھا کتنی ہی دیر بھری کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کی جانب پشت کئے کرلے کا گھڑا آڑا آدھرے بے سدھ سو رہی تھی۔ اگر ہربیل سنگھ چاہتا تو کلاوہ بھر کے بھری کو اندر حویلی میں لے جا سکتا تھا۔ پرانے کمروں میں اس کی آواز چھچھوندر کی آواز بن جاتی۔

ہربیل سنگھ اسی خیال کے تحت اسے حویلی میں لایا بھی تھا لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ یوں گڑا ہوا تھا جیسے لکڑی کی میخ ٹھونکی ہوئی ہو۔

آج اسے رہ رہ کر دادو یاد آ رہا تھا۔ دھوتی تلی جیسی رنگت والا دادو۔ گدھے کی آنکھوں پر پوٹ جمائے کولھو کے پیڑ پر چکر لگاتا۔ پلی پلی تیل کے پیچھے گاہکوں کے ساتھ جھگڑتا۔ وہی نلوا کھونچی جس سے وہ وقت بے وقت کولھو کی موری کھولا کرتا تھا۔ اسی چوبی دستے سے کبھی کبھی وہ بھری کی تواضع بھی فرما لیتا تھا۔ اڈے پہ بیٹھے بیٹھے اس کا اونگھنا اور لاٹ کے توازن بگڑنے پہ بدک کر اٹھنا اور لال لال

سے رنگی ہوئی آنکھیں مل کر بھری کو آواز دینا۔ تیل والنس میں انگلی ڈبو ڈبو کر تیل چکھنا اور پھر جھوٹی انگلی کو بغیر بالوں والی چھاتی پر مل کر ڈکار لینا اور گیلی تھلسن سے مالش کرتا ہوا دادو۔ معمولی کھاڑ پر چلنے والے ایک گدھے سے بھی بے ضرر تیلی نے سوڈھیوں کے سردار کو پچھاڑ دیا تھا۔ آج اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دادو ساری عمر تیل کے کنستر اپنے گھر جمع کرتا رہا اور پھوک پھوک اس کے گھر پھینکتا رہا۔ لال دو آنکھوں میں ڈالنے والے اس آدمی سے بدلہ لینا ضروری تھا۔ لیکن ابھی تک ہربیل وہ طریقہ نہ سوچ سکا تھا جس سے دادو کو گھان بچہ کو لہو کیا جا سکتا۔

ابھی وہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ جستی پھاٹک کی چولیں آہستہ سے کرکرائیں اور کسی نے کنڈے پر ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف دیکھا۔ ہربیل سنگھ کے قدم بھری کی چارپائی سے مڑ کر ڈیوڑھی کی طرف چلنے لگے۔

"کون ہے"۔ اس نے اندر والے قفل میں چابی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہم ہیں"۔

آواز جانی پہچانی تھی۔ ہربیل نے دروازہ کھول دیا تو باہر چاند کی روشنی میں کرپانیں ہی کرپانیں نظر آئیں۔

"یہاں تیرے پاس کوئی مسلمان شرن لینے آیا ہے ہربیل سنگھ؟" ایک جٹا دھاری سکھ نے اس سے پوچھا۔

ہربیل نے باہر نکل کر اپنے پیچھے آہستہ سے پھاٹک بند کر دیا۔ یہ ساری صورتیں جانی پہچانی تھیں ان میں زیادہ لوگ وہ تھے جن کے ساتھ مل کر اس نے کئی پربندھک پارٹیاں بنائی تھیں۔ مسلمانوں سے بھارت ماتا کو پاک کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے سامنے اس کے کورو بھائی بھتیجے چچا کھڑے تھے اور راجہ ارجن کی طرح وہ پانڈوؤں کی رتھ میں بیٹھا لرز رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنوں پر کیونکر وار کیا جا سکتا ہے؟

"بول ہربیل سنگھ! ہم نے قسم کھائی ہے کہ ان مسلوں کو نہ اپنے گھروں میں رہنے دیں گے نہ پرایوں کے گھر شرن لینے دیں گے۔ بول!"

ہربیل نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم تیرے گھر کی تلاشی لیں گے، ہربیل سیاں"۔ جنڈ جیسی خشک داڑھی والا کہنہ سال بولا۔

"یہ ایک سوڈھی سردار کا گھر ہے۔ اس گھر کی تلاشی میری موت کے بعد ہوگی۔ تمہارے لئے میرا یہی کافی ہے۔" ہربیل غرایا۔

"اب ہم آزاد ہیں۔ جو چاہیں گے کریں گے"۔

"بھارت کے علاقے میں ایک سکھ کے گھر کی تلاشی ہوگی۔ لعنت ہے ایسی آزادی پر"۔

"تیرے گھر میں مسلمان چھپے ہیں اور ہم نے سوگند کھائی ہے"۔

"میں نے بھی ایک سوگند کھائی ہے جوگندر سیاں۔" ہربیل چیخا۔

"راستہ چھوڑ دے ہربیل سنگھ"۔

"سوڈھی سردار راستہ نہیں چھوڑا کرتے۔ راستے ان کے لئے چھوڑے جاتے ہیں"۔

ہربیل نے مڑنے کے لئے کمر موڑی تو اسے کوئی ٹھنڈی سی چیز پشت پر اندر کی طرف دھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ کرپان کا پھل اتنا تیز تھا کہ جس وقت جوگندر سنگھ نے اس پر وار کیا اس وقت اسے لمحہ بھر کے لئے بھی شک نہ گزرا تھا کہ وہ موت سے اس قدر قریب ہے۔ تیورا کر گرا تو کشمیری ڈونگے جیسی پگڑی پہلے پھاٹک سے ٹکرائی اور پھر پھول کی طرح پتی پتی بکھر گئی۔

"یہ تُو نے کیا کیا مُورکھ"۔ پیچھے سے آواز آئی۔

"اپنے پنتھ کے آدمی کو مار دیا"۔ کہنہ سال سکھ بولا۔

"سوڈھیوں کا پتہ نہیں تجھے۔ ایک کو مارو تو لاکھوں اکٹھے ہو جاتے ہیں"۔

"دیکھتے کیا ہو۔ مرنے کی صلاح ہے اب تو بھاگ چلو ـــ راستہ لو"۔ تمام ... جتھہ منٹوں میں غائب ہو گیا۔

جب بھری اور کرنیل کور جستی پھاٹک تک پہنچیں تو ایک بھی مورکھ باہر موجود نہ تھا۔ ہربیل کی سانس رک رک کر آ رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ اس کے ماتھے سے لہو کی دھار نکلتی تھی۔ بھری کے دوپٹے پر جابجا لہو کے دھبے تھے۔ اسی طرح جب کرنیل کور کو چوٹ لگی تھی تو اس کا دوپٹہ لہو سے بھیگ گیا تھا لیکن

اسے اس سے گھن نہیں آئی تھی۔

"تُو باتیں نہ کر ہربیل سنگھ۔ آرام سے سو جا"۔

"اب تو سو ہی جانا ہے بھری۔ کم از کم باتیں تو کر لینے دے"۔

بھری نے منہ پرے کر لیا اور آہستہ آہستہ ہربیل کا بازو دبانے لگی۔

"میرے پاس تجھے دینے کیلئے کچھ نہیں ہے بھری۔ یہ کرنیل کور ہے اسے ساتھ لے جانا"۔

"..... لیکن۔"

"یہاں نہ بیٹھی رہنا میرے بعد۔ اپنے ملک چلی جانا۔ اور کرنیل کو ساتھ رکھنا"۔

بھری نے بات کاٹ کر آہستہ سے کہا: "پر یہ تو . . . . . میں اسے کہاں بیاہوں گی ہربیل سنگھ۔ سوڈھی سردار کہاں تلاش کروں گی اس کے لئے"۔

"کسی اپنے سے کسی آدمی سے بیاہ دینا۔ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے"۔

"تُو ٹھیک ہو جائے گا ہربیل۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر اسے کسی سوڈھی سردار سے بیاہ دینا"۔

"جوگندر سنگھ کی کرپان کا زخم کبھی ٹھیک نہیں ہوتا بھری"۔

ہربیل سنگھ کی ٹانگیں آہستہ آہستہ کانپ رہی تھیں اور وہ پٹی پر ہولے ہولے ہاتھ مار رہا تھا۔

بھری نے منہ پرے کر لیا اور سورۂ یٰسین پڑھنے لگی۔

"اوئے تُو اپنی ماسی کے ساتھ چلی جانا درشن کور۔ اب یہاں تیرا کوئی نہیں ہے۔ یہ تجھے جانتی ہے۔ کسی اچھی جگہ تیرا بیاہ کر دے گی"۔

آخری بار بھری نے ہربیل کی آنکھوں کا حسن دیکھا۔

بن تیل کی بتی بھک سے جلی اور پھر بجھ گئی۔

پاکستان پہنچ کر بھری نے بہت کوشش کی کہ کرنیل کی شادی کسی اچھے گھرانے میں ہو جائے لیکن جہاں بھی پیام لے کر جاتی لوگ کرنیل کی پچھلی ہسٹری سن کر خاموش ہو جاتے۔ کسی کو کوئی اعتراض تھا تو کسی کو کوئی۔

بہت برسوں بعد جب بھری نے داود کے چچیرے بھائی سے کرنیل کور کا نکاح کیا۔ اس روز شب معراج

پھر لوٹ کر آئی۔

کرنیل ہاتھوں میں مہندی لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی ساس کے منہ پر پھول ماں کے داغ تھے اور رنگ نرنجن ماچھی سے بھی سیاہ تھا۔

شبِ معراج ہولے ہولے گزر رہی تھی اور کرنیل کے ہاتھوں کی مہندی سُوکھ سُوکھ کر بھربھری ہو گئی تھی۔ پھر پچھلے پہر اس کی ساس نے بھری کو جگایا اور آہستہ سے کہا: "تو ہمیں سچ سچ کیوں نہیں بتاتی اس لڑکی کے ماں باپ کون ہیں؟"

"میں ہی اس کی ماں ہوں اور میں ہی اس کا باپ ہوں"۔

"دیکھ اگر تو اب نہیں بتائے گی تو بعد میں پچھتائے گی"۔

بھری ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ بولی ــــ "بہن۔ اس کے تے پچھلے سکھ ہیں۔ لیکن خدا جانتا ہے کرنیل کور ہمیشہ کی مسلمان ہے۔ اس کا دل بچپن سے مومن تھا"۔

"اگر کسی کو گاؤں میں پتہ چل گیا کہ یہ سکھوں کی بیٹی ہے تو میری پٹیا نالیوں میں ہوگی"۔

"نہیں بہن۔ عذرا سکھ نہیں ہے۔ مسلمان ہے۔ نماز پڑھتی ہے روزہ رکھتی ہے اس کا تو بچپن سے یہی حال ہے۔ دینداروں کی بیٹی ہے"۔

"ہائے ہائے بہن۔ خدا کا خوف۔ نومسلم کا رشتہ میرے بیٹے کے لئے ہی رہ گیا تھا۔ ہمارے لئے کیا کوئی مسلمان لڑکی کا رشتہ نہیں مل سکتا تھا"۔

آج پہلی بار کرنیل کو پتہ چلا کہ بھری اس کا رشتہ کیوں نہیں کر سکتی تھی۔

کرنیل کی آنکھوں سے ہولے ہولے آنسو نکل کر اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں جذب ہونے لگے پھر اُسے لگا بڑی حویلی کے کنگروں پہ سے انجیر کے درخت کی ڈالیاں زمین کی طرف جھکیں۔ ایک پتہ ان ڈالیوں سے بچھڑ کر فرش پہ جا گرا۔

اس پتے پہ ہربیل سنگھ کا نام لکھا تھا۔

ہربیل سنگھ کون تھا؟

کیا میں پاکستان میں کبھی اس کا ذکر کسی سے نہ کر سکوں گی؟ ــــ کیا عذرا بیگم بن کر میرے دل سے ہربیل سنگھ کی ساری محبت ڈھل چکی ہے؟ ــــ کیا ہربیل سنگھ کا نام میرے سسرال میں گالی سمجھا جائے گا ــــ؟

عمارتیں جھکی آ رہی تھیں۔ چارپائیاں ہلکورے لے رہی تھیں اور کرنیل کے ہونٹ بغیر ہلے کہہ رہے تھے۔ یا رسول اللہؐ! تیرے در پر آئے ہوئے لوگوں کے لئے تیرے پیاروں نے دروازے کیوں بند کر رکھے ہیں ــــ مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ سوڈھی سرداروں کی لڑکی تیلی کے ساتھ بیاہی جا رہی ہے۔ میں تجھ سے پوچھتی ہوں کتنے برسوں میں ایک نومسلم مسلمان ہو جاتا ہے۔ کتنے برسوں میں؟ کتنے برسوں میں عرشِ منور پر جانے والے، کلمہ پڑھنے کے بعد مسلمان کہلانے کے لئے، کتنے برسوں کمٹھالی میں رہنا پڑتا ہے؟ ــــ کتنے سال؟ کتنے سو سال؟ ــــ اور پھر مسلمان ہو جانے پر کب اور کس طرح وہ تیرے دروازے پر دستک دینے والوں پر تیرا ہی دروازہ بند کر دیتا ہے؟ ــــ قفل کھولنے اور دوسروں پر قفل لگانے کی کتنی منزلیں ہیں رسول اللہ ــــ عرب سے عجم، عجم سے پاکستان، پاکستان سے بنگال، بنگال سے انڈونیشیا...... کہاں کہاں دروازے کھٹکھٹائے گئے اور بند پائے گئے۔ اندر گھس جانے والے باہر والوں پر ظلم کب تک روا رکھیں گے۔ ظلم سہنے اور ظلم کرنے کی روایت کب تک رہے گی۔ کتنے سال؟ کتنے سو سال؟ ــــ

سامان شیون

آبنوسی فرش پر نوعمر کنواری کے گیلے پیروں کے نشان ہیں۔

جب جون کے مہینے کی گرم ہوا انہیں بوسہ دینے کے لیے جھکے گی تو یہ نشان خود بخود اس بوسے میں جذب ہو جائیں گے ـــــ اور سیاہ فرش پر سے ان کا نشان مٹ جائے گا۔ مائع گیس بن کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ پھر گیلے پیروں کا نشان جون کا مسموم بوسہ بن کر سیاہ فرش پر آب برساتا املتاس کے درختوں میں نکل جائے گا اور کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ ہر سیاہ فرش پر کسی نہ کسی نوعمر کنواری کے پیروں کے نشان ہوا کرتے ہیں۔

میری ساری عمر ایسے ہی نشانوں کے تعاقب میں گزری ہے ـــــ میں نے مادہ کو اپنے سامنے حالتیں بدلتے دیکھا ہے۔ ٹھوس سے مائع اور مائع سے گیس ـــــ میری زندگی کا سیاہ فرش بہت چکنا ہے اور اس پر یادوں کے نشان بہت جلد مسموم بوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میرے کمرے کے سامنے ایک اونچا پیپل کا پیڑ تھا۔ گرمیوں میں اس کی ساری پھننگ پر ایک چیل کا گھونسلا نظر آیا کرتا تھا۔ اس گھونسلے میں انڈے سینے والی چیل جون کی دھوپ میں بری طرح تنہا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے اس چیل پر بہت ترس آتا تھا۔ بھری دوپہر میں مجھے املتاس کے زرد فانوس رو شنگوفوں سے کوئل کی آواز آتی۔ سرونٹس کوارٹر کی جانب سے کوئی شوخ بچہ پپیہے کی صدا بلند کرتا تو مجھے ایئرکنڈیشنر کی مسلسل گھر گھر سے خوف آنے لگتا۔ ٹھنڈے کمرے میں لسی ہوئی ایئرفریشنر کی

خوشبو پولن کی طرح ناک میں گھسنے لگتی۔ یکدم میرا سانس بند ہونے لگتا۔ میں سوں سوں کرتا کھڑکی میں چڑھ بیٹھتا اور پردے کی جھری سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر دور دور تک تانبے کی طرح چمکتی روشنی ہوتی اور دیواروں سے، پٹڑیوں سے روشنیوں کا ایسا ہلتا ہوا پانی نظر آتا جیسا گرم سڑک پر دور سے ایک آبی سا سراب بن جایا کرتا ہے۔

امی ابو کا یہ کمرہ جس میں تین ٹن کا کولر تھا فرانسیسی وضع کا بیڈ روم تھا۔ دیواروں کی جلد صاحب لوگوں کے نوزائیدہ بچے کی طرح صاف ملائم اور بیداغ تھی۔ سارا فرانسیسی فرنیچر امپورٹڈ تھا۔ امی کی الماریاں —— ڈریسنگ ٹیبل، شلف، چیسٹ آف ڈرارز سب سفید تھے جن کی جلد بیش قیمت فارمائیکا کی تھی۔ چابی لگتے ہی الماریوں میں ہولے ہولے گھنٹیاں بجنے لگتیں جیسے کوکو کی گھڑیوں میں عموماً بجا کرتی ہیں۔ کمرے میں ہر طرف سفید پردے تھے۔ ابریشمی، آب رواں سے بے ضرر پردے —— اسی سفید کمرے میں میری سفید ماں آئرش لینن کی چادر پر سفید پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے ٹخنے ایکدوسرے پر دھرے گھٹنوں لیٹی رہتی۔

میری ماں بڑی نازک عورت تھی —— ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب کی طرح گرم و سرد سے بے نیاز وہ آرائش و زیبائش اور نمائش کے لئے بنی تھی۔ کسی قسم کی آزمائش سے اس کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد اس کا نازک جسم پھر کبھی بارآور ہونے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن اس محبت کا اظہار ہمیشہ تحفے لانے تک محدود رہا۔ وہ نہ کسی کو بھینچ کر سینے سے لگا سکتی تھی اور نہ ہی کسی کی والہانہ گرفت کی متحمل ہو سکتی تھی —— میری ماں کو انسانی جسم کی خوشبو سے نفرت تھی اسے مجھ سے بُو آتی تھی۔ ملازموں سے بُو آتی تھی۔ اسے میرے گنجے باپ سے بُو آتی تھی۔ وہ سارا دن اپنے جسم پر اپنے کمروں میں اپنے بستروں پر بدیسی خوشبو چھڑکتی رہتی۔ میری ماں نے جب کبھی کسی سے ہاتھ ملایا! اپنے ننھے رومال سے (جس پر اس کے نام کا پہلا حرف انگریزی میں کشیدہ کیا ہوتا) بعد میں اپنا ہاتھ ضرور پونچھا۔

میری ماں جس کمرے میں داخل ہوتی اس کا پہلا سانس انسانی ہاتھ کی طرح محسوس کرتا نکلتا۔ وہ اس

سانس میں کمرے کے تعفن، اس کے رہنے والوں کی خوش ذوقی کا اندازہ لگا لیا کرتی تھی —— اس لیڈی آف شیلاٹ، اس ہاٹ ہاؤس کے سفید گلاب، اس پلاسٹر آف پیرس کی میڈونا نے اپنی محبت کی شدت میں مجھے اس طرح پالا جیسے کسی سراب کے خوف سے کوئی راج کنیا اپنا بچہ کسی مٹھ میں پال رہی ہو۔ مجھے سکول جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرے اتالیق گھر پر آ کر مجھے پڑھاتے تھے۔

سرونٹس کوارٹر کی طرف قدم دھرنا تو درکنار ادھر دیکھنے کی بھی ممانعت تھی۔ اس طرح نیلے لہو پر مقامی سیاہ لہو کی پرچھائیں پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ ہمارے رشتہ داروں سے ماں کبھی کی کٹ چکی تھی۔ وہ اب ایسے سوشل سرکل میں رہتی تھی جہاں سب روز روز ملتے ہیں لیکن کوئی کسی کو نہیں جانتا —— میری ماں کے گرد غیر ضروری مصروفیات کا ایسا جال پھیلا تھا جیسے گھنی الیرک باڑ کو امربیل نے ڈھانپ رکھا ہو۔ وہ فرصت کے لمحوں میں بیمار رہتی اور غیر ضروری مشاغل کے وقت چاق و چوبند —— میری ماں ان عورتوں میں سے تھی جنہیں عرب بدوی انانہ کہتے ہیں۔ کمزوری اور بیماری کے بہانے انہیں ایک ایسی خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ نہ اپنے نہ کسی دوسرے کے کام کی رہتی ہیں۔

ابو گنجے تھے۔ خاموش طبع اور دولتمند۔ ہر دن کے ساتھ ساتھ ان کے گنجے پن، خاموشی اور دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سردیوں کی لمبی شاموں میں وہ کبھی کبھی میرے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ انکے ہاتھ میں ہمیشہ ان کا بریف کیس ہوتا۔ اس بریف کیس کے کئی خانے تھے اور ہر خانے میں ضروری کاغذات اور اہم چٹھیاں ہوا کرتی تھیں۔ پھر وہ زپ کھول کر کچھ ایسے خط نکال لیتے جن میں مختلف مشینوں کی لسٹیں موجود ہوتیں۔ ان کا سر بیرونی ممالک سے آئے ہوئے خطوں پر جھک جاتا اور وہ خاموشی سے خط پڑھتے رہتے اور جب خط ختم ہو جاتے تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ میں اپنے ان کھلونوں کے انبار میں سے انہیں دیکھتا رہتا جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خدا جانے کیوں میرا جی چاہتا کہ میں اٹھ کر ابو کے چکنے چمکتے سر پر ہونٹ رکھ دوں لیکن ان کے خاموش چہرے کو دیکھ کر مجھے عجیب سا خوف آتا۔

سردیوں کی طویل راتوں میں جب میرے کمرے میں سرخ ہیٹر جلتے اور گرم پانی کی بوتل میرے پیروں کو چھوتی، بستر میں سے لیونڈر کے پھولوں کی خوشبو آتی اور پردوں کی رعنائی پر میری کامک کی کتابیں بکھری ہوتیں۔

ایسی راتوں میں جب اچانک کھڑکی پر رات کے وقت بجلی کی چمک سے چانن ہو جاتا میں جاگ اٹھتا۔ سردیوں کی بارش کھڑکیوں پر بجتی۔ گرم پانی کی بوتل ٹھنڈی ہو کر قالین پر لڑھک جاتی اور میں جاگتا رہتا اور سوچتا رہتا۔

بہار اور خزاں کے دن تتلیوں اور پھولوں کی وجہ سے تکلیف دہ تھے۔ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت پسند تھیں اور ان دونوں سے میں بہت خوفزدہ تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک زرد رنگ کی تتلی پکڑ کر ایک گلاس کے نیچے بند کر دی۔ اس کا دل بہلانے کیلئے میں نے دو چار رنگین پھول بھی ساتھ مقید کر دیئے۔ یوں زرد تتلی کو محبوس کر کے مجھے عجیب راحت سی محسوس ہوئی لیکن جب میں دوپہر کا کھانا کھا کر لوٹا تو وہ تتلی پھولوں کی قبر میں پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اسے پانی پلا کر زندہ کرنا چاہا تو اس کے پروں کا زرد برادہ میری انگلیوں پر اتر آیا۔ اس کے خوش رنگ پر زندہ رہے لیکن وہ خود مر گئی۔ تنہائی کی موت!

میرے یہ چھوٹے چھوٹے تجربے جن کا تعلق روح اور ذہن سے بہت گہرا تھا مجھ پر دیرپا اثرات چھوڑتے۔ میں گناہ اور ثواب کے چکر میں دور تک اتنا دھنس گیا تھا کہ تتلی کے یوں اچانک مر جانے کو میں نے دوزخ میں گھر بنانے کے مترادف سمجھا اور دو دن تک پرائشچت کے طور پر بھوکا رہا ——— یہ بیکار دن ——— یہ بیکار راتیں ——— یہ آسائش کے پلنے میں چاندی کا چمچ منہ میں لیے ساٹن سی جلد والی چھت کو تکنے والا بچہ عجیب کرب کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ تو گرمیوں کی لمبی دوپہریں تھیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ایک امیر بچے کی گرمیوں کی سرد دوپہریں!

امی پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے تختے آپس میں جوڑتے کسی جاسوسی ناول کو پڑھتی سو جاتیں اور میں ٹھنڈا کمرہ چھوڑ کر نیچی چھت والے گرم کمروں میں گھومتا رہتا۔ سارے کمرے یکساں طور پر آراستہ اور گرم ہوتے تھے۔ ان نیچی چھت والے کمروں میں قالینوں کی گرم مہک پردوں کے اندر محبوس ہوا کرتی تھی پھر ان کمروں کو چھوڑ کر میں اپنے کمرے کے سامنے چھوٹے سے لاؤنج میں آ جاتا جہاں بیرونی دیوار ساری شیشے کی تھی۔ اس جگہ سے چیل کا گھونسلا بڑی اچھی طرح نظر آتا تھا۔

ایک بار اس گھونسلے کو خوبصورت بنانے کے لئے چیل کہیں سے میری امی کی جالیدار محرم اڑا لائی تھی۔ پیپل کی آخری پھننگ پہ کرخت تنکوں کے گھونسلے کے ساتھ فرانسیسی لیس کی انگیا! اگر کسی اشتہار

دینے والی ایجنسی کو پتہ چل جاتا تو وہ اس گھونسلے کا کلوز اَپ ضرور لیتے۔ گھونسلے میں بیٹھی ہوئی فرانسیسی میڈن جیسی چیل عقابی ناک اور پر شکوہ پرسنیلٹی اور نیچے رقم ہوتا۔ گرمی ہو یا سردی ہر باذوق خاتون کے لئے ——— ہر موسم میں۔

میں اس گھونسلے کو دیکھتا رہتا اور املتاس کے زرد فانوسوں میں سیاہ کوئل بار بار کوکتی رہتی۔

ٹیوب ویل کے چلنے کی آواز آتی رہتی

کوارٹروں میں بچے پیپیے بجاتے رہتے۔

گھونسلا دیکھنے کے بعد میں جب کبھی کمرے کے اندر دیکھتا تو میری آنکھوں کے آگے ایسے شعلے ٹوٹتے جیسے کمرے میں ویلڈنگ ہو رہی ہو۔ پھر میری کمزور اور بیمار ماں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ اٹھ کر ننھے سے رومال سے منہ صاف کرتیں۔ ایسا ہاؤس کوٹ پہنتیں جس میں سے سارے کپڑے اور بھی واضح طور پر نظر آتے۔ اپنے کٹے ہوئے بالوں کو زرد اور بیمار انگلیوں سے سنوارتی ہوئی وہ تلاش کرنے نکلتیں۔

گرم کمروں میں محبوس گرم فضا میں سانس لیتے ہر کمرے کی خوشبو کا اندازاً جائزہ لیتے ہوئے مجھ تک پہنچتیں۔

امی نے مجھے کبھی نہیں جھڑکا۔

ابو مجھ پہ کبھی ناراض نہیں ہوئے۔

ہم تینوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اس قدر اعتماد نہیں تھا کہ ہم اپنے دل کی بات کو الفاظ میں ڈھال سکتے۔

امی کو دیکھ کر میں چپ چاپ ان کے ساتھ رخصت ہو جاتا اور خاموشی کے ساتھ ٹھنڈے کمرے میں پلنگ پر لیٹ جاتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری ناک بند ہو جاتی اور الرجی سے میرا سانس بند ہونے لگتا۔

امی ابو کی ہر اہم بات انگریزی میں ہوا کرتی تھی جس طرح ننھے سرخے ٹھونگا مار کر گنی میں سے گری نکال لیتے ہیں اور چھلکا رہنے دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی گفتگو کا سارا مفہوم میں چگ لیتا اور پھوک رہنے دیتا۔

میں اس سفید کوٹھی میں اس طرح پل رہا تھا جیسے کسی ہسپتال کے انکیوبیٹر میں سقوط انسہ بچہ دن کاٹ رہا ہو۔ ایسی زندگی نے مجھے بہت نازک مزاج بنا دیا۔ ہر موسم کی تبدیلی میری صحت پہ اثر انداز ہوتی۔ میری غذا خاص اہتمام سے تیار ہوتی اس میں ذرا سا ردوبدل صحت کی خرابی کا بہانہ بن جاتا۔ بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرنے کے لئے مجھے اتنے ٹیکے لگوانے پڑتے کہ جاں بلب مریض کو اتنے ٹیکوں کی شاذ ہی ضرورت پڑتی ہوگی۔ ہمارے گھر کا سارا نظام گھڑی اور خوف کے تحت چلتا تھا۔ چوروں کا خوف —— بیماری کا خوف —— بڑھاپے کا خوف —— ملازموں کا خوف —— اخبار پڑھ کر انجانے حادثوں کا خوف —— بالآخر آسائش چھوڑ کر مرنے کا خوف! تمام غیر ضروری مشاغل گھڑی کے تابع تھے۔ ہر غیر اہم کام گھڑی دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ یہاں ڈنر پر جانے کی جلدی تھی۔ یہاں ڈنر سے لوٹ آنے کی جلدی تھی۔ صبح الارم لگا کر اٹھا جاتا تھا۔ اور پھر الارم بند کر کے نیند کی جاتی تھی۔ ملازموں کو مقررہ وقت پر ناشتہ لگانے کا حکم تھا اور ناشتہ کی جگہ صرف گریپ فروٹ کھایا جاتا تھا۔ ہر لباس اہتمام سے پہنا جاتا تھا اور اہتمام سے پہننے کے بعد اسے اتار پھینکنے کی جلدی رہتی تھی۔ ہمارے گھر میں وقت کی سونے کی طرح قدر کی جاتی تھی اور سونے کی قدر اس لئے ختم ہو چکی تھی کیونکہ یہ مایا داس کا گھر تھا اس میں جس چیز کو ہاتھ لگاؤ کھٹ سے سونے کی بن جاتی تھی۔

اکیلی چیل سے متاثر ہو کر ایک بار میں نے بلی پالنا چاہی۔ ننھی سی سفید بلی۔

وہ چھوٹی سی گلابی ناک والی بلی خدا جانے کیونکر ہمارے گھر آ گئی تھی۔ شاید اسے چیل نے بھیجا تھا۔ جو بھری دوپہر میں عقابی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی —— گچھے دار دم والی ننھی سی سفید بلی بڑی چٹوری اور بڑی کھلنڈری تھی۔ پہروں اپنی دم کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ گلابی زبان سے اپنے پنجے چاٹتی۔ ذرا بھر مٹی لگ جاتی تو پہروں اپنا جسم زبان سے دھوتی۔ اس بلی کو میں نے اپنی زندگی میں داخل کر لینا چاہا لیکن میری امی نے اس بات کی اجازت نہ دی کیونکہ انہیں جانوروں کے بالوں سے، پرندوں کے پروں سے اور چڑیوں کے گھونسلوں سے الرجی تھی۔ ایسی کوئی چیز کوٹھی کے احاطے میں ہوتی تو انہیں چھینکیں آنے لگتیں اور وہ بیمار پڑ جاتیں۔ جس روز ننھی سفید بلی کو بوری میں بند کر کے چوکیدار روانہ ہوا میں سو رہا تھا۔

لیکن اگر میں جاگ بھی جاتا تو میرا ردِ عمل وہی ہوتا۔

اپنے گنجے باپ کی طرح میں بہت خاموش ہوں

مربے انوکھے مرکبات کھلتے رہنے کے باوجود ان کے گنجے پن میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔

ذہانت کی کمی کے باوصف ان کی دولت گوندنی کے پیڑ کی طرح لدتی چلی گئی۔

میرا باپ بہت شفیق تھا۔ وہ جس کسی ملک میں جاتا میرے اور امی کے لئے وہاں کی مہنگی ترین سوغاتیں لاتا۔ میرے باپ کے سوٹ کیس پر ان گنت ایئر لائنوں کی پرچیاں چپکی ہوتی تھیں۔ وہ رومانیہ، بلغاریہ، بلجیم، پولینڈ، روسی ترکستان کی باتیں اس طرح کرتا تھا جیسے کوئی نوری بازار، بولٹن مارکیٹ یا انار کلی کی بات کر رہا ہو۔

اس ماحول سے نکل کر جب میں بالآخر سکول میں پہنچا تو میں نے اپنے ارد گرد ایک ایسا حصار باوقار تعمیر کر لیا تھا کہ ہم جماعت تو درکنار اساتذہ تک مجھ سے الگ تھلگ رہنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ سکول میں مجھے کوئی ہم سطح لڑکا نہ ملا۔ کچھ تیکھے ٹانک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ دو چار لڑکوں نے محبت کے برمے لگا کر میرے دل کی فصیل میں سوراخ کرنا چاہے۔ سوراخ ہو بھی گئے۔ فصیل ٹوٹ بھی گئی لیکن ان لڑکوں کو علم نہ ہو سکا کیونکہ میں اپنے باپ کی طرح خاموش تھا۔

خدا جانے اصلی وجہ کیا تھی لیکن جب میری امی ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مئی کے وسط میں مری چلی گئیں تو پہلی بار میں نے کھلی فضا میں سانس لیا۔ ان دنوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور پہلی بار امی نے مجھے چھوڑا تھا۔

ہمارے گھر میں جہاں ہر طرف، ڈیٹول، وِش ڈیوڈورنٹ اور ایئر فریشنر کی خوشبو تھی، ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔

اچانک، بلا تکلف اور آزادانہ۔

یہ پہاڑوں کی ہوا کی کلو تھی۔

ہزارے کی یہ لڑکی چیڑ کی طرح تکلیف دہ بے تکلف اور مزیدار تھی۔ اس کا ہیمو گلوبن کسی آئرن

ٹائک کا محتاج نہ تھا۔ ہر وقت تھال سا چہرہ گُڑ ہل کے پھول کی طرح سرخ رہتا۔ چہرے مہرے سے کسی سپیرے کی لڑکی لگتی تھی۔ جسم دیکھ کر کاسُستھ لڑکیاں یاد آتیں جن کی جوانی تنی کمان جیسی اور ادھیڑ عمر ڈھیلے جھولے ہوا کرتی ہے۔ چال ڈھال میں کنجاہ کی چاشنی تھی۔ باتیں کرتی تو سوئی ہوئی لگتی۔ چپ ہو جاتی تو یوں لگتا بولے جا رہی ہے۔

میرا وجود ان دنوں تھرموس سے مشابہ تھا۔ ایک بار جو بھی جذبہ اندر ڈال کر کارک لگا لیتا، دیر تک اس جذبہ کی حدت و حرارت ویسے ہی برقرار رہتی۔ اس تھرموس میں سب سے پہلے میں نے گلو کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کا گرم گرم لاوا بند کر لیا۔

گلّو بیرے جہاندار خان کی بہن تھی اور ایک ماہ کے لئے جب جہاندار کی ٹانگ پلستر میں تھی بیراگیری پر مامور ہوئی تھی۔

غالباً اس سے زیادہ اُجڈ، گنوار اور بے تمیز بیرا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

پہلے ہی دن جب وہ میز پر غلط سلط برتن لگا کر سوپ لائی تو رکھنے رکھانے میں اس نے آدھا سوپ اپنے اور میرے اوپر انڈیل لیا۔

میرے لئے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ سوپ کبھی گر بھی سکتا ہے میں اس کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے ابھی سرویٹ تک ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ اپنے دوپٹے کی گدی سی بنا کر بڑی بے تکلفی سے میری قمیض اور پتلون پونچھنے میں مشغول ہو گئی۔

"تم رہنے دو ——" میرے گنجے ابّو بولے۔

"کوئی بات نہیں جی۔ میرا دوپٹہ گندا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں —— گندا ہے رہنے دو۔" میرے ابّو بولے۔

وہ ملی بھر کو ٹھٹکی۔ سمجھنے کی کوشش میں اس نے ابّو کی جانب دیکھا اور پھر از سرِ نو پھرکی کی طرح چاروں طرف گھوم کر سوپ سکھانے میں مصروف ہو گئی۔

گلو کی آنکھیں مہاتما بدھ کی آنکھوں جیسی لمبی لمبی کنپٹیوں تک چڑھی ہوئی آنکھیں تھیں —— کچھ

خوابیدہ سی، کچھ محتاج جیسی —— اداس ہوتے ہوئے ذرا ذرا مسکرا پڑنے والی آنکھیں مجھے ان آنکھوں کو قریب سے دیکھنے کی ایسی شدید تمنا کا سامنا کرنا پڑا کہ میں پوش پوش کرتا اپنے کرے میں بھاگ گیا۔

اس عمر کی محبت میں انسان بہت زیادہ پُر اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد کی کیفیت اس گیس بھری بوتل سے مشابہ ہے جس کا کارک ابھی کھولا نہ گیا ہو۔ ساری تھرموس فقط احساسِ لذت سے بھری ہوتی ہے زندہ رہنے کا احساس، کسی کو شدت سے چاہنے کا احساس، سارا ماحول، موسم، باتیں ایک پر زم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اچانک آنکھوں کے آگے ایک زوم لنز لگ جاتا ہے اور ہر چیز ہر لمحہ محبوب کی شکل اختیار کر کے کھٹ سے آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔

پہلے ہی دن جب میں کھانا کھائے بغیر میز سے اٹھ آیا تو گلو میرے کمرے میں آئی۔ نہ جانے وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی کہ چھوٹی۔ بہر کیف قد ہم دونوں کا برابر تھا۔

"آپ کا کھانا یہاں لا دوں جی —— صاحب جی۔"

جس طرح کچھ لوگ مچھلی کھانے کے بعد دودھ پینے سے ڈرتے ہیں بس اسی طرح اس کی محبت سے آشنا ہو کر اس کے وجود سے خوف کھانے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"خانساماں مجھے ناراض ہو رہا ہے جی —— لا دوں جی کھانا؟"

میں نے احمق پن سے کاغذ کی کتابیں چھپاتے ہوئے کہا: "مجھے بھوک نہیں ہے وہ جی —— مجھے ناراض ہو رہا ہے جی خانساماں۔"

"اچھا لے آؤ"

گلو کمرے میں آتی تو میں چونکیں جانور کی طرح اپنا سارا بوجھ پنجوں پر محسوس کرتا۔ وہ چلی جاتی تو میں دیر تک اس خواہش کو دباتا رہتا جو مجھے اس کے پیچھے جانے پر اکساتی رہتی تھی۔ مری میں میری امی اپنی صحت کو درغلانے کے لئے بہت جتن کر رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کے بل ادا کرنے، کیمسٹوں کی دکانوں کے چکر کاٹنے اور اپنے نظامِ زندگی پر تاسف کرنے میں ان کے دن بسر ہوتے تھے۔ میں سارا دن اس

قلمی آم کی طرح جو چوس لپٹاپ جانے کی راہ دیکھ رہا ہو اندر ہی اندر میٹھے رس سے بھرا جا رہا تھا۔ میرا رنگ زرد اور میرے ہاتھ پیر جلنے لگے تھے۔ اس کی آہٹ پا کر ہمیشہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ میں اس اصیل پٹھے کی طرح تھا جو ابھی اصیل مرغے کی عمر کو نہ پہنچا ہو اور خواہ مخواہ لڑنے کی آرزو میں مرا جاتا ہو۔

یہ دن یہ راتیں عجیب طرح بسر ہوئیں۔

نویں جماعت کا پہلا عشق —— مون سون بارش کا پہلا ریلا۔ نرگس کے ڈنٹھل میں ادھ کھلا پھول، میمنے کے منہ میں دودھ کی پہلی دھار۔

گلو بیرے کی جہاندار بہن تھی۔ اس کے میرے درمیان لامحدود فاصلے تھے اور سب سے بڑا فاصلہ اس حجاب کا تھا جو قدرتی طور پر مرد میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ میں چپ چاپ دم سادھے جہاتما بدھ کی آنکھیں دیکھتا رہتا اور میرے منہ سے کبھی کوئی بات نہ نکلتی۔ میں بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور بندوق داغنے کی ہمت نہ تھی۔

پھر اچانک ایک دن اس لبلبی پر بوجھ پڑ گیا آپی آپ۔

میں امی کے کمرے میں کبھی نہ جاتا تھا لیکن اس روز میں باتھ سالٹ لینے امی کے کمرے میں گیا تو میں دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ گلو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ سٹک تھی اور وہ اس وقت امی کی ایک لمبی سی مالا پہننے کے عمل میں تھی۔ یہ لمبی سفید مالا امی کبھی کبھار سنگی فیروزی ساڑھی کے ساتھ پہنا کرتی تھیں۔ اس مالا کے نیچے بڑا سا فیروزی لاکٹ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ یوں گھبرائی جیسے جھاڑ بند کھیلتے پکڑی گئی ہو۔

وہ دوپٹے سے لپ سٹک پونچھتی میری طرف بڑھ آئی:

"صاحب جی خدا کی قسم جی۔۔۔۔۔ میں جی صرف دیکھ رہی تھی یہ ہار۔۔۔۔۔ خدا قسم جی۔ میں نے بیگم صاحب کی کوئی چیز نہیں چرائی۔ آپ کوارٹر چل کر دیکھ لیں جی۔۔۔۔۔ آئیں جی میرے ساتھ۔"

میرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا۔ میں صرف اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ ہونٹوں سے اتری ہوئی لپ سٹک کو گھور رہا تھا اور وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

"میں چور نہیں ہوں جی۔ بھائی مجھے جان سے مار دے گا۔۔۔۔۔ میں چور نہیں ہوں صاحب جی۔"

میں بجلی کے کھمبے سا گڑا رہا تو وہ یکدم میرے پیروں میں آ کر جھکا کر بیٹھ گئی۔ گھٹنے سے فیروزے کا لاکٹ میرے بوٹ سے جا ٹکرایا اور اس کے دونوں ہاتھ میرے تسموں سے چپک گئے۔

"خدا کے لئے جی مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔ میں جی۔۔۔۔۔ چور نہیں ہوں۔ آپ کوارٹر میں جا کر دیکھ لیں۔"

پتہ نہیں گلو مجھ سے عمر میں بڑی تھی کہ چھوٹی، بہر کیف قد ہم دونوں کا برابر تھا۔

جب میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا تو میری انگلیوں کا بوجھ اس پر اتنا ہلکا تھا جیسے وہ گلاس تلے اوندھی بیٹھی ہوئی تتلی تھی اور مجھے خوف تھا کہ اسے چھوتے ہی اس کے پروں کا رنگ میری انگلیوں پر اتر آئے گا۔

اس کے سانس میں لونگ کی خوشبو تھی۔

"مجھے معاف کر دیں۔ میں چور نہیں ہوں جی"

"یہ مالا تم اپنے گاؤں لے جانا ——"

"میں جی —— یہ مالا ——" اس نے مٹھی میں لاکٹ بھینچ لیا۔

اس کا چہرہ حیرانی، خوشی "جا جھوٹا" قسم کے جذبات سے گلناری ہو گیا۔

"پکی —— لے لوں میں ——"

"ہاں۔ پکی۔ ہمیشہ کے لئے ——"

سفید موتیوں کو اپنی انگلیوں سے بوسے دیتی وہ بھاگ گئی اور میں وہیں کھڑا رہا۔

یہ میرا اور گلو کا رومان تھا —— اسے میں نے اس لئے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ وہ الزام آپ کی سمجھ میں آ سکے جو سارا نے مجھ پر لگایا۔

گلو مجھے پھر نظر نہ آئی۔ شام کو اس کا بھائی جہاندار ڈیوٹی پر موجود تھا اور وہ واپس ہزارے جا

چکی تھی۔

میرے دل کے آبنوسی فرش پر نوعمر کنواری کے پیروں کے گیلے نشان پڑ گئے اور پھر روزمرہ کی زندگی کی گرم ہوا بن کر چاٹ گئی۔

میں اس واقعے سے کچھ ایسا اذیت پسند ہو گیا کہ پھر کبھی کسی لڑکی کے قریب ہونے یا کسی لڑکی کو اپنے قریب کرنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ یوں سایۂ زلفِ بتاں سے بھاگ کر میں بزنس کی چار دیواری میں محبوس ہو گیا۔ دولت کو میرے والد نے جس سپیڈ سے جمع کرنا شروع کیا تھا میں نے اس کی رفتار میں راکٹ کی قوت سمو دی۔ میں راجہ مایا داس بن گیا۔ جس چیز کو ہاتھ لگاتا سونے کی بن جاتی۔ میرے بلیو پرنٹ، میرے پلان، میری سکیموں کو دولت کی بددعا لگ چکی تھی۔ میں کھلے کھرے سودے کرتا اور روز سو چند منافع کی صورت میں مجھ تک لوٹ آتے۔ خدا جانے میرے پاس وہ مشین کہاں سے آ گئی تھی جو ہر لمحہ سونا اگلتی تھی مارکو پولو کی طرح میری ہر سکیم کامیاب اور سونے میں تُلی تھی ——— میں کامیابی کا سمبل، خوش بختی کا آئیڈیل اور ترقی کی معراج تھا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ممی ڈیڈی کی وفات کے بعد میں پہلی بار یورپ گیا۔

یہاں میری ملاقات سوئٹزرلینڈ کی پڑھی ہوئی سارا سے ہوئی ——— سارا کا والد میرے مرحوم باپ کی طرح بہت امیر آدمی تھا اور اس نے سارا اپنی اکلوتی بن ماں کی بیٹی کو بہت لاڈ سے پالا تھا۔ وہ اپنے نام کو ہمیشہ انگریزی میں لکھتی تھی اور ایچ کے ساتھ ختم کرتی تھی جس طرح بائبل میں حضرت اسحٰق کی بیوی کا نام لکھا ہوتا ہے۔

ہماری شادی کراچی کے ایک ایسے ہوٹل میں ہوئی جس کی لفٹیں کھٹا کھٹ سات منزلیں چڑھتی اترتی تھیں۔ ہماری شادی کراچی شہر کے لئے عرصے تک ایک ٹاپک بنی رہی۔ ہماری شادی کی تصویریں مختلف فیشن ایبل رسالوں میں چھپیں اور ہم ہنی مون منانے ہوائی چلے گئے۔

آسائش کے ہاٹ ہاؤس میں پلے ہوئے دو گملے۔

شادی کی پہلی رات جب میں ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو میری دلہن فرل دار نائٹی پہنے پلنگ پر

اوندھی لیٹی تھی۔ کمرے سے ماؤتھ واش، سپرٹ اور ایئر فریشنرز کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں امی یاد آ گئیں۔ آنکھ کی جھری سے اس نے میری جانب دیکھ کر کہا:

"ایکسکیوز می ——— میری عقل داڑھ نکل رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔"

نہایت غیر رومانی طریقے سے میں نے اس کا منہ کھولا اور عقل داڑھ کی پھولی ہوئی تھیلی ٹارچ کی روشنی میں دیکھی۔

یہ ساری رات سارا ہائے ہائے کرتی رہی اور میں اس کی تیمارداری کرتا رہا۔

ہنی مون شادی شدہ جوڑے پر معاشرے کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ دو انسان جو راکٹ کی سی تیزی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہوں انہیں بار بار جڑنے کی ترغیب دینا شکست و ریخت کی داستان مرتب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ شروع شادی میں اڑچنیں شادی کو مستقل کرتی ہیں۔ مکمل آزادی سے اس مشک نافے کی خوشبو پھٹ کر غائب ہو جاتی ہے۔ ایک طرح سے ہمارا ہنی مون بھی ہر ہنی مون کی طرح پہلے ہفتے میں ہی فیل ہو گیا اور ہم ایسے وہ باکس آفس ہٹ نہ بنا سکے جس کی توقع لے کر ہم دونوں ہوائی گئے تھے۔

مجھے سارا کی ہر بات سے اتفاق تھا اور خدا جانے وہ کیوں سمجھتی تھی کہ اعتراض نہ کر کے میں اس کے ساتھ محبت کے فقدان کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہوں۔ اسی لئے ہم نے محبت کرنے کا ایک ایسا اسلوب اپنا لیا جس میں نقلی اذیت دینے اور اس اذیت سے حظ اٹھانے کی قوت تھی۔ جونہی بن ماں کی اکلوتی سارا باپ کی لاڈلی، دولت کی پروردہ یہ محسوس کرتی کہ میں اس کی طرف متوجہ نہیں اور ہماری باتوں کا سٹاک ختم ہو چلا ہے۔ وہ میرے پاس گربہ پائی سے آتی۔ اس کے جسم سے خاص کر اس کی آستینوں کے قریب سے نیم کے گیلے پتوں کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اسی لئے اسے ہر قسم کے DEODORANTS سے عشق تھا۔ وہ مجھ پر جھک کر انگریزی میں پوچھتی:

"آپ کے خیالوں کے لئے ایک پینی ———"

میں چپ رہتا۔

ساری زندگی یورپ میں گزارنے والی کنواری پوچھتی ——— "بتایئے ناں۔ کون یاد آرہا ہے؟ ——— بولئے ———"

"کچھ بھی نہیں سارا"۔

میں نے گلو کے بعد زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو قریب سے دیکھا تھا۔ جب میں نے سارا سے شادی کی تو یہ ایک بزنس مین کی شادی تھی لیکن رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ سب کچھ میں نے سارا کی تحویل میں دیدیا۔ لیکن سارا ان لڑکیوں میں سے تھی جو OCTOPUS کی طرح اپنے محبوب کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہتی ہیں جو آدمخور درخت کی طرح حیوانی لہو سے سیر نہیں ہو پاتیں۔ وہ میرے ان خیالات پر بھی پہرہ بٹھانا چاہتی تھی جو نہاتے ہیں، دانت برش کرتے وقت، جرابیں پہنتے ہوئے میرے دماغ پہ بدلی بن کر چھا جاتے تھے۔ دراصل وہ میرے خیالات اور احساسات پہ حکمرانی کرنا چاہتی تھی۔

ہمیں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی کوئی انسان آرزو کر سکتا ہے۔ ہمیں وہ محبت بھی حاصل تھی جس کی تمنا میں لوگ گھل گھل کر مر جاتے ہیں لیکن اس محبت میں بھی خرابی کی اک صورت موجود تھی۔ اس محبت کو بھڑکانے کے لئے ہمیشہ اذیت کی دیا سلائی روشن کرنا پڑتی۔ سارا کے ٹھنڈے سنگِ مرمر جیسے جسم کو انگارے کی طرح دہکانے کے لئے مجھے ہمیشہ اسے ذہنی طور پر اپنے آپ سے کمتر ثابت کرنا پڑتا۔ اُسے ایسے دکھ عطا کرنے پڑتے جن پر وہ علیحدگی میں رو سکے جن کی بدولت وہ اپنے آپ پر ترس کھا سکے، اپنے آپکو بدنصیب سمجھ سکے۔ روئے بغیر وہ محبت کرنے کی اہل نہ تھی۔

یہی ہمارا اسلوبِ محبت تھا جسے میں نے مجبوری کے تحت اختیار کر لیا کیونکہ سارا تک پہنچنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔

میرا جی چاہتا کہ میں بازو بھر کر اسے اپنی گود میں بٹھالوں اور اس کی ہنسلی کی ہڈی پہ اپنا گال رکھ کر ہمیشہ کے لئے منجمد ہو جاؤں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہم دونوں پتھر کے زمانے میں پہنچ جائیں اور ڈائنا سور جیسے ناپید جانوروں کی طرح ہمارا شمار بھی ایسی نوعِ انسانی میں ہو جائے جس کا اب سراغ بھی نہیں ملتا۔ ہم دونوں دو سانگھی کی طرح جڑے ہوئے ناپید جانور ———

لیکن سارا سلور فوکس کی طرح بے قرار رہتی تھی۔ وہ کوکر سپنیل کی طرح ہمیشہ آبدیدہ اور خوفزدہ رہ کر خوش رہ سکتی تھی۔ وہ بغیر آنسوؤں کے محبت کا تصور ہی نہ رکھتی تھی۔

اسے اپنے قریب لانے اور قریب تر رکھنے کے لئے میں نے نقلی اذیت کا ایک ایسا باب کھول لیا، جس کے انجام سے میں خود بھی بے خبر تھا۔

"بتایئے کیا سوچ رہے ہیں آپ ——— آپ کے خیالات کے لئے ایک پینی"۔

اسے اپنے کندھے پہ رُلانے کے لئے میں اپنے سابقہ عشق کی کوئی من گھڑت داستان شروع کر دیتا۔ اس داستان کی حسینہ کے لئے مجھے ایسے ایسے الفاظ تلاش کرنے پڑتے، ایسی ایسی تشبیہیں، ایسے ایسے استعارے وضع کرنے پڑتے جن کو سن کر سارا کے کان جل اٹھتے۔ میں اس کے کان کی لو سے اپنے ہونٹ لگا کر کہتا:

"وہ وینس کے مجسمے کی طرح سڈول تھی۔ اگر اس کے کندھوں پہ چادر ڈال دی جاتی تو عرب عورتوں کی طرح یہ چادر صرف اس کے سینے اور سرین کو چھوتی اور باقی جسم کے کسی حصے کو نہ لگتی کیونکہ اس کا سینہ اور کولھے اس کے جسم سے بہت دور نکلے ہوئے تھے"۔

سارا دبلے پتلے جسم کی لڑکی تھی مجھے اس کا دبلا پتلا جسم پسند تھا لیکن یہ بات سن کر اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ دکھ کے ساتھ اپنے بازوؤں پہ ہاتھ مل کر کہتی:

"اس کے بعد ...... تو ...... اس کے بعد تو ..... آپ کو میں بہت بری لگتی ہوں۔ ہے نا ....."

میری جانب سے اب شدت کا اقرار ہوتا اور اس کی جانب سے شدت کا انکسار۔ اسی شدت سے محبت کی شمع جل اٹھتی اور ہم والہانہ طور پر ایک دوسرے کی جانب بڑھتے۔ وہ میری پچھلی محبتوں کو جلانے کے لئے رحم کی دیوی بن جاتی اور میں اس سے اٹل محبت قائم کرنے کے لئے پچھلی محبوباؤں کو جھلا بھلا کر اسے اپنے پاس لاتا۔

سارا کے آنسوؤں نے اس کی اذیت پسندی نے ہماری محبت کو الجھا دیا۔ وہ پہروں لیٹی رہتی نجانے ان لمحوں میں اس کی نظروں کے سامنے وہ بیلے ڈانسر قسم کی قد آور عورتیں گھومتی رہتیں جو مجھ سے عشق کر چکی تھیں

یا اپنی بدنصیبی اور محرومیوں پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ بہرکیف یہ ہیجانی دور ہم دونوں کے لئے عجیب دور تھا چونکہ سارا کو کوئی دُکھ نہ تھا اس لئے جب اس نے یہ دکھ ایجاد کیا تو اس میں تخیل کے گہرے سائے تھے۔

اپنے آپ پر ترس کھاتی سارا کا چہرہ مدقوق سا ہو چلا تھا۔ وہ یورپ میں رہنے کے باوجود کنوارے جسم اور کنوارے دل کی مالک تھی۔ اسے کھو بیٹھنے کے خوف نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ایک طرف میں اس کی محبت کو آکسی مار مار کر ابھارتا تھا اور دوسری جانب اسے لیٹا دیکھ کر مجھے اتنی کوفت ہوتی تھی کہ سارا سے مجھے بچے کی خواہش بھی باقی نہ رہی تھی۔ اسی تناؤ میں، اسی کھینچا کھینچی میں فیملی پلاننگ کے ہفتے مناتے ہوئے ہماری شادی کو چار ماہ گزر گئے۔ ہم کس قدر خطرناک کھیل کھیل رہے تھے اس کا ہمیں اندازہ نہ تھا

ایک روز میں کالا شاہ کاکو سے واپس لوٹا تو سارا قالین پر اوندھی لیٹی تھی۔ قریب ہی امریکی رسالے بکھرے تھے۔ میں نیکٹری کی دیکھ بھال سے تھکا ہوا تھا اور اسے اذیت دینے کے موڈ میں نہ تھا۔

میں نے فائلوں کو اس کے پاس رکھا اور اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔ اس نے جدید ترین فیشن کے تازہ تازہ بال سیٹ کروائے تھے اور اس سے نیم کے پتوں کی کسیلی کسیلی خوشبو آ رہی تھی۔

"تم رو رہی ہو سارا —— ؟"

"کچھ نہیں" اس نے چہرہ پونچھ کر کہا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے سارا —— ؟"

"کوئی تکلیف نہیں —— کوئی تکلیف نہیں ——" وہ انگریزی میں بولی۔ روتے چہرے پر مسکراہٹ نے دھوپ چھاؤں کا سا منظر پیدا کر دیا۔

"خوش تو ہوں ..... خوش تو ہوں لیکن ..... میرے ساتھ ..... کوئی اور بھی تو ہو اس گھر میں۔ میں سارا سارا دن ..... کھڑکی میں چیلوں کے گھونسلے نہیں دیکھ سکتی ..... مجھ سے تو وہی خوش نصیب ہے ..... انڈے تو سیتی بیچاری دھوپ میں بیٹھی رہتی ہے ....."

اس رات میں نے عجیب سا افسوس محسوس کیا۔ چیل کے گھونسلے کو تکتے رہنے کا دکھ! اسی احساس تلے پہلے میں نے سارا کو الیکٹرک کمبل میں لپیٹا۔ پھر اس کے ٹھنڈے پیر اپنے سینے سے لگا کر اسے

گلو کے متعلق بتایا۔ اس رات سارا کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ جھلملایا۔ وہ بت بنی گلو کا ذکر سنتی رہی اور پھر تکیے پر اوندھی لیٹ کر سو رہی۔ پہلی بار میری داستان کا ردِ عمل الٹ پڑا۔ اس پر وہ محبت کا شدید دورہ نہ پڑا جو ایسی باتیں سننے کے بعد اس پر پڑا کرتا۔ وہ ساری رات جب بھی جاگتی بند بندسی آہ بھرتی اور پھر تکیے میں منہ دے دیتی۔ پہلی بار جب میں نے اسے اپنا دکھ بیان کیا تو اس نے اس کا ردِ عمل قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وہ چار ماہ جب، سارا گھر بھروتی تھی ہماری زندگی کے بہترین دن تھے۔ ہم دونوں آسائش کے پالنے میں پوڈل کتوں کی طرح سیر چشمی کے ساتھ ایک دوسرے پر تھوتھنیاں جمائے پڑے رہتے۔ وہ سارا دن چھوٹے چھوٹے پالنے، ننھی ننھی فراکیں، ڈونلڈ ڈک قسم کی کڑھائی کے کمبل، چادریں، نیٹی ارگنڈی سے مڑھے ہوئے کریب پلاسٹک کے ٹب، فلالین کے پوتڑے اور رنگ برنگے کھلونے خریدنے اور اس بچے کا کمرہ سجانے میں مشغول رہتی جس کی آمد میں ابھی بہت دیر تھی۔ کٹے بالوں والی سارا زندگی میں پہلی بار اس قدر بامعنی اور بارونق زندگی بسر کر رہی تھی۔ بچے کے کمرے سے نکل کر وہ دن میں کئی بار وزن تولنے والی مشین پر چڑھ جاتی اور بار بار کہتی۔ "پچھلے ہفتے میرا وزن ایک سو دس پونڈ تھا پورا آدھا پونڈ وزن بڑھا ہے بے بی کا۔"

بچے کی کائنات میں کھو کر وہ میرے عشق کی من گھڑت داستانیں بھی بھول چکی تھی لیکن کبھی کبھی مجھے شک گزرتا کہ جب میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہوتا تو وہ آنکھوں کی جھری سے مجھے دیکھا کرتی ہے۔ ایسے جیسے جہاز میں سوار مسافر دور ہوتے ہوئے جزیرے کو دیکھا کرتے ہیں۔ ایک لمحے میں نے اسے پکڑ لیا ——

"تمہارے خیالات کے لئے ایک پینی ——"

"کچھ نہیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ تمہاری شیو بہت بڑھ گئی ہے —— تمہیں دن میں تین مرتبہ شیو کرنا چاہئے۔"

"بچے نہیں ہوگی تو میں تمہارے بے بی کو کبھی نہیں اٹھاؤں گا۔"

وہ بے بی کا واسطہ درمیان میں برداشت نہ کر سکی۔ آہستہ سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہنے

گی —— " پتہ نہیں گلو کی باتیں سن کر مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے میرا تمہیں چاہنا ایک FUTILE EFFORT ہے ——— میں ...... تمہاری زندگی میں ہمیشہ رنرز اپ رہوں گی —— ایسا گھوڑا جو فسٹ آنے والے گھوڑے کی گردن کے ساتھ پہنچتا ہے —— میں بڑی حاسد عورت ہوں —— میں نے زندگی میں آج تک کوئی چیز کسی کے ساتھ SHARE نہیں کی۔"

پھر اپنے خیالات کو کسی پر ظاہر کر کے اسے ندامت سی ہوئی۔ جھٹ انگریزی میں بولی:
"لیکن اب تو میرا بے بی ہوگا —— میں گلو کی کیا پروا کرتی ہوں۔ اپنا بے بی تو میں کسی کے ساتھ SHARE نہیں کروں گی..... کبھی نہیں..... کبھی نہیں۔"

دولت جو کچھ دے سکتی ہے وہ سب کچھ سارا کو میسر تھا۔ اس لئے وہ صرف میرے احساسات اور خیالات پر حکمرانی کرنا چاہتی تھی اور ماضی کے اتنے سارے قصوں کے ہوتے ہوئے یہ بات ناممکن تھی۔

میں سکتے میں آ گیا۔ اس سارا سے میں ناواقف تھا۔ وہ تو بڑی بے ضرر قسم کی بوجھ نہ اٹھا سکنے والی لڑکی تھی۔

ان دنوں میں سمجھ رہا تھا کہ ہماری شادی میں تخریب کا کوئی ٹائم بم چھپا ہوا نہیں ہے حالانکہ اندر ہی اندر فیوجی یامہ پہاڑ میں لاوا جمع ہو رہا تھا۔ شاید صورت حال مختلف ہوتی اگر ایک رات سارا کی طبیعت اچانک خراب نہ ہو جاتی۔

باہر بارش کے آثار تھے۔ سارا آتشدان کے پاس بیٹھی نرم اون کے ساتھ کبوتری سی ٹوپی بُن رہی تھی۔ پہلے وہ کروٹیں بدلتی رہی پھر نیم دراز ہو گئی اور جب اس سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو وہ لب کاٹنے اور مٹھیاں بھینچنے لگی۔

"کیسی طبیعت ہے سارا؟"

وہ خاموش رہی۔

"تم ٹھیک تو ہو سارا —— ؟"

وہ آنسوؤں سے بہت قریب تھی۔

"میں ڈاکٹر کو بلاؤں —— ؟"

میری باتوں کا جواب دیئے بغیر وہ چپ چاپ کمرے سے چلی گئی۔

جب میں تعاقب میں تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ درست کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پرس اٹھایا اور آہستہ سے کہا —— "کار نکالئے۔ مجھے ہسپتال جانا ہے۔"

اتنی سرخ لپ سٹک اور ایسی بھڑکیلی سرخی کے باوجود اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

"سارا —— !"

"جلدی چلئے۔ میں اور میرا بچہ —— ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے ہیں۔"

میں اسے بازوؤں میں لے کر بولا —— "اچھا ہے سارا —— تمہارے ہاں کبھی بچہ نہیں ہونا چاہئے..... کبھی نہیں..... کبھی ..... میں نہیں کسی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔"

اسقاط حمل کے دوسرے دن جب ابھی اس کا چہرہ ANESTHESIA کے اثرات تلے تھا۔ ہم دونوں ملاقاتیوں کے اوقات میں ملے۔ دونوں خاموش تھے۔

بڑی دیر یہ خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی: "آپ کو ڈاکٹر نے بتا دیا —— ؟"

"ہاں ——"

"پھر؟ ——"

"پھر کیا —— کچھ نہیں ——"

وہ آہستہ آہستہ رونے لگی —— "ڈاکٹر کم از کم دو چار دن ٹھہر کر مجھے بتا سکتا تھا..... پتہ نہیں تعلیم یافتہ لڑکی کو لوگ اس قدر پتھر دل کیوں سمجھتے ہیں..... یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شاید ..... وہ بھی ان پڑھ جاہل عورت کی طرح ADJUST ہونے کیلئے وقت چاہتی ہے ——"

"سارا ـــــ مجھے بچہ نہیں چاہئے ـــ امیر گھرانے میں بچہ ہمیشہ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے عجیب عجیب COMPLEXES چمٹ جاتے ہیں"۔

وہ خاموش ہو گئی۔

سپرٹ کی خوشبو سے بوجھل بڑا لمبا وقفہ طاری رہا۔ پھر وہ مسکرا کر بولی:

"آپ کو گلو یاد آ رہی ہے ناں ـــــ وہ صحت مند لڑکی تھی"۔

ہسپتال سے واپس آکر سارا کراچی چلی گئی۔ اس کی صحت اتنی گر چکی تھی کہ ڈاکٹروں کے مشورے کے پیش نظر میں مدافعت نہ کر سکا۔ سارا کے جانے کے قریباً دو ہفتے بعد مجھے اس کا خط ملا۔ ساتھ ہی اس کے وکیل کا خط بھی ملفوف تھا جس میں خلع کے جملہ کوائف اور شرائط لکھی ہوئی تھیں۔ سارا کے خط میں انگریزی میں مرقوم تھا:

"میں آزادی چاہتی ہوں۔ کسی بانجھ عورت کو کوئی حق نہیں کہ وہ ایک بار آور مرد کے ساتھ اپنی زندگی گزارے"۔

اس کے بعد میں نے مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔ وہ مجھ سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ وہ میرے خطوں کا جواب نہ دیتی تھی۔ صرف اس کا وکیل نہایت پابندی کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاتا تھا۔

طلاق وصول کرنے کے بعد مجھے جو خط سارا سے ملا اس میں لکھا تھا:

"آپ کے پاس گلو ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ بے بی کے وہ کپڑے جنہیں وہ پہن نہ سکا خدا جانتا ہے میں نے آپ کے سب AFFAIRS سُنے اور کبھی ایک دن بھی مجھے ان عورتوں پر رشک نہ آیا۔ الٹا میں نے ان پر ترس کھایا ـــــ لیکن گلو کے وجود کے ساتھ میں صلح نہیں کر سکتی۔ وہ اور میں ایک ہی گھر میں نہیں رہ سکتے ـــ اس کے ہوتے ہوئے میں ہمیشہ محروم رہوں گی"
سارا

پتہ نہیں کیسے من گھڑت افسانے اسے متاثر کرنے سے قاصر رہے اور ایک بالکل معمولی مگر سچا واقعہ ہم دونوں کے درمیان دیوار بن گیا۔ پتہ نہیں یہ عورت کی چھٹی حس تھی کہ میری بدنصیبی ـــــ بہرکیف

میری زندگی میں صرف ایک عورت آئی اور بانجھ ہو کر چلی گئی۔

یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں ایک بڑے ہوٹل میں مقیم تھا۔ بزنس جنگ کی وجہ سے کچھ معلق سی ہو چکی تھی۔ سارے شہر پر ایک جذبہ ایک ولولہ طاری تھا۔ اخبار اور ریڈیو کے علاوہ اور کسی چیز سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ میں سارا دن کمرے میں مقید رہتا اور سوچتا رہتا کہ کاش کوئی بم اس ہوٹل پہ گرے اور میں اس تنہائی سے چھٹکارا پالوں جو ہر لمحے مجھے شکنجے میں کستی رہتی ہے گیارہ ستمبر کو رات کے پچھلے پہر میرے فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے مدھم سی آواز میں کہا:

"کیا آپ کمرہ نمبر گیارہ میں آ سکتے ہیں۔"

"گیارہ ___!"

"جی ایک ایک اور دو گیارہ ___ والا گیارہ ___"

مجھے جرائم سے بھرپور وہ تمام فلمیں یاد آ گئیں جو میں ہمیشہ شوق سے دیکھتا ہوں۔ وہ جاسوسی ناول نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے جن میں قتل و غارت کا باب کھلا رہتا ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ جی میں سوچا زندگی کا تو ویسے ہی کچھ بھروسہ نہیں کم از کم مرنے سے پہلے ایک مہم سے مجھے بھی دوچار ہونا چاہیے۔

تین بار کمرے میں دستک دینے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ضرور کوئی قتل کا واقعہ ہو رہا ہے تو میں نے لوٹ جانے کے لئے قدم موڑے۔ لفٹ تک پہنچنے کے بعد خدا جانے کیوں میں نے لوٹ کر دوبارہ بغیر دستک دیئے میں نے یکدم دروازہ کھول دیا۔

اندر سارا ڈبل بیڈ پہ آڑے رُخ لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میری نبض تیز تر ہو گئی۔

"سارا ـــــ!"

"ہوں"

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں"۔

"میں نے تمہیں لفٹ سے اترتے دیکھا تھا ـــــ کل شام ـــــ" وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

کمرے میں اتنی ساری خوشبوؤں کے باوجود ڈیٹول کے نم کے چھینٹے تیر رہے تھے۔

"تمہاری نئی شادی کیسی رہی؟"

"۸۰ ___ ۶۰ ___" وہ آہستہ سے انگریزی میں بولی۔

"تمہارے میاں کہاں ہیں؟"

"سوئزرلینڈ گئے ہیں کسی بینک سے گفت و شنید کرنے ___"

"اچھا ___ پھر؟ ___"

"اگر جنگ نے کوئی مثبت صورت اختیار نہ کی اور ___ ہمارا اثاثہ پاکستان سے باہر بلا گیا تو اُن کی زندگی اجیرن ہو جائے گی"۔

"تم نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ میرا تو سب کچھ پاکستان میں ہے اور میں تو اپنا بینک بیلنس کہ تبدیل نہیں کرانا چاہتا"۔

اس کی نگاہوں میں بڑی شوخ سی دعوت تھی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے ___"

اس کے چہرے کو دیکھ کر .... ایک دبی سی سسکی میرے سینے میں اٹھی۔ میں اس پر جھک گیا اور اسے چھوئے بغیر بولا ___ "تمہیں معلوم ہے سارا کہ ..... نہ تم سے پہلے اور نہ تمہارے! ...... میری زندگی میں ..... سُنو میں نے کبھی کسی عورت کو چھُو کر نہیں دیکھا ___ اور تم جانتی اس کی وجہ کیا تھی؟"

"نہیں ___"

"جب دنیا کی ہر نعمت مجھے بلاقیمت مل گئی تو میں نے خود اپنے آپکو محروم کر لیا۔ کوئی انسان احسا محرومی کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ احساس خوشی سے زیادہ ضروری ہے۔ میں عورتوں کو خریدنا نہیں چ تھا ___ خریدی ہوئی عورت کے احساسات اور خیالات پر چھایا نہیں جا سکتا"۔

اس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔

"مجھے تمہارے سوا اور کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی بد قسمتی سے ___"

"اور گلو ....."

"وہ تو تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ زندگی کا اوّلین احساس تھی۔ اس نے مجھے صرف زندہ رہنے کا چلن سکھایا تھا"۔

وہ امریکن ایکٹرسوں کی طرح ٹانگوں کو بل دے کر بیٹھ گئی۔

"اگر ایک پینی ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں"۔

اس نے ہلکا سا سر ہلا دیا۔

"میرا ایمان اتنا مضبوط نہیں کہ دوسروں کے گھروں میں آگ لگانے سے اجتناب کر سکے۔ میں پروہت کے بنائے ہوئے قانون کا بھی ایسا احترام نہیں کرتا کہ ایک معمولی طلاق نامے کو اہمیت دے سکوں"۔

سارا کا سینہ احساسِ گناہ کی لذت سے تن گیا۔ مجھے وہ پہلی بار اتنی خوش نظر آئی۔

"کبھی کبھی تنہائی میں سوچتا تھا کہ اگر سارا مجھے ملی، اگر وہ کسی دوسرے کی بیوی بن کر مجھے ملی تو کیا اس کا جسم میرے لئے اجنبی ہو سکے گا۔ کیا میری نگاہیں کپڑوں کے آر پار نہ دیکھ سکیں گی۔ کیا ہماری نگاہیں اس خلوت کی غمازی نہ کریں گی جو ہم دونوں کے درمیان ایک بوسے کی طرح تھر رہی ہے"۔

سارا کانپنے لگی۔

"کیا ہم ایک دوسرے کے لئے کبھی بھی اجنبی ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے، نہیں پہچانتے .....!" وہ خاموش رہی ..... "میں نے صدیوں کی تنہائی کاٹی ہے اور تم نے سارا مجھے باعصمت ہونے کا کیا صلہ دیا۔ میں جانتا ہوں تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ تم احساسِ گناہ پیدا کرنا چاہتی ہو۔ جب تک تمہیں کوئی غم اندر ہی اندر زخمی نہ کرتا رہے تم خوش نہ رہ سکوگی"۔

اس نے نظریں جھکا لیں۔

"تم اور میں ..... اور ہمارے جیسے سب امیر آدمی ..... ہم من و سلویٰ کھاتے کھاتے تنگ آ چکے ہیں۔ ہمیں خوش رہنے کے لئے غم چاہئے لیکن یہ غم بھی ہمارا خود ساختہ ہونا چاہئے۔ اس پر ہمارے ذاتی کارخانے اپنے مل کی مُہر ہونی چاہئے ___ امیر آدمی SELF-PITY کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا

..... اتنی ساری آسائشیں، اتنی ساری راحتیں وہ کس کھاتے میں ڈالے ـــــ کیسے زندہ رہے ان کے ساتھ۔ لیکن تم اس مثبت زندگی کی نفی کرنا چاہتی ہو۔"

سارا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم پاکباز اور باحیا عورت ہو..... خوش رہنے کے لئے ایک دکھ پالنا چاہتی ہو..... احساسِ گناہ کا دکھ..... صرف اس کے ہوتے ہوئے تمہاری نعمتیں جائز ہو سکیں گی۔"

یکدم میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا ـــــ "اور میں تمہیں خوش نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ جو دکھ میں نے اپنے لئے وضع کیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ تم اپنا صحیح دکھ کبھی تلاش نہ کر سکو ـــــ تم بھٹکتی رہو غموں کی تلاش میں اور غم تم سے گریزاں رہیں ـــــ"

وہ دروازے کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی:

"مت جاؤ..... مجھے ڈر لگتا ہے ـــــ"

"مجھے جانے دو سارا ـــــ مجھے بھی جینے کا حق پہنچتا ہے ـــــ میں بھی تمہاری طرح امیر آدمی ہوں۔ مجھے بھی اپنا خود ساختہ دکھ چاہئے..... میں خود اپنے آپ کو محروم رکھ کر ـــــ بلاوجہ اپنے پر پابندی لگا کر خوش رہ سکتا ہوں۔ میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ یہی میرا خود ساختہ غم ہے۔"

اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔

"میں بھی دکھ کا پیراہن تو تا پالنا چاہتا ہوں۔ میں بھی احساسِ شکست اور احساسِ محرومی کی تلاش میں ہوں۔ میں بھی اپنے فرصت کے لمحوں میں اپنی خوشیوں کے بازو گود گود کر ان میں پچھتاوے کا سرمہ بھرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہوئے سوچا کروں ـــــ سب کچھ مجھ سے بالشت بھر دور تھا۔ میں ہاتھ بڑھاتا تو سب کچھ میری گرفت میں ہوتا۔ میں امیر آدمی ہونے کے باوجود باحیا اور باعصمت آدمی تھا..... کیسی دکھ کی بات..... تم مجھ سے میرا دکھ کیوں چھیننا چاہتی ہو ـــــ بھلا دکھ کے بغیر خوشی کا احساس کیونکر ہو۔ بھلا دکھ کے بغیر زندگی کا احساس کیونکر؟"

اپنی متروکہ بیوی کے عشق کو رومال والی جیب میں عین سینے کے اوپر رکھ کر میں باہر نکل آیا۔

اب مجھے موت کی خواہش نہ رہی۔ میں خوش تھا۔

وہ دیر تک مجھے گیلری میں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

پہلی بار اس کے چہرے پر آنسوؤں کے باوجود خوشی چھائی تھی ـــــ

وہ جینے کا قرینہ سیکھ چکی تھی ـــــ جس خود ساختہ غم کی اسے تلاش تھی وہ اس کے لمحوں پر اپنی مہر لگا چکا تھا!

پریم جل

اس شہر میں جابجا میرے آنسوؤں کی بارش سے مرغزار اُگ آئے ہیں۔ جہلم سے پنڈی کی طرف سفر کرتے ہوئے اونچے نیچے ٹیلوں میں بالکل ایسے ہی گپ چھپ کئی مرتبہ پتھریلی پہاڑیوں کی گود میں اُگے ہوئے کھیت نظر آتے ہیں۔ تمہاری دی ہوئی یادوں نے میرے رستے بستے دل کے شہر میں کئی جگہ سوئی گیس والوں کی طرح بڑی گہری کھدائی شروع کر رکھی ہے۔ کئی سڑکیں توڑ پھوڑ دی ہیں۔ کئی گھروں میں سیند لگا رکھی ہے اور ہر جگہ سوئی گیس والوں کی طرح ہمیشہ ایک ہی بورڈ نظر آتا ہے ——"معاف کیجئے گا —— ہم کھدائی کر رہے ہیں —— فاطمہ!"

گویا اس "ہم" میں غالب کی ساری انا بند ہے اور اس کھدائی کا احسان ہماری گردن پر نسل ہا نسل رہے گا —— فاطمہ! تمہاری یادوں کا کیا کروں؟ گھونسلے سے بوٹ اڑ کر کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں لیکن تمہارے عطا کردہ بوٹ تو صبح و شام خونِ جگر کا چوگا مانگتے ہیں۔ نہ بڑھتے ہیں نہ اڑتے ہیں۔ فقط گلابی پلاسٹک سا منہ کھولے ھل من مزید —— ھل من مزید۔ پکارتے چلے جاتے ہیں۔

نیو کیمپس میں سے گزرتی نہر کے ساتھ ساتھ شانت سڑک ہے جس کے دونوں طرف پوپلر کے سیدھے اور چکنے پتوں والے درخت اُگے ہیں۔

ہماری کار منٹگمری سے آ رہی ہے۔ ٹھوکر کے پاس وہ اسی سڑک کی جانب مڑ گئی ہے۔ شام

کی اداسی میں نیا چاند طلوع ہو رہا ہے۔ کوّے لمبی لمبی قطاروں میں پھیکے فیروزی رنگ کے آسمان پر گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ چڑیاں سونے سے پہلے ایک بار بلبلا کر درختوں میں شور مچا رہی ہیں۔ کار بہتی چلی جا رہی ہے۔ سامنے تم اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی ہو۔ تمہارا چہرہ کھلی کھڑکی کی طرف ہے تمہارے بال تیز ہوا میں سیٹ پہ، کندھوں پر ایک گرداب کی شکل میں بکھر رہے ہیں، سمٹ رہے ہیں تم نئے چاند کو دیکھ رہی ہو ـــــ چپ چاپ۔ تمہارا شوہر پوری نظر کے ساتھ سڑک کو دیکھ رہا ہے، کار کی وہیل پر اس کے بالوں سے بھرے ہوئے بازو ہیں اور ایکسیلریٹر پر اس کا پاؤں ہے۔ وہ جب چاہے اسے دبا کر کار کی رفتار تیز کر سکتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے گویا اس کا پاؤں تمہاری دونوں چھاتیوں کے درمیان عین وہاں پڑ رہا ہے جہاں تمہارا دل ہے۔ وہ ہلکا سا دباؤ ڈال کر تمہارے دل کی رفتار تیز کر سکتا ہے ـــــ لیکن وہ بہت محتاط ڈرائیور ہے ـــــ وہ اپنی کار، اپنی بیوی، اپنی نوکری، اپنے ملنے ملانے والوں پر کبھی بھی زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ـــــ تمہارا شوہر بھی چپ ہے لیکن اس کی چپ DEAD SEA سے مشابہ نہیں۔ اس میں ایک دھمکی ہے۔ ایک چیلنج ہے یہ ایک فاتح کی چپ ہے۔ ایسا فاتح جو اپنی خاموشی بھی کسی کے ساتھ بانٹنا نہیں جانتا۔

کار کی بتیاں جل اٹھی ہیں۔ نیا چاند دیکھ کر تم نے ایک بار بھی پلٹ کر اپنے شوہر کا چہرہ نہیں دیکھا۔ کوئی نامکمل نئی درانتی کی شکل کی آرزو تمہارے دل میں خون ہونے کو نہیں اٹھی۔

تم چپ ہو ـــــ اپنے شوہر کی وجہ سے ـــــ نئے چاند کی وجہ سے ـــــ اور میری وجہ سے۔ تم اس لئے چپ ہو کہ تم اپنے اندر کی عورت کو چپ کرا رہی ہو۔ تمہیں خوف ہے کہ کہیں وہ نئے چاند کے حضور ایک شوہر کے ہوتے ہوئے کوئی آرزو نہ کر بیٹھے۔

میں تم دونوں کے پیچھے کار میں بیٹھا ہوں۔ شام پوپلر کے درختوں کا رنگ میلا کئے دے رہی ہے لیکن ابھی تک میں نے اپنی دھوپ کے چشمے نہیں اتارے۔ میں بھی شیشے سے باہر دیکھ رہا ہوں اور ہر آنسو جو میری گال سے اتر کر، میری واش اینڈ ویئر پتلون سے پھسل کر پائیدان پر گرتا ہے، اس آنسو سے پلک جھپکنے میں ایک قد آدم پوپلر کا درخت اگ آتا ہے۔

نہر کنارے قطاروں میں دونوں طرف پوپلر کے درخت یونہی اُگ آئے ہیں۔ یہ فریاد کناں چپ چپ سے سیدھے سادے فریادی میرے آنسوؤں کی بارش سے ایستادہ ہوئے ہیں۔

تمہاری دونوں چھوٹی چھوٹی بچیاں ٹانگیں سیٹ پر رکھے سفر سے نڈھال چپ چاپ بیٹھی ہیں۔ بڑی بچی نے منہ میں انگوٹھا لے لیا ہے اور وہ مطمئن ہے کہ اس وقت ماں اس کی جانب پشت کئے بیٹھی ہے اور اس کے اس فعل پر اسے ٹوک نہیں سکتی۔

کاش مجھے بھی انگوٹھا چوسنے کی عادت ہوتی۔ پھر میں تمہاری سپاٹ گالوں والی بچی کی طرح اندھیروں میں، تنہائیوں میں اور گرمی شاموں کے وقت، گرمیوں کی ڈھلتی سہ پہر کے لمحے بڑی خوشی سے گزار سکتا۔

تمہیں یاد ہے فاطمہ! ایک بار تم نے کہا تھا:

"آپ مرد ہو کر اتنی جلدی رو کیوں پڑتے ہیں ؟"

یہ بہت سال اُدھر کی بات ہے ـــــ ابھی تمہاری قمیض کھلنی شروع نہ ہوئی تھی اور تمہارے جسم میں عورت پن نہ آیا تھا۔

"میں ہر کسی کی بات پر تو نہیں رو پڑتا ـــــ"

"میرا خیال ہے جب آپ بڑے ہو جائیں گے تو پھر ایسا نہیں ہوگا۔"

دیکھ لو پورے بارہ برس گزر گئے۔ ہر چیز میں فرق آ گیا۔ تمہارے کپڑوں کا ناپ بدل گیا۔ میری عینک کا نمبر وہ نہ رہا۔ لیکن تمہاری باتوں پر، تم سے متعلق باتوں پر ـــــ تم سے بچھڑنے والی باتوں پر اب بھی مجھے رونا آ جاتا ہے۔ میں جو اپنے باپ کی موت پر نہیں رویا۔ تمہارے تیور بدل جانے پر یوں بلبلا بلبلا کر تکئے میں ناک گھسیڑ گھسیڑ کر رویا کہ اب تک، نسبت روڈ کے چوک کا وہ درخت شاداب کھڑا ہے جس کی چھاؤں میں ہماری حویلی ہوا کرتی تھی اور جس حویلی میں یوں بے دھڑک میرے آنسوؤں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔

اسی نسبت روڈ والی حویلی کی تیسری منزل پر ایک چاند رات کو مجھے معلوم ہوا تھا کہ دنیا میں کتنا

اندھیرا ہے۔ اس سے پہلے میں بھی ہر مرد کی طرح یہ سمجھتا، جانتا اور محسوس کرتا تھا کہ دنیا کی ہر عورت صرف میرے لئے بنی ہے، میں اس کے جسم کے جس حصے پر ہاتھ رکھ دوں گا وہ انگ ہمیشہ ہمیشہ میرے لمس کے لئے ترستا تڑپتا رہے گا۔ تمہارے متعلق تو مجھے کبھی وہم بھی نہ ہوا تھا کہ تم میرے علاوہ کسی اور سے بھی محبت کرسکتی ہو؟

جب تم ہمارے گھر میں داخل ہوئیں تو سب تمہیں کانچ کے برتن کی طرح سنبھال سنبھال کر اٹھا بٹھا رہے تھے۔ گو میں کئی برسوں کے بعد تمہیں ملا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اب بھی تمہارے دل میں میری یادوں کے تھوہر اُگے ہوئے ہوں گے۔

"تم اپنی ٹانگوں پر چل نہیں سکتیں؟ ——" میں نے تم سے سوال کیا۔

"کاش چل سکتی ——" تم نے مختصر سا جواب دیا۔

بیمار ہو؟

"تین سال سے ——" تم نے میری جانب پشت کرلی۔

اور مجھے یوں لگا جیسے آٹھ کا ہندسہ خاموش پلنگ پر لیٹ گیا۔

"کیا بیماری ہے —؟"

"پتہ نہیں۔"

میں چپ ہوگیا۔ حالانکہ میرا سر ان گنت سوالوں سے بجنے لگا تھا۔

مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ تم اور تمہاری امی کراچی سے یہاں صرف علاج کے سلسلے میں آئی ہو۔ ایسا علاج جو تین سال سے جاری تھا۔ تم لوگ تیسری منزل میں ٹھہرے تاکہ کھلی اور تازہ ہوا کھڑکیوں سے آئے اور ایک بار پھر تمہارے گال سرخ و سپید ہوجائیں۔ میں گھر والوں کی جانب سے تم لوگوں کی خدمت پہ مامور ہوا۔

اس طرح میں تمہارے ایکسرے اتروانے میو ہسپتال ڈے اینڈ نائٹ کلینک آتا جاتا رہا۔ تمہارے بلڈ ٹسٹ کی رپورٹیں، ایکسرے کی پلیٹیں، تھوک، پیشاب کے ٹیسٹ اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔

اس علاج سے مایوس ہوکر تمہارے گھر والوں نے تمہارے لئے حکیموں کی طرف رجوع کیا۔ اب ان گنت معجونیں، مقوی غذائیں، سردائیاں اور کشتے بننے لگے۔ ہر چیز کے کھانے پینے سے پہلے گرم سرد کی بحثیں ہونے لگیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے ان تمام علاجوں سے بے پروا تم تیسری منزل پہ چارپائی ڈالے سرِشام ڈوبنے والے چاند کی طرح بے رنگ پڑی رہتی تھیں۔

"فاطمہ ——!"

"جی —— ؟" تم چھوٹے بڑے، ملازم، حاکم سب کو اسی طرح جواب دیتیں۔

"امی نے تمہارے لئے گرما بھیجا ہے۔"

"اس کی تاثیر گرم ہے کہ ٹھنڈی؟"

"پتہ نہیں ——"

تم نے یکدم قاش کو ٹرے میں واپس رکھ دیا۔

"یاد آگیا اس کی تاثیر ٹھنڈی ہے۔" ..... میں نے جھوٹ بولا۔

تم نے لمبی سی کمزور انگلیوں سے پھر گرمے کی لمبی سفید قاش پکڑی۔ اس وقت تمہاری امی اندر سے آگئیں۔ کیا چنچل صفت عورت تھیں تمہاری امی بھی۔ ایک وقت میں ان کے حلق سے ہمیشہ دو آوازیں نکلتی تھیں۔ مثبت اور منفی ساتھ ساتھ۔

"گرما کھلا رہے ہو اسے۔ مر جائے گی یہ ایک قاش کھانے کے بعد ——"

تم نے آرام سے قاش دوبارہ ٹرے میں رکھ دی۔

"بیٹا برا نہ ماننا۔" بھرائی ہوئی پتلی اور موٹی آواز نکلی۔ "اس کی تاثیر گرم ہے اور حکیم صاحب نے گرم چیزوں سے منع کیا ہے یکسر ——"

میرا دل رکھنے کو تمہاری امی بیٹھ کر گرما کھانے لگیں اور تم نے اپنا چہرہ پرے کر لیا۔

حکیموں کے بعد ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا علاج شروع ہوا۔ اب سمٹم کی باری آئی:

"کے بار ناک کھجلا —— کیا صبح پاؤں میں چیونٹیاں چلتی ہیں کہ شام کو —— نصف زیادہ

آتا ہے کہ کم ـــــ آنکھوں میں جلن رہتی ہے نہ کھجلی ؟ ـــــ"

کلکیریا فاس اور رلائی کو پوڈیم گھر آنے لگی ۔ تمہارے پاس بیٹھ کر کوئی بھی سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن جب تم کلی کر کے بڑی احتیاط سے ہومیو پیتھک پڑیا نگل کر کمرے میں آئیں تو میں سگریٹ پی رہا تھا۔ تم دروازے میں رک گئیں۔

"آیئے آیئے! میں نے سگریٹ بجھا دیا ہے ـــ آیئے ـــــ"

کمرے میں پھیلے ہوئے دھوئیں پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر تم کمرے میں داخل ہوئیں۔ عورت کبھی بھی خوبصورت نہیں ہوتی۔ ایک لمحہ خوبصورت ہوتا ہے کہ اس گھڑی آسمان پہ قوس قزح نکلتی ہے اور پھر ساری عمر مرد کے ذہن پر اس لمحے کی پینگ جھولتی رہتی ہے۔ تم تمام تر زرد لباس میں ملبوس تھیں۔ سر سے پاؤں تک ہسپانوی لیموں! سیاہ چپلی میں تمہارے لمبے لمبے دبلے پاؤں یہاں سے نظر آ رہے تھے۔

"فاطمہ!"

"جی ـــ!" تمہارا مخصوص اندازِ تخاطب۔ اس میں نہ استفسار تھا نہ ایجاب، نہ پسندیدگی کا اظہار نہ تجسس، عجب مُردہ قسم کی انفعالی کیفیت تھی۔

"تمہاری بیماری ہے کیا ـــــ؟"

"پتہ نہیں ـــــ"

"پھر بھی ـــــ کچھ تو پتہ ہوگا تمہیں۔ آخر تین سال سے بیمار ہو۔"

"یرقان ہوا تھا مجھے۔ تین سال ہوئے۔ جگر بگڑ گیا ہے۔ بھوک نہیں لگتی۔"

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔"

"ہو سکتا ہے ـــــ"

"تمہیں کسی کے اظہارِ محبت سے خوشی ہو سکتی ہے ـــ؟"

"ہو سکتی ہے ـــ"

میں اظہارِ محبت کے لئے اٹھنا چاہتا تھا، بولنا چاہتا تھا لیکن میری آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ اور میں اٹھ کر غسلخانے میں چلا گیا۔ باہر نکلا تو تم شہ نشین پر بیٹھی ہوئی اس اکلوتے درخت کو دیکھ رہی تھیں جو حویلی کے ساتھ ساتھ تیسری منزل تک اچانک میرے آنسوؤں کی وجہ سے اُگ آیا تھا۔

"یہ درخت یہاں پہلے تو نہ تھا ـــــ" تم نے سوال کیا۔

"نہیں ـــــ"

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"نہیں تو ـــــ"

"اتنا اونچا، لمبا چوڑا درخت ایک لمحے میں تو اُگ کر تیسری منزل تک نہیں آ سکتا۔"

میں تمہیں کیا بتاتا کہ جہاں کہیں مجھ جیسے بے بسوں کے آنسو گرتے ہیں وہاں اسی طرح چھتنار سے درخت خود بخود پلک جھپکتے میں اُگ آیا کرتے ہیں۔ ایسے درخت بڑے قد آور، خوبصورت اور شاندار ہوتے ہیں۔ ان میں پریم جل کی آبیاری سے کونپلیں نکلتی ہیں۔

"آپ بہت جلد رو پڑتے ہیں ـــــ"

"میں ؟ ـــــ ہاں ـــــ"

"مرد ہو کر ـــــ"

"ہاں مرد ہو کر ـــــ"

ہومیو پیتھک کے بعد دوا دارو سے تمہاری والدہ کا دل بھر گیا۔ اب گھر میں تعویز گنڈے ہونے لگے۔ بزرگوں کا چرچا رہنے لگا۔ کبھی قبروں کے طواف ہوتے کبھی مسجدوں میں گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ انہی دنوں میں تمہارے لئے موچی بازار سے ایک چاندی کی لمبی زنجیر اور چاندی ہی کا کتابچہ نما تعویز بنوا کر لایا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ بڑا اندھا اندھیرا تھا۔

لیکن تم رستے خدا معلوم کیسے راستہ تلاش کر کے نکل آئے تھے؟

"فاطمہ !"

"جی ___ !" وہی بے نیازی، وہی بے تعلقی، وہی جی حضوری کا اندازِ شکست۔

"تمہارا تعویذ آگیا ہے ___"

"تعویذ ___ ؟"

"یہ تعویذ میں میاں میر کے ایک بزرگ سے بنوا کر لایا ہوں ___"

"میاں میر سے ___ ؟"

"انشاءاللہ اس کے پہنتے ہی تم ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

تمہارے چہرے پر نا امیدی مسکراہٹ بن کر طلوع ہوئی۔

"تم کسی سے دل کی بات کہہ نہیں سکتیں فاطمہ ___ ؟" میں نے پوچھا۔

"کہہ سکتی ہوں"

"تو کہو نا !"

"پھر کبھی سہی ___"

"آج ہی ___ ابھی ___"

تم نے میرے اصرار کے جواب میں میری طرف پشت کر لی۔

گفتگو کا سلسلہ خود بخود رک گیا۔

مون سون ہوائیں ہمیشہ ایک خاص سمت کو اٹھتی ہیں۔ دریا ہمیشہ نشیب کی جانب اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں ___ تمہارا سیلاب جانے کس سمت کو رواں تھا؟

میں بہت دیر اصرار کرتا رہا لیکن پھر تم نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا۔

میں نے زندگی کے چھوٹے بڑے کُل چھ عشق کئے ہیں۔ یہ سارے عشق اپنی نوعیت کے اعتبار سے، اپنے کیمیکل ردِعمل کے اعتبار سے بالکل ایک سے تھے۔ ان کی ایک اٹھان تھی۔ بے اطمینانی کی فضا میں ان کا بیج پڑا تھا۔ اٹھتے ہی ان میں کم عمر بھرپور حسینہ کا سا پختہ پن آگیا تھا۔ پھر ایک اکتاہٹ

کی فضا، زیادہ میٹھا کھا لینے کی کیفیت۔ پھر جس طرح بے قراری کے اظہار میں عجلت برتی جاتی ہے اسی طرح اب قرار اور فرار کی تلاش جاری ہوتی۔ رفتہ رفتہ خود بخود فاصلے متعین ہو جاتے۔ کبھی ان کا نام حادثات رکھ دیا کبھی تقدیر کبھی بے وفائی۔ کچھ بھی راس نہ آیا اور کسی بات کا افسوس باقی نہ رہا۔ پرانے کوٹ میں جیسے فینائل کی گولی باقی رہ جائے، ایسے ہی یہ چھ عشق میرے پاس رہ گئے۔

فاطمہ کے ساتھ میرا عشق ہر تجزیے سے بالاتر تھا۔ اس کی ہر بات پر جیسے میرا وجود اس بوند کی مانند ٹھہرا ہوتا جو پتے کے آخری سرے پر ٹکی ہو۔ اس کی معمولی بے معنی باتیں میرے دل میں بڑے بڑے بھنور پیدا کر دیتیں۔ فاطمہ کو خوش دیکھنے اور خوش کرنے کی آرزو میرے ہر فعل پر حاوی ہو جاتی۔ میں اس سے اظہارِ عشق کرنے سے قاصر تھا۔ میری ساری مردمی اس کے حضور منفعل ہو جاتی۔ چھوٹی سی دبلی پتلی لڑکی جس کا نہ چہرہ خوبصورت تھا نہ جسم ___ ایسی لڑکی جو باہر کی بجائے ہر لحظہ اپنے اندر گزارتی تھی۔ اتنی بے ضرر الگ تھلگ مخلوق سے میں اس طرح مرعوب ہوا گویا سیاہ مفتوح سفید فام حاکم کے روبرو کھڑا ہو۔

یہ تمہارے کراچی روانہ ہونے سے دو دن پہلے کا ذکر ہے۔ بڑی دودھیا چاندنی چڑھی ہوئی تھی۔ چاندنی ہمیشہ کوٹھے پر بھلی لگتی ہے۔ خاص کر جب یہ تیسری منزل ہو اور اس تیسری منزل میں ایک فاطمہ رہتی ہو۔

تم پلنگ پر حسب عادت آنکھیں کھولے پڑی تھیں لیکن ان آنکھوں نے ارد گرد کچھ بھی نہ دیکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ تمہاری امی پاس بیٹھی ہوئی خربوزے کے بیج کھا رہی تھی اور تم دونوں میں ایک گھٹا گھٹا سا ایک رکا رکا سا مباحثہ چل رہا تھا۔

"میں کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔ آپ جانتی ہیں امی"۔

"تیرا تو دماغ الٹ گیا ہے بدبخت ___" دو آوازوں والی امی بولی۔

"آپ جانتی ہیں اور پھر بھی مجھے مجبور کر رہی ہیں"۔

"لیکن وہ تو پردیس جا بیٹھا ہے۔ اب اس سے امید ___ ؟"

تمہاری آواز میں ایسی سختی تھی گویا شیشہ کٹ رہا ہو۔

"وہ پردیس سے کبھی تو واپس آئے گا نا ——!"

"اور تب تک چاہے تو بوڑھی ہو جائے ——" باریک آواز نے یکدم بھاری آواز میں ڈوب کر کہا۔

"میری قسمت امی! آپ قسمت سے کیوں جھگڑتی ہیں۔"

"اب میں کب تک بیٹھی رہوں گی تیرے ابو کے دوستوں کے گھر مہمان بن کر۔ میرا تو خیال تھا کہ لاہور میں تیری طبیعت سنبھل جائے گی —— خدا جانے تو کس دن کا بدلہ لے رہی ہے ہم سے۔"

دو آوازوں والی امی خربوزے کے بیچ بوڑھی مرغی کی طرح ٹھونگتی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میرے لئے اس دن تمام دنیا کے راز کھلے۔ میں گردن گردن فاطمہ کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ اس گفتگو نے مجھ پر ایمونیا کا سا اثر کیا۔ بڑی مشکل سے میں فاطمہ کے پلنگ تک پہنچا۔ حسب معمول اس کے پلنگ پر سفید چادر بچھی تھی۔ ایک کمزور قسم کا بلب لیٹرین والے دروازے کے اوپر تام چینی کے سفید شیڈ میں جل رہا تھا۔ فاطمہ کے سرہانے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر ایک تھرموس ایک گلاس اور چند دوائیاں پڑی تھیں۔ سارے کمرے میں کدو گوشت اور لمبے چاولوں کی خوشبو تھی۔

"فاطمہ ——!" میں اکلوتی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

پہلی مرتبہ بڑی خوشی سے اس نے میرا استقبال کیا۔

"تم تین دن سے کہاں غائب تھے اقبال ——!"

اگر آج سے پہلے وہ ایسی دلچسپی میں یہی سوال پوچھتی تو میں غالباً جاں بحق ہو جاتا۔

"یہیں تھا ——"

"تمہارے ہاکی میچ ہو گئے ——"

"ہو گئے ——"

"کون جیتا —— تم یا اسلامیہ کالج —— ؟"

"ہم ——" میں نے آنسو روک کر کہا۔

"ہائے —— ہم تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے خدانخواستہ ہار کر آئے ہو ——" تم نے مسکرا کر کہا۔

"کچھ ایسا ہی ہے ——"

"مٹھائی کھلائیے۔ ایکٹنگ سے کام نہیں چلے گا حضرت!"

میں نے تمہیں کبھی ایسے موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔ تم دونوں کہنیاں پٹی پر جمائے ہاتھوں کے پیالے میں کنول سا چہرہ لئے بیٹھی تھیں۔ اور میں اس طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو سپرسونک سپیڈ کے ساتھ میری آنکھوں کی طرف امڈ رہا تھا۔ تم نے ان گنت باتیں کیں۔ شاید میں نے کچھ جواب بھی دیئے ہوں لیکن ان کی صحت کے متعلق مجھے علم نہیں۔ بڑی دیر کے بعد تم نے میرا کندھا چھو کر پوچھا:

"سو رہے ہو اقبال؟ ——"

"کون؟ —— میں؟ ——"

"اور کیا میں؟ ——"

اس وقت پتہ نہیں کیوں چھن سے میرے آنسو تمہارے لوٹتے ہاتھ پر گرے۔

"کیا ہوا —— ؟" تم نے پوچھا۔ "میں نے کچھ کہا ہے کیا؟ ——"

میں چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سنو اقبال —— میں نے کچھ کہا ہے ——"

آنسو تواتر سے میرے گالوں پر اتر رہے تھے اور تیسری منزل پر لہلہانے والے درخت کی جڑوں میں پریم جل پڑ رہا تھا۔ فاطمہ نے مجھے کئی آوازیں دیں لیکن میں چپ چاپ نیچے اتر گیا۔ وہاں سے میں نے اپنی سائیکل سیڑھیوں تلے سے نکالی اور نیو کیمپس کی طرف چلا گیا۔ اس نہر کنارے اُگے ہوئے درختوں کی پنیری میرے آنسوؤں نے اس دن لگائی تھی۔

اس کے بعد تم کو میں نے اپنی دانست میں زندگی سے نکال دیا جیسے کوئی سکہ رائج الوقت نہ رہا تھا۔

تم نے کراچی روانہ ہونے سے پہلے مجھے کئی پیغام بھجوائے لیکن میں نے ایک مرتبہ بھی تیسری منزل پر جانا پسند

نہ گیا۔ تمہارے رخصت ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے میں نے تمہارے نام یہ خط لکھ کر کراچی کے ایڈریس پر پوسٹ کر دیا۔

فاطمہ!

اگر پردیس سے آنے والا نہ لوٹتے تو لاہور ضرور آتا۔ پھر میں تمہیں اپنے آنسوؤں کی وجہ بتاؤں گا۔

ــــــ اقبال!

اس خط میں اقرارِ محبت نہ تھا لیکن اس سہ حرفی رقعے کو لکھنے کے بعد میں عُمر بازی جیت گیا۔ ایک تو میں اپنے خیال میں اس دلدل سے نکل گیا جس میں ایک مدت اور چلنے مرنے کی مجھ میں سکت نہ تھی۔ دوسرے میں نے گویا آئندہ کیلئے اپنے دل پر ایک پرچھتی ڈال لی۔ میرا خیال تھا کہ اب چاہے کیسی ہی مینہ کنی کیوں نہ برسے میرا دل فاطمہ کی محبت سے محفوظ رہے گا۔ گو بایہ بھی سراسر میری انا کی غلط ترکیبِ نحوی تھی۔ اس ایک خط نے فاطمہ کے ہاتھ میں وہ چابک پکڑا دی جسے اس نے کئی مرتبہ میری انا کی ننگی پیٹھ پر پے درپے مارا۔ اگر میں یہ خط نہ لکھتا تو شاید فاطمہ بہت کچھ جاننے کے باوجود میرے خلاف کوئی ثبوت استعمال نہ کر سکتی۔

کراچی جانے کے کچھ عرصے بعد فاطمہ کی شادی ہو گئی۔

میں نے سنا اس کا دولہا امریکہ سے آیا ہے، انجینئر ہے، لمبا اونچا ہے۔ اس کے سگے اونچی سوسائٹی کے آدمی ہیں اور وہی چٹی گوری فاطمہ کا من چاہا پردیسی ہے۔ میں نے جشنِ ماردشن دلِ ماتا قسم کی بیٹیاں بجائیں۔ ایک بھوکا سا تحفہ فاطمہ کو بھیجا اور اپنے تپتے عشق کی کلغی جمادی۔

اس کے بعد پورے پانچ سال گزر گئے۔ مجھ پر فاطمہ کے عشق نے کسی قسم کے AFTER AFFECTS نہ چھوڑے تھے۔ میں دوسری لڑکیوں میں دلچسپی لینے کے قابل تھا۔ مجھے جنسِ مخالف کے پنڈے، خاص کر ان کے کولہے اور ہاتھ بہت جلد متوجہ کر لیتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میرے لہو میں کہیں بھی فاطمہ کے عشق کے جراثیم باقی نہیں رہے۔

لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی جب بھی شادی کا ذکر آ جاتا تو میں محسوس کرتا ابھی تک کہیں اندر، میری گردن میں گتے کا پٹہ پڑا ہے۔ شادی کے معاملے میں میری ہر کیبں لگی ہوئی تھیں۔ میں ہر لڑکی کو ایک بار فاطمہ کے چوکھٹے میں لگا کر دیکھتا اور پھر اَن جانے میں چوکھٹہ اور لڑکی دونوں کو دل کی کھڑکی سے باہر نکال پھینکتا۔

پورے پانچ سال بعد میری ملاقات فاطمہ کے شوہر سے ایک بڑے فیشن ایبل ہوٹل میں ہوئی۔ لُو والی گرمیاں آ چکی تھیں۔ خوبصورت نیلے پانیوں والے سوئمنگ ٹینک میں سفید فام پردیسی اور فیشن ایبل پاکستانی تیر رہے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکیاں جو سوئمنگ نہ جانتی تھیں پانیوں میں کنڈے رگاتی پھر رہی تھیں۔ بیرے کوکاکولا، بیئر اور وسکی چھوٹے چھوٹے طشتوں میں لگائے، پیروں میں فلیٹ پہنے راج ہنسوں کی طرح پھر رہے تھے۔

مجھے اور میرے دوست ریاض کو اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ایک بنگالی دوست کی کھیم کسل معلوم کرنا تھی لیکن اس وقت وہ ہوٹل میں موجود نہ تھا۔ ہم کافی تخل خواری کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اسلئے تھوڑی دیر ہم بنگالی کی راہ دیکھنے کو وہیں سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ گئے۔ شام اس ہوٹل میں منہ کالا کرنے کو پھر رہی تھی لیکن اب بھی ہوا میں بڑی جم کے گرمی تھی۔ ہاں نہانے والوں نے دلوں میں عجیب قسم کی خنکی کا احساس پیدا کر رکھا تھا۔ لڑکیاں جب اوپر سیڑھیاں چڑھ کر لمبے ہاتھ پھیلا کر مچھلی سا پانی میں اترتیں تو تھوڑی دیر کے لئے پانی کا نیلا کرتا اچھلا چھل لہروں سے بھر جاتا۔ پھر لمبی ڈبکی کھا کر لڑکی کا چہرہ نکلتا۔ نیلی نیلی آنکھیں پانی سے بھیگی ہوئی، سنہری بال لٹ در لٹ کندھوں سے چپٹے ہوئے ان سلفے کی لاٹوں کو دیکھ دیکھ کر دل میں سردائی کی سی ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا کہ انجم الفقیہ کب ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ٹھاک بھائی ــــ؟" انجم نے ریاض کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بالکل ــــ تم سناؤ۔" ریاض نے سوال کا جواب مختصر کیا۔

"بچے بابی ٹھیک ٹھاک ــــ"

"اللہ کا شکر ہے"

اس کے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور فاطمہ کا شوہر، جو شکلاً امریکی ایکٹر، وضع قطع سے اودھ کا دل پھوڑ نواب، عادات سے پنجے چھپانے والا بلّا اور گفتگو سے پورنو گرافی سے لاکھوں کمانے والا نظر آتا تھا، عین میرے سامنے آ بیٹھا۔

اس نے بیٹھنے سے پہلے نیلے پانیوں پر نظر ڈالی اور پھر تعارف سے پہلے دو بڑے لشتم پشتم قسم کے جنسی لطیفے سنا ڈالے۔

فرخ سے میری ملاقات ایک سلسلے وار پروگرام ثابت ہوئی۔ وہ اور میں ایکدوسرے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس سکتے تھے۔ اس کے ساتھ زیادہ وقت جنس کے زعفران زار میں گزرتا۔ اسے جملے پلٹ کر بات کو جنسی رنگ دینا خوب آتا تھا۔ کئی بار فرخ نے مجھے گھر لے جانا چاہا لیکن ان دنوں میں نے یہ تھیوری بنا رکھی تھی کہ جو دوستیاں گھروں کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہیں وہ رشتہ داری کا روپ دھار لیتی ہیں اور دوستی کے رنگ میں بھنگ واقع ہوتا ہے۔

بالآخر ایک دن وہ دس سیر خربوزوں کے ساتھ لاد کر مجھے بھی گھر لے ہی گیا۔

ایک پتلی دبلی عورت جس نے میل خوری ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پورچ سے ملحق برآمدے میں پیروں کے بل بیٹھ کر گیٹ کی جانب پیٹھ کئے ایک ننھی سی بچی کو بوٹ پہنا رہی تھی۔ یہ بچی بار بار اس عورت کی مٹھی لیتی اور پھر کان میں کچھ کہہ کر ہنسنے لگتی تھی۔

کار پورچ میں کھڑی ہوئی۔ فرخ نے لمبا سا ہارن بجایا۔ میل خوری نے پلٹ کر کار کی جانب نہ دیکھا۔

فرخ نے ہنس کر اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور اندر کی جانب سر کر کے مجھے بتایا:

"ماں کی خصم کو پتہ لگ گیا ہے لیکن پلٹ کر دیکھے گی کبھی نہیں ـــــ"

جب میں اور فرخ بازوؤں میں گول گول خربوزے اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر پورچ سے ملحق برآمدے میں پہنچے تو اس میل خوری عورت نے پلٹ کر دیکھا۔

میں نے زیر لب آہستہ سے کہا ـــــ "میں نہ کہتا تھا دوستوں کے گھر نہیں جانا چاہئے:"

"کیوں ـــ؟"

"اس لئے کہ شاید بھابی کو میرا آنا ناگوار گزرا ہو:"

"نہیں نہیں۔ یہ سالی اسی طرح رہتی ہے۔ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے"

فاطمہ نے اب بچی کو گود میں اٹھا لیا تھا اور بچی کا چہرہ ایک دوسرے کے سانچے لہو کی غمازی کر رہا تھا۔

"یہ اقبال ہے ـــ جس کا میں ذکر کیا کرتا تھا ہمیشہ!"

"ان سے تو ہماری دور کی رشتہ داری بھی ہے شاید ـــــ" فاطمہ نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اچھا ـــ!"

"آیئے ـــ"

وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کا چنبیلی جیسا رنگ اب ایسے ہو گیا تھا جیسے چینی کے برتن کو مسلسل دھوئیں میں رکھا گیا ہو۔ چہرے پر میک اپ کی ہلکی سی جھلّی چڑھی تھی جس کے باعث اور بھی رنگت سرخی مائل نظر آ رہی تھی۔

فرخ آتشدان، تپائیوں پر، کرسیوں پر جہاں تہاں جگہ مل رہی تھی، ڈکی میں سے خربوزے لا لا کر رکھ رہا تھا۔

"یہ جب بھی پھل لاتے ہیں اسی طرح لاتے ہیں۔" فاطمہ نے بڑے ترکھے لہجے میں کہا جیسے وہ اسے فضول خرچی یا کسی نوعیت کی بے رحمی تصور کر رہی ہو۔

خربوزے لانے اور دھرنے کے دوران وہ حسب عادت ایک لطیفہ سنائے جا رہا تھا۔

"یار اقبال۔ ایک مرتبہ میری طرح ایک اور شوہر اپنے دوست کو بے وقت گھر لے گیا۔ یہ وقت تھا عاشق کی وزٹ کا۔ اب جس وقت شوہر اپنے بیڈ روم میں گیا تو دیکھا کہ بیوی لیٹی ہے چاروں شانے چت اور پاس وہ گھگو عاشق موجود ہے ـــــ"

فاطمہ نے لب کاٹے اور بچی کا ربن ٹھیک کرنے لگی۔

"شوہر واپس آکر بے تکلف دوست سے مخاطب ہوا۔ "بھائی۔ اندر تو بیوی کا عاشق موجود ہے۔ آؤ ہم باورچی خانے میں جاکر چائے بنائیں۔"

دوست عجب سٹپٹایا ہوا ساتھ چلا اور جب شوہر نے پانی کی کیتلی سٹوو پہ رکھی تو اس نے پوچھا ____ "اور وہ ____ وہ جو اندر ہے وہ ......"

شوہر نے دوست کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: "حرام زادے کو اپنی چائے خود بنانے دو۔"

اب یہی لطیفہ کہیں میں شہر میں سنتا تو اور بات ہوتی لیکن اس وقت میں عجیب بانگڑو پن سا محسوس کر رہا تھا۔ فاطمہ یوں کھڑی تھی جیسے اسے شدید قسم کا اسکال آرہا ہو۔ فرخ کچھ دیر مجھے داد طلب نظروں سے دیکھتا رہا اور ہنستا رہا۔ پھر وہ خربوزوں کے کھیپ میں مشغول ہوگیا۔

شام کو فرخ جس وقت نہانے کے لئے چلا گیا اور ٹھنڈے جھٹ پٹے میں کوئلوں کی کوک مدھم پڑی۔ فاطمہ اپنا باغ مجھے دکھانے کیلئے چھتنارے درختوں تلے لے گئی۔

اگر اس روز میں بھاگ جاتا۔

اپنی ٹرانسفر کرا لیتا۔

پھر کبھی فرخ کے گھر نہ جاتا۔

اگر اس روز میں اس فاصلے کا تعین کر لیتا جو مجھے اپنے اور فاطمہ کے درمیان قائم رکھنا چاہئے تھا تو میری زندگی بالکل مختلف ہوتی۔ وہ اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ساتھ کچھ قدم مجھ سے آگے آم کے گھنے درختوں تلے چلی جا رہی تھی۔ اس کی کمر کا وہ حصہ جو بلاؤز میں چھپا ہوا نہ تھا اب بھی گائے کے دودھ کی مانند تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کا ننگا ننگا نشیب ہر مرتبہ ساڑھی اٹھنے پر نظر آتا۔ تھوڑی سی ادھ کھلی ایڑی جوڑے کے نیچے گردن پر آئے ہوئے بھربھرے سے بال، آدھی آستینوں میں آگے پیچھے جھولتے چوڑیوں سے لدے ہوئے بازو ____ وہ مجھ سے چند قدم آگے تھی۔ اس کی بچیاں مکمل طور پر طوطیاں تھیں وہ مسلسل کچے آم کھائے جا رہی تھیں اور بولے جا رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی کیریوں جیسی کچی کچی باتیں!

آج تک میں نے جتنے عشق کئے تھے ان میں یا تو میں بالآخر بوجھ بنا۔ یا جس سے میں نے محبت کی، وہ شخص میرے سینے کی سل ثابت ہوا۔ فاطمہ کا عشق تو کہساروں میں چھپی ہوئی بازگشت تھی جو ٹکرائے جاتی ہے اور واپس آئے جاتی ہے جس کے تحیّر سے انسان کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ یہ عشق شبنم کی وہ بوند تھی جس کا کسی پتی پر کبھی بوجھ نہیں ہوتا۔

فاطمہ شادی شدہ تھی۔ وہ اگر قاتلہ ہوتی، اگر وہ کسی سمگلنگ کرنے والے گروہ سے منسلک ہوتی۔ اگر اس کے سو عاشق ہوتے۔ اگر وہ بھنگ پلا کر، چرس کا سگریٹ بیچ کر، مارفیا کے ٹیکے لگا کر روزی کمانے والی ہوتی۔ تو پھر بھی سب کچھ ٹھیک تھا ____ فاطمہ کی ہر ناٹھیک میرے لئے ٹھیک تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ عورتیں جوئے باز، زن فروش، شرابیوں سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ اب میں جانتا تھا کہ لوگ طوائفوں کی خاطر زہر کیوں کھا لیتے ہیں۔

اب مجھے پتہ چل گیا تھا کہ فاطمہ کی ہر ناٹھیک میرے لئے ٹھیک تھی۔

شام میں دوپہر کی بہت کچھ گرمی باقی تھی۔ ہم اس رہٹ تک پہنچے جہاں اس وقت بیل تو نہ جتے تھے لیکن چربچہ میں شفاف پانی جمع تھا۔

"ممی۔ ہم نہالیں۔"

کئی بار بچیوں کے اصرار اور میری سفارش کے بعد فاطمہ نے بچیوں کے بوٹ اور فراک اتار دیئے اور وہ دونوں چربچہ میں اتر گئیں۔ چھتنارے درخت تھے، پرانے ٹھنڈے کنوئیں کی منڈیر پہ بیٹھ کر پہلی بار فاطمہ نے میری جانب دیکھا۔

یہ لمحہ بھاگ جانے کا تھا۔

یہ لمحہ ہجرت کرنے کا تھا۔

آزادی کا آسمان کھلا تھا اور میرے پر کافی مضبوط تھے، لیکن ____ "آپ کا خط مجھے مل گیا تھا ____"

"اچھا ____؟"

"آپ کی شادی کیوں نہیں ہوئی ابھی تک؟ ——"

یہ استفسار غالباً اس وقت ایجاد ہوا ہو گا جب پہلے پہل مرد اور عورت نے شادی کی رسم ایجاد کی ہو گی۔ یہ سوال لاکھوں نے سابقین سے پوچھا ہو گا لیکن میرے اندر گویا پانی کا ٹیوب ویل یکدم چل اٹھا اور جواب ان پانیوں میں چھید دار کشتی کی طرح ڈوب گیا۔

"بتایئے نا! کیوں نہیں شادی کی آپ نے؟ ——"

"بس۔ کوئی لڑکی نہیں ملی"۔

"ایک بھی نہیں ——؟"

"ایک بھی نہیں ——"

"وجہ؟"

"پتا نہیں ——"

"کیا چاہتے ہیں آپ لڑکی میں ——"

مجھے اس کا سیدھا سادا جواب بھی آتا تھا لیکن اس لمحے میں اٹھا اور آم کے درخت کی اوٹ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

برسوں کے ٹھہرے ہوئے منجمد آنسو جاری ہو گئے —— کیا چاہتا تھا میں ایک لڑکی سے؟

مجھے یوں لگا جیسے فاطمہ کے باغ میں، جو میری آمد سے پہلے بنجر پھٹی ہوئی زمین تھی، یکدم وہاں میرے آنسوؤں سے بڑے بڑے گھنے درخت اگ آئے —— ان درختوں کی ڈالیوں سے میرے آنسو یوں اترنے لگے جیسے برسات کے بعد آدھی رات کو بارش کے قطرے پتوں سے پھسل پھسل کر زمین پر اترا کرتے ہیں۔ آنسوؤں جل سے فاطمہ کا باغ لہلہا اٹھا۔ وہ میرے پاس آئی اور اس نے آتے ہی اپنا گرم گرم ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ پہلے ہی نائیلون کی قمیض نے جسم کی حدت کو اندر سمیٹ رکھا تھا۔ اب اس کا ہاتھ ماچس کی طرح لگا۔ مجھے خیال آیا میں بھک سے اڑ جاؤں گا۔

"اب تک روتے ہیں آپ"۔

میں نے منہ پرے کر لیا۔

"میں نے زندگی میں —— آپ کے سوا کسی مرد کو روتے نہیں دیکھا"۔

اس کے حضور مجھے ایک لمحے کے لئے احساس نہ ہوا کہ یہ آنسو مردانگی کی توہین ہیں۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ آیا وہ کیا سمجھے گی۔ نہ جانے کس وقت، کہیں آگے چل کر وہ ان آنسوؤں کا فائدہ ہی نہ اٹھانے لگے۔

اس کا ہاتھ اب بھی میرے کندھے پر تھا۔

"میں آپ کے لئے لڑکی تلاش کروں گی..... اپنی پسند کی!"

"ضرور کیجئے —— ضرور —— بلکہ جتنی جلدی ہو سکے تلاش کیجئے"۔

جب ہم دونوں گھر واپس لوٹے تو فرخ سفید پینٹ قمیض میں ٹونی کرٹس بنا لان میں بیٹھا خربوزے کھا رہا تھا۔ فاطمہ دوپہر کو کھانے پر، شام کی چائے پر اور باغ کو روانہ ہونے تک بالکل قطرے گوندکی طرح ٹھنڈی تھی لیکن اب وہ بے تحاشا خوش نظر آ رہی تھی —— گویا کوئی پہلوان کھڑی ملی جیت کر آ گیا ہو ——

"فرخ ان کے لئے —— اقبال صاحب کے لئے تمہاری پھوپھی کی لڑکی کیسی رہے گی؟"

"کون سی لڑکی..... تیرے میری اصلی اور منہ بولی بارہ پھوپھیاں ہیں۔ ان کے بیٹیاں بھی تھوک کے حساب سے بھیجی ہیں اللہ میاں نے"۔

"فیروزہ ——"

"نہ نہ نہ ——"

"کیوں؟ ——"

"اس کا دہن بہت چھوٹا ہے"۔

"چھوٹا دہن تو خوبصورتی ہے"۔

"چھوٹے دہن والیاں کنجوس ہوتی ہیں"۔ فرخ نے مجھے آنکھ ماری۔

اس سے پہلے وہ مجھے چھوٹے دہن والی ایک لڑکی کا بڑا ہی تلذذ بھرا جنسی لطیفہ سنا چکا تھا۔

اب ایک عجیب قسم کا سلسلہ شروع ہوا۔ فاطمہ نے مجھے چھتری کی طرح بغل میں داب کر جگہ جگہ گھمانا شروع کر دیا۔ وہ مختلف گھروں میں داخل ہوتی۔ چھتری کھولتی۔ سب کو دکھاتی اور پھر خود اسکی چھاؤں میں بیٹھ کر، واپس بغل میں داب کر واپس گھر آجاتی۔

جو لڑکی مجھے ذرا سی پسند آجاتی فاطمہ فٹ اس کا پتہ کاٹ دیتی۔ جو لڑکی مجھے دل سے ناپسند ہوتی فاطمہ اس کی تعریف میں کوسوں کا سفر کرتی۔ ایسی دوڑ دھوپ میں وہ ہمیشہ میری کار میں میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ جاتی۔ فرخ ہمیشہ ہمیں کوئی جنسی خیالات سنا کر خدا حافظ کہتا۔ میں نے عموماً نوٹ کیا کہ فاطمہ اس کے سامنے اس کے لطیفے پر کبھی مسکرائی تک نہ تھی۔ بلکہ فرخ نے مجھے علیٰحدگی میں کہہ رکھا تھا ۔۔۔ "یہ وہابی خیالات کی عورت ہے۔ مجھے کئی کئی گھنٹے لیکچر دیتی ہے کہ میں یہ بے ہودہ گوئی چھوڑ دوں لیکن یار! شراب میں نہیں پیتا۔ عورتوں کا مجھے شوق نہیں۔ جوا میں نہیں کھیلتا۔ اب میں اکھ مٹکا نہیں لگا سکتا تو کیا ہوا۔ ایسے لطیفوں میں جو لذت ہے اس سے بھی محروم ہو جاؤں ۔۔۔؟"

یہ لطیفے جو ہم جانے سے پہلے سنا کرتے، گویا ہوا میں ایک بگوفلم کی طرح چلتے رہتے۔ پھر ہم ایک لڑکی دیکھتے، اسے ناپسند کرتے اور لوٹ آتے۔

یہ منٹگمری کے سفر کا ذکر ہے۔ اس بار فرخ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم سول لائن میں رہنے والے ڈویژنل فارسٹ آفیسر کی بیٹی کو دیکھنے گئے تھے۔

بیٹی کو دیکھ کر سب سے پہلے فرخ دنگ ہوا۔

پھر فاطمہ سٹپٹائی۔

پھر میں ہری چگ ہو گیا۔

فارسٹ آفیسر کی دھان لڑکی بڑی ہی ڈاکا ڈالنے والی تھی۔ پہلے دن تو وہ چپ چپ، دوپٹے میں انگ چھپائے، پپوٹوں میں آنکھیں لپیٹے، ہونٹوں میں دانت چھپائے اللہ میاں کی گلے بنی رہی لیکن دوسرے دن جب فرخ کھانے کی میز پر بیٹھا ٹوسٹ پر جیم لگا رہا تھا۔ اور وہ توتی ہماری جانب پشت کئے بجلی کے ٹوسٹر پر ڈبل روٹی کے ٹکڑے سینک رہی تھی۔ فرخ اپنے مخصوص لطیفوں میں گمن ہو گیا۔ بہت بار فاطمہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ اپنے پاؤں سے اس کے جوتے کو ٹھکورا، پر فرخ جب اپنی چبڑ چبڑ شروع کر دیتا تو پھر اس کے اپنے ہاتھوں میں کوئی بریک نہ رہتی تھی۔ جتنی دیر وہ لطیفہ سناتا رہا سلیمہ کی پشت ٹوبنے جیسے کولھوں پر ٹکی ہنستی رہی لطیفے سلسلہ وار ثابت ہو رہے تھے۔ بالآخر جب فرخ کہہ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ "ایک تھا بچہ اپنی منی عمر کا۔ اس کی ماں تھی ہماری فاطمہ جیسی۔ اس کا شوہر گو دل میں بہت قدر دان تھا لیکن منہ سے کبھی اعتراف نہ کرتا تھا۔" ۔ ۔ ۔

تو اس تتلے دانی نے منہ کھولا اور بولی: "ہائے کاش وہ بڑبڑاتا خواب میں۔ فلموں میں تو بڑبڑانے والے شوہر ساری غلط فہمیاں دور کر دیا کرتے ہیں:

بٹے ترنگ میں فرخ نے قہقہہ لگایا۔ لیکن فاطمہ خاموش رہی۔ اس کے بعد گویا پہلا جھانکا ختم ہو گیا۔ وہ ہم سے خائف نہ رہی اور ہم یہ بھول گئے کہ ہم دراصل اسے پاس کرنے آئے ہیں۔ فاطمہ تو شاید اسی روز رخصت ہو جاتی لیکن ہوا یہ کہ فرخ بسیار نوشی کی وجہ سے بری طرح پیچش کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔

اب ہمیں مجبوراً یہاں قیام کرنا پڑا۔ وہ ہنس مکھ کبھی شربت لاتی کبھی چائے۔ باتیں اس قدر تیزی سے، اتنی ان گنت کرتی کہ رینی بلبل بھی گھبرا جائے۔ ایک روز کچھ کاڑھے ہوئے میز پوش اٹھائے ہمارے کمرے میں لائی اور فرخ سے بولی:

"بھائی جان پلیز! آج جب امی آپ کو میرے یہ کپڑے دکھائیں تو میری تعریف کر دیجئے گا۔ آج ان کا یہ پلان ہے"۔

"کچھ پیسے لگیں گے۔" فرخ بولا۔

"میں دیدوں گی آپکو ۔۔۔ پلیز۔"

"تعریف کیوں کرنی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"امی کہیں گی یہ میں نے کاڑھے ہوئے ہیں۔ وہ آپ پر اچھا امپریشن ڈالنا چاہتی ہیں۔ پلیز جی۔ آپ بھی تعریف کر دینا۔ اپنے سگریٹ نہ پیتے رہنا روز کی طرح ۔۔۔۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر

مخاطب ہوئی۔

فاطمہ نے اسے کنکھیوں سے دیکھا تو وہ چپ چاپ کپڑے اٹھا کر لے گئی۔

سلیمہ جسے فرخ اب پیار سے لچھو باندری کہنے لگا تھا ہم دونوں سے ایسے گھل مل گئی تھی جیسے ہماری چھوٹی بہن ہو۔ پہلے زور سے قہقہہ لگاتی پھر ضرور کہتی ـــــ "ہائے میں مرگئی۔ امی جان سے مار دیں گی۔ مجھے تو آپ کے ساتھ تن پہن کر رہنا چاہئے"۔

یہ ہماری رخصت سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ فرخ سلیمہ کے حق میں بک چکا تھا۔ میں جو عشق کے میدان کا بڑا اجدھا تھا، اب جوکھو جوکھو کر قدم دھر رہا تھا۔ فاطمہ خضاب لگی نائیکہ کی طرح یکدم ٹس سے مس نہ ہونے والی شکل لئے پھرتی رہی۔

میں سلیمہ کے عشق میں گرفتار نہ ہوا تھا۔

مجھ پیاسے گھوڑے کو تو خود پچکار پچکار کر فاطمہ کھیل تک لے آئی تھی۔ پہلے فاطمہ نے پیاس کا احساس دلایا۔ پھر فرخ نے ادھ کھلے لطیفے سنا سنا کر تھپکی لگا دی۔ اوپر سے سلیمہ سے پنڈا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

رخصت سے پہلی شام کا واقعہ ہے۔ سلیمہ اپنی آٹوگراف لے کر آئی۔ میں اس وقت بدقسمتی سے لان میں بیٹھا تھا۔

اپنی آٹوگراف میری ناک کے سامنے کھول کر بولی ـــــ "سائن کر دیں جی اپنا۔ اگر کسی شاعر کا شعر یاد ہو تو وہ بھی لکھ دیں ـــــ"

"میری آٹوگراف لے کر کیا کریں گی آپ؟"

"جب میرا شوہر بلاوجہ ڈانٹا کرے گا تو میں اسے دکھایا کروں گی"۔

"یعنی ـــــ؟"

"یہ ثبوت ہوگا کہ اس سے پہلے بھی لوگ مجھے پوچھتے رہے ہیں۔ کوئی وہی اکیلا میرا دعویدار نہیں ہے ـــــ"

میں ہنس دیا۔ آٹوگراف پکڑی اور یہ شعر رقم کر دیا:

دکھائی دور سے دیتے ہیں جانفزا چشمے
قریب جاؤ تو موجِ سراب ملتا ہے

اس نے کھٹ سے یہ صفحہ آٹوگراف بک میں سے پھاڑ کر پھینک دیا:

"ہائے کوئی رومانٹک سا شعر لکھیں ـــــ مثلاً ع

تمہی ہو محبوب میرے میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں

کبھی ثبوت کے طور پہ دکھانا پڑتا ہے"

اس وقت جبکہ آٹوگراف کا گلابی مخملی کاغذ، جس کی ساری گوٹ سنہری تھی، ہری گھاس پہ پڑا تھا۔ فاطمہ آگئی۔ اس نے کاغذ اٹھایا، پڑھا اور خاموشی سے اسے سلیمہ کو پکڑا دیا۔ سلیمہ اسے پکڑ کر تھوڑی دیر یہ خاموشی سے کھڑی رہی پھر جلدی سے بھاگ گئی۔

فاطمہ کرسی کی پشت پر گردن چھوڑ کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا کھیل ہے ـــــ" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیا کھیل ہے؟ تم مجھے بلی کا بچہ بنائے گھر گھر کیوں لئے پھر رہی ہو؟"

"تم سلیمہ سے شادی کرانا چاہتے ہو ـــــ؟"

"ہاں ـــــ" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں اس سے عشق ہو گیا ہے ـــــ؟"

یکدم وہ برسوں کا منہ بند عشق جسے میں نے کئی قسم کے قفلِ ابجد لگا رکھے تھے اس کے سوال کے سامنے کھل گیا اور میرے آنسو نکل پڑے۔

نہ جانے فاطمہ کے حضور میں نے ہمیشہ ان ہی آنسوؤں کی بھینٹ کیوں دی۔ میں اس کے علاوہ کوئی اور تحفہ کبھی اسے نہ دے سکا۔

پہلی مرتبہ چمکتی تلوار کی طرح میرا اعتراف خود میرے وجود کے پار ہو گیا۔

"تم جانتی ہو ـــــ میں ساری عمر تم سے عشق کرتا رہا ہوں۔"

اردگرد کی گھاس اور درختوں میں آگ آئی اور میرے آنسوؤں سے تار تار ہونے لگی۔

"پھر ـــــ پھر میں تمہیں کبھی سلیمہ سے شادی نہیں کرنے دوں گی ـــــ"

"کیوں ـــــ ؟"

"کیونکہ وہ تم سے ایک ہی چیز مانگے گی۔"

"کیا ؟"

"عشق !"

"اگر تم ـــــ اگر تم مجھے آزاد نہیں کرنا چاہتیں تو پھر یہ سارا ڈھونگ کس لئے۔ میں تو ـــــ میں تو تم سے آزاد ہونے کا آرزومند بھی نہیں۔"

وہ ہنس دی ـــــ اطمینان بھری ہنسی۔

"تمہیں تو اپنی من چاہی منزل مل گئی۔ پھر ـــــ اب تم کیا چاہتی ہو ـــــ ؟"

"کیا مل گیا مجھے ـــــ روٹی، کپڑا اور مکان ! ـــــ کیا مل گیا مجھے ـــــ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں جنہیں پالتی پالتی میں بوڑھی ہو جاؤں گی ـــــ جو میری آزادی کے پاؤں میں ہمیشہ زنجیر بنی رہیں گی ـــــ"

"تمہیں ہی بہت آرزو تھی ان زنجیروں کی ـــــ"

"کیونکہ میرے اندر ایک عورت رہتی تھی۔ ماں تو مجھے لوگوں نے کہہ کہہ کر بنا دیا۔ جب میں لڑکی تھی تب ماں باپ کے گھر میں روٹی، کپڑا اور مکان میسر تھا۔ شادی ہو گئی۔ میں عورت بن گئی ـــــ پھر بھی روٹی، کپڑا اور مکان ہی مل سکا۔ خدا جانے پھر میں نے اتنا سفر کیوں کیا ـــــ کس کے لئے کیا ـــــ صرف روٹی، کپڑے اور مکان کے لئے ـــــ ؟"

"اور فرخ ـــــ ؟"

"فرخ ؟ ـــــ وہ چورن لپیٹنے والا کاغذ ہے چورن نہیں ہے۔ تہی دست کب کسی کو کچھ دے سکے ہیں ـــــ ؟"

"فاطمہ ! تم چاہتی کیا ہو ؟ ـــــ"

"کہ تم اپنی ناپسند کی شادی کر لو ـــــ"

"ناپسند کی شادی ؟ ـــــ وہ کیسے ہوتی ہے ؟ ـــــ"

"جس میں عشق کا امکان نہ ہو ـــــ" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میرے جیسی بانجھ بنجر شادی"۔

"کیوں ؟"

"کیونکہ ـــــ تمہاری ہونے والی بیوی صرف روٹی، کپڑا، مکان ـــــ اور بچوں کے وعدے پہ آئے گی اور یہ وعدے پورے ہو جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں ـــــ تمہاری بیوی کے تمام خواب پورے ہو جائیں ـــــ"

"اور میرے خواب ؟ ـــــ بتاؤ فاطمہ ـــــ !"

"تمہارے خوابوں کے پورا ہونے کا تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"کیوں کیوں کیوں ـــــ ؟"

لیکن میری "کیوں" کا جواب دیئے بغیر ہی وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اسی شام فرخ کے پُر زور اصرار پر، میرے اور فاطمہ کے انکار کے باوجود میری اور سلیمہ کی منگنی ہو گئی۔

ہماری کار نیو کیمپس کے پچھواڑے مہاتما بدھ جیسی شانت سڑک پہ آ گئی ہے۔ ایسی سڑک جس کے دونوں طرف پوپلر کے سیدھے اور چکنے پتوں والے درخت لگے ہیں۔

فاطمہ کے انکار کے باوجود میرے ہاتھ میں سلیمہ سے منسوب ہونے کی انگوٹھی ہے۔ فرخ پوری نظر سے سڑک کو دیکھ رہا ہے۔ کار کی وہیل پر اس کے بالوں بھرے ہاتھ ہیں۔

اس کا ایک پاؤں ACCELERATOR پر ہے۔ وہ جب اسے چاہے دبا کر رفتار تیز کر سکتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے گویا اس کا پاؤں تمہاری دونوں چھاتیوں کے درمیان عین وہاں پڑ رہا ہے جہاں تمہارا دل ہے۔ وہ جب چاہے ذرا سا دبا کر اس کی رفتار تیز کر سکتا ہے۔

کار کی بتیاں جل اٹھی ہیں ۔ درانتی کی شکل کا چاند ملگجے آسمان پر رونمائی کے لئے نکلا ہے۔ تم چپ ہو اپنے شوہر کی وجہ سے، میری وجہ سے، نئے چاند کی وجہ سے۔ تم اپنے اندر کی عورت کو چپ کرا رہی ہو۔ تمہیں خوف ہے کہ کہیں نئے چاند کے حضور تم کسی نئی آرزو کی مرتکب نہ ہو جاؤ۔

تمہاری دونوں بچیاں پچھلی سیٹ پر سو رہی ہیں۔ چھوٹی بچی کے منہ میں انگوٹھا ہے جسے وہ چپڑ چپڑ چوس رہی ہے۔ کاش سلیمہ میرے لئے انگوٹھا ہی ثابت ہو جائے ـــــ میں سوچ رہا ہوں، سوچتا چلا جا رہا ہوں ـــــ!

کاش دونوں جانب لگنے والے فریادی پوپلر کبھی یہ کہانی بھی سنائیں کہ اس بستی میں اس سڑک سے جاتے ہوئے انہوں نے کسی مطمئن انسان کو بھی کبھی دیکھا تھا ـــــ

جو جنسی لطیفے سنانے والے فرخ کی طرح فاتح نہ ہو ـــــ

اپنے ہاتھوں مجبور اور محکوم ہو جانے والی فاطمہ نہ ہو ـــــ

میری طرح مغلوب ہونے کی آرزو رکھنے والا نہ ہو ـــــ

فقط ایک مطمئن انسان ہو!!!

موج محیط آب میں

مینا صبح اٹھی تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے زبردستی اسے کھاری بوتل میں ریت ملا کر پلا دی ہو۔ ساتھ والے بستر پر سلوٹیں تھیں۔ ریحان صبح سویرے باہر نکل گیا تھا۔ اس نے گوٹے کے جال والے سرخ دوپٹے کے کونے سے دانت صاف کئے پر دانت اسی طرح کرکرا رہے تھے۔ اس نے سرہانے پڑے ہوئے گلاس سے دو چار باسی پانی کے گھونٹ چڑھا لئے۔ اب بھی دانتوں میں ریت کرکرانے کی سی آواز آ رہی تھی۔ سارا جسم کسی ایسے پہلوان کی طرح چھوٹا پڑ گیا تھا جو اوپر تلے ایک ہی دنگل میں تین چار بار پچھاڑیں کھا کر گرا ہو۔ ہاتھ بند کرتی تو پوریں دکھنے لگتیں۔ کھول کر ہتھیلی دیکھتی تو ہتھیلی اور کلائی میں چنگیں سی پھوٹنے لگتیں۔ گردن کی نو جیسے چوبندی کسی گئی ہو۔ جس رخ بھی موڑتی کڑ کڑ کڑ کی آواز نکلتی۔

ساتھ والی تپائی پر جگر مگر کرتے گلوبند، کڑے، ٹیکہ، جھومر، رانی ہار پڑے تھے۔ اس سارے زیور کے لئے اسے گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں جیولرز کے کتنے چکر لگانے پڑے تھے۔ کندن کے سیٹ پر کیا کیا جھگڑا ہوا تھا۔ رانی ہار کی کڑھائی پر وہ کتنی نالاں ہوئی تھی۔ جھومر میں سفید صراحی دار موتی نہ لگ پائے تھے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھل چھلا اٹھی تھیں ـــــ اب سارا زیور تپائی پر خربوزے کے چھلکوں کی طرح بے وقعت پڑا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ایک ایک زیور کو ہتھیلیوں میں لے کر ان کا مرنڈا بنا ڈالے لیکن صدیوں سے عورت وہ سب کچھ نہیں کرتی جو اس کا جی چاہتا رہا ہے اسی لئے اس عورت نے بھی صرف اس طرف پیٹھ موڑ لی اور لمبی سی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

سارا قصور اس کی بہنوں کا تھا۔ جس گھر میں چار بڑی بہنیں ہوں اور ایک سے ایک منہ پھٹ پیٹ کی ہلکی، وہاں مینا بیاہی جائے اور اسے کچھ بھی علم نہ ہو۔ جب بڑی آپا میکے آئیں تو مینا ابھی چھوٹی تھی۔ پر جیسا کہ رواج ہے دلہن کے پاس بچے بہت منڈلایا کرتے ہیں۔ مینا بھی کہیں قریب ہی تھی۔ جب بڑی آپا نے سہیلیوں کو کھی کھی کر کے بتایا:

"شرماتے تو وہ مجھ سے بھی زیادہ ہیں۔ خدا قسم روز رات کو میرے لئے ایک گجرا اور ایک سانچی کا پان لے کر آتے ہیں۔ پر کوئی میرے ہاتھ پر تھوڑا رکھتے ہیں بس سرہانے پر رکھ دیتے ہیں اور خود پیٹھ موڑ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔"

بڑی آپا کی سہیلی نے پسلیوں میں گدگدی کر کے پوچھا —— "ہاں پیٹھ موڑ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ اتنے ہی بھولے بیچارے"

بڑی آپا نے بالوں کی پن سے ناخن کرید کر جواب دیا۔ "خدا قسم ذرا آنکھ مل جائے تو ان کا چہرہ شہابی ہو جاتا ہے۔ یہ تو ایسے ہی باتیں ہیں مرد وہ کچھ نہیں ہوتے جو تم سمجھتی ہو۔ خدا قسم اتنی محبت دیتے ہیں، اتنی محبت . . . . . اتنی تعریف کرتے ہیں، اتنے ریجھے جاتے ہیں کہ سب کچھ ہو جاتا ہے اور علم ہی نہیں ہوتا۔"

بے چاری مینا سمجھ نہ پائی کہ سب کچھ کیا ہو جاتا ہے جس کا علم نہیں ہو پاتا۔ لیکن اتنا ضرور طے ہو گیا کہ شوہر سانچی کے پان اور موتیے کے گجرے لاتے ہیں۔ ویسے بھی مینا کے گھر میں سب تن پیٹ کا مزا جانتے تھے۔ اچھا پہنتے اور سلیقے سے اعلیٰ برگی کھاتے تھے۔ یہاں رہ کر تو مینا اسی قدر سمجھ پائی تھی کہ ہر گھر میں اچھا پہننا اور ترار یزہ کھانا زندگی کی آدھی جنت ہے۔

رانی کی شادی ہوئی تو اور بھی خوابوں میں گرم مصالحہ مل گیا۔

رانی کو شادی کے پورے ایک ماہ بعد اپنے دولہا کے ساتھ انگلینڈ جانا پڑا۔ دولہا سارا دن پاسپورٹ کے چکر میں رہتے تھے۔ رانی بھی اپنے شوہر کے ساتھ شاپنگ کرنے بھاگی رہتی۔ کہیں آرام دہ جوتے خریدے جا رہے ہیں، کہیں انگلینڈ کے دوستوں کیلئے تحفے تحائف کا انتخاب ہو رہا ہے۔ کبھی گھر والوں کی فرمائشوں

کی فہرست بن رہی ہے۔ وقت ملتا تو فلموں پہ فلمیں دیکھی جا رہی ہیں کہ وہاں پاکستانی فلمیں دیکھنے کو کب ملیں گی۔ رانی نے منہ سے تو کچھ نہ کہا پر اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ شادی ڈیڈ لیٹر آفس نہیں ہے، جہاں تمام آرزوئیں ٹوٹے ہوئے ڈھیلوں کی طرح پڑی ہوں۔

آسیہ باجی کے ولیمے پر پہنچی تو نظارہ ہی خیرہ کن تھا۔ آسیہ باجی میک اپ کر رہی تھیں اور دولہا بھائی ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے کبھی پنیں پکڑاتے تھے کبھی لپ سٹک کا ڈھکنا کھول کر دیتے تھے۔ باجی کی قمیض پر پشت کی جانب لمبی سی زپ تھی جو بھائی جان نے خود بند کی اور خدا جانے آسیہ باجی کے کان میں کیا کہا کہ وہ کان، ناک، آنکھیں سرخ کئے کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگیں۔ آسیہ باجی کا دولہا ویسے بھی مینا کو بہت پسند آیا تھا۔ ایسی ہری بھری گفتگو کرتا کہ سارے گھر والے چرند پرند بنے اس کی ہریالی میں چونچیں مارتے پھرتے۔ کبھی دولہا والے کمرے کو چٹخنی نہیں لگی کبھی آسیہ باجی اور دولہا بھائی اکیلے نہیں بیٹھے۔ ایک بارات ایک جلوس ایک مشاعرہ ایک پلیٹ فارم کا سا منظر ہوتا۔ دولہا بھائی کے آنے پر سب بیٹھے ہیں۔ ٹیلی وژن کے سامنے پروگرام پر تبصرہ جاری ہے۔ دولہا بھائی اور آسیہ باجی کی نظریں ایکدوسرے کی طرف ہر کارے دوڑا رہی ہیں۔ جو بات باجی کو پسند آتی ہے وہ کھٹ سے دولہا بھائی کو دیکھتی ہیں۔ وہاں سے جوابی مہر لگ کر رائے عامہ ہو جاتی ہے۔ جلوت میں خلوت کے مزے ہیں۔ بھری محفل میں معاشقہ جاری ہے آم کھائے جا رہے ہیں۔ ہر میٹھا آم جو باجی کو ملتا ہے دولہا بھائی کو پہنچ جاتا ہے۔ جو میٹھا آم بھائیجان کے ہاتھ میں ہوتا ہے باجی چوستی نظر آتی ہیں۔ ہر طرف بغیر چومے بوسے ہی بوسے۔ ہر طرف عشق ہی عشق ہے اور ایک لمس بھی نظر نہیں آتا۔

جو رہی سہی کسر تھی وہ گلابی کی شادی نے پوری کر دی۔

گلابی تو شادی کے بعد اور بھی گلاب جیسی ہو گئی۔ شوہر اس کا فوٹو گرافر تھا۔ پہلی رات اس نے سارا وقت فلیش سے دلہن کی تصویریں کھینچنے میں بسر کی۔ کبھی جھومر اتار کر، کبھی ٹیکہ پہنا کر، کبھی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے، کبھی کھڑکی میں بٹھا کر تصویریں کھینچی گئیں۔ شادی کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ گلابی کی ایک بڑی سی تصویر ملک کے مشہور رسالے کا سرورق بن کر آ گئی۔ دونوں اوپر تلے کے بچوں کی طرح خوب خوب

ایسی تیسی قسم کی لڑائیاں لڑتے تھے چپر ڈارک روم میں اکٹھے گھس جاتے۔ باہر نکلتے تو کبھی بھیاجی کے ماتھے پر لپ سٹک کا نشان ہوتا کبھی گلابی گریبان کے بٹن بند کرتی باہر نکلتی۔

کچھ تو ماحول کا فرق کہئے کہ مینا کے سسرال کے ڈھائی ٹوٹرو تھے سوبھی کدورتوں سے دل میلے کئے آپس میں یوں باتیں کرتے جیسے دشمن ملکوں کے ایمبیسڈر ہوں۔ چہرے پر دلنوازی رہتی اور دل سوکھے منقے کی طرح چرمُر رہتا۔ ویسے بھی مینا ایسے گھر سے گئی تھی جہاں باتوں کے اکھاڑے میں لوگ ایکدوسرے کو پچھاڑتے تھے پر زندگی کے ہر مشکل مقام پر دانتوں کی طرح جڑ جاتے تھے۔ سارے گھر والے تن تازہ قلندر راجہ قسم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ صندوقوں کی طرح کچھ تناسخ کے مسئلے پر ان کا اعتماد نہ تھا۔ کسی کا بُرا اٹھلے نہیں چاہتے تھے کہ بُرا کرنے یا سوچنے میں جو وقت، تندہی اور ذہنی کوفت اٹھانا پڑتی ہے اس کے یہ لوگ اہل تھے نہ قائل۔ نہ گھر میں کبھی تن پھن دیکھی نہ ایسی باتوں کی سمجھ آئی کہ دنیا میں ہر رنگ، قماش، ہر ذہنیت کا آدمی موجود ہے اور بھانت بھانت کے آدمی کے ساتھ گزارا کرنا اور اپنے سے مختلف سمت میں دیکھ سکنے ہی کا نام زندگی ہے۔ مینا کے میکے میں سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی مایوسیاں زندگی کے المیئے سمجھی جاتی تھیں۔ کسی فلم کا ہاؤس فل ہو جانے پر یہ لوگ پہنچے اور ٹکٹیں نہ ملیں یا درزی قمیض سی کر لایا تو کالر کی جگہ اس نے گول گلا بنا دیا۔ پھر جب ابا جان نے تین داڑھیں اکٹھی نکلوائی تھیں اور کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ برسوں نہ بھولنے والے المیئے تھے۔ عجیب اتفاق ہے لیکن بدقسمتی کا ہاتھ اس گھ پر بہت، ہلکا پڑا تھا اسی لئے مینا سمجھ نہ سکی تھی کہ قسمت کسی کسی گھرانے کے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک بھی کیا کرتی ہے۔ بدقسمتی کے واقعے سب اخبار کی باتیں تھے جن کو پڑھ کر گھڑی دو گھڑی سب تت تت کر لیا کرتے تھے۔ پھر اس ٹکر لیبرے کے بعد وہی دلائی کی سی گرم زندگی۔

قصور اس نکتۂ نظر کا تھا یا پچھلی زندگی کا یا پھر اس کی چھوٹی سی بیاض کا تھا یا سہیلیوں کا۔ بہرکیف سارا آنگن ٹیڑھا تھا جس میں اسے ناچنے کے لئے بغیر کسی تیاری کے بھیج دیا گیا تھا۔

رات جب اسے حجلۂ عروسی میں داخل کیا گیا تو پورے چھ گھنٹے کی تیاری سے اس کی کمر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ صبح ہیرڈریسر کے پاس جو دو گھنٹے گرا کرا کر بیٹھی رہی سو الگ۔ زیور پہننے کی عادی

نہ تھی پر اس وقت جو چمکتا دمکتا زیور اس پر لدا تھا اس کے بوجھ سے اسے عجیب قسم کا سرور حاصل ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس کے معطر وجود کے ساتھ ساتھ گلاب اور موتیے کے پھولوں نے روزمرہ سے ہٹ کر ایک فضا پیدا کر رکھی تھی۔ کئی دلہنیں اس کے سامنے یوں کمروں میں بند کی گئیں اور کئی دلہنوں کو اس نے صبح سویرے کسمساتے، لجاتے، گلابی گلابی آنکھوں سے نظریں چراتے دیکھا تھا۔ پھر بھلا ہو اُردو لٹریچر کا اردو کی غزلیہ شاعری کا جس نے اس کے دماغ میں قند گھول رکھی تھی۔ وہ اس وقت بالکل اس چڑیا کی طرح بیٹھی تھی جو ناشتے کی میز سے کچھ فاصلے پر بیٹھی یہ سوچتی رہے کہ اڑن کیسی ہو کہ چونچ بھر چینی بھی مل جائے اور میں پکڑی بھی نہ جاؤں۔ عجیب قسم کا خوف، پہلی علانیہ چوری کا احساس، میکے گھر کی بجھی بجھی یاد، سسرال والوں کا پُرتپاک خیرمقدم، نئی زندگی سے اَن گنت ذہنی وابستگیاں، گئے زمانے سے کئی طریقے کے الوداعی دست پنجے ـــــ کیا کچھ تھا جو اس لمبے رینگ کر اس پر سوار نہ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ گھبرا کر غسلخانے کی جانب دیکھتی جس میں نیلے رنگ کا زیرو کا بلب روشن تھا اور کئی بار وہ بڑے دروازے کی طرف پُرامید نظروں سے جھانکتی جدھر سے اس کے دولہا کو آنا تھا۔

جب دولہا اس حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو وہ اپنے خیالات کی رو میں دو ایک بار لمبا لمبا اونگھ بھی چکی تھی۔ ریحان اپنے فوٹو سے زیادہ خوش شکل اور وجیہ تھا۔ اس وقت زری کی اچکن اور چُست پاجامے میں وہ کچھ اچکا اچکا سا نظر آتا تھا۔ لیکن ایک نظر میں مینا نے بھانپ لیا کہ دولہا اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔

یہ اس کی انا کیلئے پہلا دھکا تھا۔

مینا ان لڑکیوں میں سے تھی جو بن کر اوڑھ کر، چھین جھپٹ کر خوبصورت عورتوں میں شامل ہو جایا کرتی ہیں۔ کپڑا، زیور اور میک اپ اس کی ذات پر خوب کھلتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جو سو کر اٹھیں تو بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہے۔

ریحان نے خاموشی سے گلے کے سارے ہار کرسی پر ڈال دیئے اور بڑی سی جمائی لے کر کہا:

"یہ مشرقی شادیاں بڑی تھکا دینے والی۔ . . . اور احمقانہ ہوتی ہیں۔ سب کچھ اتنا UN-REAL

اور SILLY ہوتا ہے۔ آپ نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے۔"

ریحان جو کچھ کہہ رہا تھا درست تھا۔ جس طرح کہہ رہا تھا اس میں کوئی خرابی نہ تھی صرف اس کی آواز میں جو لاتعلقی، اکتاہٹ اور برتری تھی اس سے معاً مینا کو خوف آ گیا۔

ریحان نے کمرے کی بتی بند کر کے پھر اسی آواز میں کہا —— "آپ یہ گھوڑے کا ساز سب اتار دیں اور کوئی نائٹ سوٹ وغیرہ پہن لیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آرام دہ لباس۔"

غسلخانے کا دروازہ بند ہونے پر نیلے رنگ کے بلب کی روشنی بھی بند ہو گئی۔

گرم گرم آنسو خدا جانے کہاں کی قید سے نکل کر آنکھوں سے بھاگے۔

مینا نے کچھ غصہ، کچھ ناامیدی، کچھ عجیب قسم کی رنج سے ایک ایک زیور تن سے اتار کر اندھیرے میں تپائی پر ڈھیر کر دیا۔ سہیلیوں نے اس کا ٹیکہ بالوں کی پنوں سے اتنے احتیاط سے ٹکایا تھا کہ اسے نوچ کر علیحدہ کرنے میں اس کے ہیئر سٹائل کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ اندھیرے ہی میں اس نے اپنی نقلی پلکیں اور گردن پر بیٹھے ہوئے BUBBLES کا جوڑا اتار کر رکھ دیا۔ سوٹ کیس میں سے نائٹ سوٹ نکالا اور اسے یوں پہن لیا جیسے ابو کے کہنے پر وہ دوائی پی لیا کرتی تھی۔

جب غسلخانے کا دروازہ کھلا تو ریحان صرف پاجامے میں ملبوث تھا۔ چھاتی کے بال کندھوں کے بالوں سے جا ملے تھے۔ سب کچھ خواب کی طرح بے حقیقت سا تو تھا لیکن اتنا خوبصورت نہ تھا۔

THAT'S BETTER ریحان نے زیرو کے بلب کی نیلی روشنی میں اسے گیشا گرل کی طرح بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"خدا جانے دلہنوں کو اس قدر IDIOT طریقے پر سجانے کا کیا مطلب ہے۔۔۔۔ آپ پنکھا پسند کرتی ہیں کہ بند کر دوں۔۔۔۔؟"

لیکن ابھی مینا جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ ریحان نے پنکھے کا سوئچ بند کر دیا۔ نیلے رنگ کی روشنی میں اسے اپنا کمرہ UNDER WORLD کی طرح نظر آنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا اسے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگے۔

رات بھر میں وہ جاگتے سوتے میں عجیب عجیب جگہوں پر معلق رہی۔ کبھی وہ خواب میں سوچتی ابھی وہ اٹھے گی اور امی اسے ناشتہ کیلئے بلا رہی ہوں گی۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ مر چکی ہے۔ کسی ایسی جگہ کسی ایسی غار میں محبوس ہے جس کے سامنے آہنی پھاٹک ہیں۔ ہیئر ڈریسر کا چینی چھو منہ میں لمبی لمبی جوڑے کی پنیں لیے اس پر جھکتا ہی چلا آتا اور وہ نہ نہ کرتی پیچھے ہٹتی جاتی۔

اب اسے گرم پانی میں باتھ سالٹ ملا کر نہلایا جا رہا ہے۔ اس کے بدن سے ابٹن کی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ تولیہ سارا کولون میں مہکا ہوا ہے۔ سہیلیاں مہندی لگا رہی ہیں۔ کیوٹیکس ذرا سی ہل جائے تو۔۔۔ REMOVER سے روئی سیلی کر کے کیوٹیکس اتارا جا رہا ہے۔ ذرا سا لپ چھو جانے پر دو دو چار چار چہرے اس کا حسن آنکتے اور بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کتنی اہم محسوس ہو رہی ہے۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں —— "کتنا روپ چڑھا ہے مینا کو۔ سب بہنوں کو مات کر گئی مینا۔"

اس کے ساتھ والے پلنگ پہ ریحان اوندھا سو رہا تھا۔ اس کی پشت پر بال اس طرح پھیلے تھے جیسے جغرافیے کے نقشوں میں پہاڑوں کے نشان ہوتے ہیں۔ چھدرے چھدرے کنکھجوروں کی طرح شمال سے جنوب پھیلے ہوئے۔

مینا کئی بار سوئی۔ کئی بار جاگی۔ ہر بار جب اس کی آنکھ کھلتی ایک تمتماتا ہوا سرخ و سفید چہرہ اس پر جھکا ہوتا۔ زیرو کے نیلے بلب میں یہ خوبصورت شکل اسے ڈریکولا سی نظر آتی جو اس کی گردن سے لہو چوسنے جھکی چلی آتی، جھکی چلی آتی۔

وہ خوف سے آنکھیں بند کیے اپنے ناخن سنبل کے تکیے میں سر کے نیچے گڑو دیتی۔ اس خوف سے وہ تکیے کو زخمی کرتی رہتی کہ اگر اس کے ہاتھ آزاد ہوئے تو کہیں وہ اس تمتماتے چہرے کو نہ کھرچ ڈالے۔ سارا کمرہ کسی ویٹنگ روم کی طرح بند بند تھا۔ اسی گھٹن میں صبح ہو گئی۔ دولہا کے گھال میل نے جسم کے کئی حصوں پر نیل ڈال دیئے تھے۔ لیکن چہرے پہ ایک بوسے کا نشان بھی نہ تھا۔

مینا نے کئی بار پانی پیا لیکن بار بار اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے کھاری بوتل میں ریت ملا کر پلا دی ہو اور سارے دانت کرکرا رہے ہوں۔

اس رات مینا جیسے گھنا سی گئی۔ کبھی سوچتی گھر جا کر سب کچھ بتا دوں گی۔ پھر سوچتی آخر بتانے کو ہے کیا؟ کوئی کیا سمجھے گا؟ اتنی سی بات کو چوچی کہنے والی تو میں بھی نہ تھی۔ سب جانتی تھی کہ بالآخر یہی کچھ ماحصل ہے؟

لیکن پھر دل پوچھتا کہ بالآخر سے پہلے۔ . . . اور پہلے . . . . . اور پہلے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی نظروں میں سانچی پان گھومتے۔ کبھی گجرے مہکتے۔ پاسپورٹ کے ورق پہ واکنگ شوز پہنے آسیہ باجی گھوم رہی ہوتیں۔ رسالے پہ چھپی ہوئی گلابی کی تصویر نظروں کے سامنے گھومتی اور گھومتی چلی جاتی۔ گھر جا کر کس چیز کا گلہ کرے؟

گھر جا کر ماں کے کندھے سے لگ کر کیا کہے؟

ماں کیسے سمجھے گی . . . . . بہنیں کب جان سکیں گی کہ مینا اس سوئی کی مانند ہے جسے بچے پٹڑی پر رکھ کر بھول جاتے ہیں اور جس پہ سے منوں بوجھل ٹرین چھکا چھک کر کے میلوں دور نکل جاتی ہے۔

سسرال میں اسے کوئی ایسی تکلیف نہ تھی جسے وہ انگلیوں میں گن گن کر کہہ سکتی۔ ایک . . . . دو . . . . تین . . . . . اس کا سب کچھ سینما سکرین کی طرح تھا۔ ہر طرح کی خوبصورت خوش آئند دلچسپ تصویریں بن رہی تھیں مٹ رہی تھیں پر ایک بھی تصویر، ایک بھی ہیولا اس کورے لٹھے کی سکرین میں جذب ہو کر نہ رہتا تھا۔ سسرال تو اس گُتھی جوتی کی مانند تھی جسے پہنو تو وہ پتہ نہ دے کہ وہ کہاں سے چبھتی ہے پر اتارو تو پاؤں من من کا ہو جائے۔

پھر اچانک شادی کے چند دن بعد مینا نے کپڑا زیور پہننا چھوڑ دیا۔ اس کے شوہر کو تو بہت خوشی ہوئی پر ساس بہت تلملائیں۔ مینا میکے سے اپنے کنوار پنے کے کپڑے اٹھا لائی تھی۔ اب وہ لٹھے کی شلوار اور گھِسا ہوا چنجل کا دوپٹہ اوڑھے بڑی بے مزہ سی، نامعلوم سی، اچھی سی لڑکی نظر آتی۔ وہ دولتی مارنے والیوں میں سے نہ تھی۔ اونگی سی، سہمتی اور ٹڈیوں کا کانٹا۔ بیٹا دوپٹہ اوڑھے وہ گھر میں اونچے طبقے کی ملازمہ لگتی۔ ایسی ملازمہ جو زر خرید بھی ہو۔

یوں گرگٹ کی طرح بدرنگ پڑی رہتی پر آنکھوں پر اس کا بس نہیں تھا۔ کسی زمانے میں یہ بھاری پپوٹے

والی ہلکی شربتی آنکھیں بڑی چمکیلی اور کٹاری سی تھیں۔ اب مینا کی زود حسی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ رو رو کر آنکھیں چھوٹی ہو کر اندر کو دھنس گئی تھیں۔ کہاں تو وہ ایسے گھر سے آئی تھی جو ہر حال میں زندہ رہنے کا قائل تھا۔ کہاں اب وہ یہ سوچ سوچ کر نیم پاگل ہو گئی کہ صبر کر مینا۔ اچھے دن آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ کبھی کبھی اللہ کے خوف سے سہم جاتی کہ کہیں یہ سب کفرانِ نعمت ہی میں شامل نہ ہو جائے پھر جب دل پہ کوئی کوچا سا مارتا۔ راتوں کی تنہائیاں دن کو یاد آتیں تو دل پتی پتی ہو کر بکھر جاتا۔

پہلے پہل تو مینا اپنے شوہر کے سامنے دو چار مرتبہ یونہی بے ضبط سی رو دی۔ ریحان نے ہمیشہ بڑی انجانی آواز میں ایک ہی بات کہی:

"تم بہت TOUCHY ہو۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

ریحان ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو ناقص العقل سمجھتے ہیں اور اسی لئے جب کبھی عورت روتی ہے تو اسے اس کی کمزوری اور احمق پن سمجھ کر تکلیف کی وجہ کبھی دریافت نہیں کرتے۔

ریحان کو منانے کا صرف ایک ہی طریقہ آتا تھا یعنی مینا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اپنے کمرے میں لے گئے اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ اس کی مردانگی ایک ایسی فوج تھی جو شہر کی ہر فصیل، ہر مندر کا دروازہ، ہر دروازے کا ہر دہانہ ـــــ قلعے کی شہر پناہ اپنے زور بازو سے کھولنے کی عادی ہو۔ ریحان کے نزدیک کوئی عورت اس کے ساتھ سونے کے بعد نہ اس سے نہ دنیا سے ناراض رہ سکتی تھی۔ اس اتصال پر عورت کی صحت، خوشی اور قناعت کا انحصار تھا۔ وہ جسمانی رابطے کے توسط سے مینا کو جان پایا تھا اور بس اس میل کے بعد وہ دونوں ایک ہی کمرے میں اجنبیوں کی طرح گھنٹوں بیٹھے رہ سکتے تھے۔ اس طرح کے منانے کے بعد وہ ہمیشہ یہی کہتا:

"لے اب تو دو چار دن تو نہیں روئے گی۔" یہ اور بات ہے کہ مینا کو اس کے بعد اور بھی طغیانی آنسو آتے۔

کچھ عرصہ تو مینا کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ تھا پر جب اسے ہر بار ایک ہی نتیجہ بھگتنا پڑتا تو وہ محتاط ہو گئی۔ اب ریحان کی موجودگی میں وہ سہمی سہمی آنکھیں تو لئے پھرتی پہ ہمدردی سے کنی کتراتے رہتی۔

مینا کی ساس کو ایسی گم سم کام کرنیوالی سادہ صورت سادہ سیرت بہو پہلے نہ ملی تھی۔ اتنے ماڈرن زمانے میں ایسی پتی برتا ستی ساوتری سے گھر کے تمام کام ..... نکلتے تھے، اسی لئے اسے یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں جو ریحان سے مینا کی نہ بنی تو اچھا کام کرنے والا ایک فرد گھر سے کم ہو جائے گا۔ کچھ کچھ شک و شبہ تو اس کو پڑتا ہی رہتا تھا پر نہ بہو منہ کھولتی تھی نہ ساس اتنی دل والی تھی کہ بڑھ کر بہو کو گلے سے لگا لیتی۔

کبھی مینا کا اترا ہوا سا چہرہ دیکھ کر ریحان سے کہتی: "اسے کوئی فلم ہی دکھا لا۔ پھرا لا اسے سارا دن کاموں میں رُجھی رہتی ہے۔"

ہر بار سیر سپاٹے کا بھی وہی نتیجہ نکلتا جو رونے دھونے کا نکلا کرتا تھا اس لئے مینا نے باہر جانا بھی چھوڑ دیا۔

جب پہلی بار ریحان نے اس پہ کیچڑ اچھالی تو وہ ایسے بکڑی گئی جیسے چھکا مارا ہو اور آگے سے پکیج ہو جائے۔ وہ خوب رو دھو کر غسلخانے سے نکلی تھی کہ گیلری میں ساس اور ریحان مل گئے۔ وہ دونوں ایک سپیڈ سے پان چبا رہے تھے۔

ساس پسیج کر بولی: "ریحان اسے کہیں لے جا۔ دیکھ تو کیسی اداس ہو رہی ہے۔"

ریحان خدا جانے کیسا بھرا بیٹھا تھا، پھٹ پڑا ..... "اس کی اداسی دور کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ خدا جانے کن یاروں کو یاد کرتی رہتی ہے سارا دن۔ اس کا دل شروع دن سے مجھ سے نہیں ملا اماں جی ـــــ اسے تو وہ بدبخت اپنی بیاض مجھ سے پیاری ہے۔ اسے کبھی سوٹ کیس میں، کبھی دراز میں سنبھالتی پھرتی ہے۔ میرا اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ..... زندہ ہوں کہ مر گیا۔"

ریحان تو یہ کہہ کر چلا گیا لیکن دنیا اس کی نظر میں فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ وہ جو زندگی اور موت کے درمیان ہونکتی رہتی تھی۔ اس کا صلہ یہ تھا کہ جہاں بیٹھتی ریحان کی بات انی کی طرح کھچ سے دل میں اتر جاتی۔ کالج کی سہیلیاں آنسو ڈر کے ... دل میں ٹوٹ ٹوٹ کر بہتیں۔

"یہ بڑی بلبل ہے۔ دیوانہ ہو جائے گا وہ ..... دیوانہ۔"

"ہماری مینا تو شہرزاد ہے۔ ایک سے ایک کہانی سنائے گی ریحان کو۔"

"اس کی باتیں تو مصری کی ڈلیاں ہیں۔ برفی کی ٹکڑی ہے ہماری مینا ..... برفی کی ٹکڑی۔"

ریحان تک جب بھی وہ پہنچی، اچھینا جھپٹی کے عالم میں پہنچی۔ ان کے درمیان آتش بازی کا نظارہ ہوتا اور بعد میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ ریحان کے ذہن کے سامنے اتنے دبیز پردے، اتنے سنگین پہرے، اتنی رکاوٹیں تھیں کہ مینا آگے بڑھتی اور پھر منجمد ہو کر رہ جاتی جیسے دو آدمی جو ایک دوسرے کی بولی نہ جانتے ہوں اور لمبے سفر پہ ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیں۔ وہ بھی اسی لاتعلقی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد ساس صاحبہ نے اپنا بہشتی زیور کھولا۔

ساس کی باقی تمام بہوئیں انہیں کٹے ہوئے ناخن جیسا بے وقعت سمجھتی تھیں۔ مینا کو سمجھانے اور عقل سکھانے کے مواقع سمٹ آئے تو اپنی اہمیت ہی سے بوکھلا اٹھیں۔ مجازی خدا کے فلسفے سے جنازہ جائز ہونے تک بہشت میں کریڈٹ کارڈ کے طور پر استعمال کرنے سے لیکر سوسائٹی میں دینے کے طور پر دکھانے کے تمام فوائد تفصیلی طور پر اسے سمجھائے۔ ہر بات کے انجام میں مینا یہی کہتی:

"میں اماں جی کوئی شکایت کرتی ہوں کہ آپ مجھے سمجھا رہی ہیں۔"

"ہاں بیٹی۔ تیرے چہرے سے لگتا ہے کہ تو خوش نہیں۔ بیٹا۔ شوہر کی ایک خوشی سے ستر ثواب ملتے ہیں۔"

اس حساب سے وہ بے حساب ثواب کما چکی تھی۔

"آپکو وہم ہے جی میری طبیعت ہی ایسی ہے۔"

ساس اور بھی ملنسار پیاری اور نرواں ہو کر کہتی ..... "عورتوں کو ہزار شوق ہوتے ہیں۔ شوہر دفتر سے آنے والا ہو تو لاکھ بناؤ سنگھار ہوتا ہے۔ دل میں ایک ولولہ ہوتا ہے ایک شوق!"

"بس جی۔ مجھے شروع ہی سے ایسی باتوں کا شوق نہیں تھا۔"

جب ساس کو یقین ہو گیا کہ بہو کو ایسی باتوں کا شوق نہیں ہے تو اب وہ سچے دل سے اپنے بیٹے پر ترس کھانے لگی۔ جب بہو ہی موئی برف کا تودہ ہو تو بے چارہ صحت مند لڑکا کیا کرے۔ اب وہ باہر آنے جانے والی سے یہی کہتیں:

"ہمیں تو فرشتہ مل گیا ہے خدا قسم نہ کسی کے تین میں نہ تیرہ میں۔ پر کیا کریں مرد تو فرشتوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے ناں۔ اس کے تو وچار ہی عورتوں جیسے نہیں ہیں۔ اسے کچھ خیال ہی نہیں مرد چاہے باہر کچھ کھا آئے۔ چپکی بیٹھے رہے گی یہ تو۔۔۔۔!"

کچھ سالوں کے بعد جب کوئی ننھا منا بھی گھر نہ آیا اور ریحان گھر کے بجائے مستقل طور پر باہر کچھ کھانے لگا تو ساس نے مینا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"خدا کی قسم اگر میری بات سے تیرا دل ٹوٹتا ہو تو صاف صاف مجھے بتا دینا تو دلی ہے انسان نہیں ہے اور تیرا دل میں دکھانا نہیں چاہتی۔ بہت باتیں سنی ہیں میں نے ریحان کے متعلق۔ اگر تو اجازت دے تو اس کا بیاہ کر دیں کہیں۔ کم از کم شام کو تو گھر واپس آ جایا کرے گا تیری مہربانی سے ریحان بچ سکتا ہے۔"

مینا نے نہ شور مچایا نہ آنسو بہائے نہ گھر جانے کی دھمکی دی نہ اپنے پر ترس کھایا اور چپ چاپ دوسری شادی کی اجازت دیدی۔

شادی کی رات مینا پر عجیب گزری۔

وہ کبھی سوتیا ڈاہ میں جل کر سوچتی۔۔۔۔ "آ بی بی! تو بھی اس آگ کا مزہ چکھ۔ دیکھ تو اس بھٹی کی آگ کیسی ہے۔"

پھر نکھر جاتی اور سوچتی۔۔۔۔ "کل گھر چلی جاؤں گی۔ مہینہ مہینہ بھر بھی ایک بہن کے گھر رہوں تو چار مہینے تو یہ پار ہو گئے۔۔۔۔"

پھر خیال آتا صبح مجھے ریحان کو مبارکباد دینی چاہئے کہ نہیں۔

کبھی کبھی اپنی شادی کی رات ذہن میں گھومنے لگتی۔ کتنا سرخ و سپید رنگ تھا ریحان کا۔ کتنا اونچا قد۔ اس کی پیٹھ پر بال اس طرح تھے جیسے نقشے پر کوہ یورال کے نشان۔

کبھی کچھ یاد آتا کبھی کچھ۔ اسی سوچ کی سرحدیں جب آدھی رات سے جا ملیں تو وہ اپنے کمرے سے نکلی اور دلہن والے کمرے کے پچھواڑے چلی گئی۔

کھڑکی بند تھی لیکن اندر کی جھری سے صاف نظر آ رہا تھا۔

بتی روشن تھی۔

نئی دلہن سارے گہنے پاتے پہنے پلنگ کی پشت سے جڑے ہوئے گاؤ تکیے پر کہنی جمائے راج ہنس کی طرح بیٹھی تھی اور ہولے ہولے سانس لے رہی تھی۔

ریحان کا تین چوتھائی حصہ اس سے چھپا ہوا تھا لیکن چہرے کی ایک جھانک اور آواز صاف آ رہی تھی۔۔۔۔۔ "کتنے خوبصورت ہاتھ ہیں تمہارے۔ یہ مہندی کس نے لگائی ہے اتنی محبت سے؟ جی چاہتا ہے تمہارے ہاتھ کھا جاؤں کچے۔"

"مجھے تو ایسی باتوں کا شوق ہی نہیں۔ بس سہیلیوں نے مجبور کر کے رنگا دی۔ میں ذرا یہ ٹیکا اتار دوں"

ریحان نے جلدی سے نئی دلہن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔۔۔۔۔ "لگا رہنے دو۔ کتنا اچھا لگتا ہے تمہارے ماتھے پر۔۔۔۔"

"خدا قسم گردن تھک گئی ہے میری۔ کم از کم یہ گلوبند تو اتار دوں میں؟"

"میری خاطر آج کی رات مجھے اسی طرح نظر آؤ۔۔۔۔۔ میں اپنی دلہن کو ذہن میں محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ تاکہ جب میں بوڑھا ہو جاؤں اور تمہارے بالوں میں سفیدی آ جائے تو۔۔۔۔۔ میں آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اپنی دلہن کو دیکھ سکوں۔۔۔۔۔ ایسی ہی سجی ہوئی گڑیا سی دلہن۔۔۔۔"

راج ہنس محبت، چاؤ اور تعریف کے پانیوں پر تیر رہا تھا ـــــ اور ریحان اچکن اور چست پاجامے میں ملبوس اپنے گلے سے ہار اتار اتار کر اس کے زانو پر رکھ رہا تھا۔

دلہن کے کمرے کی بتی ایک بار بھی گل نہ ہوئی اور زیرو کے بلب کی نیلی روشنی غسلخانے کی دہلیز چھوڑ کر ایک بار بھی اندر نہ آ سکی۔ دلہن ساری رات زیور پہنے بیٹھی رہی اور ریحان اس سے پیار بھری باتیں کرتا رہا۔

صبح جب پیلی پیلی دھوپ منڈیروں پر آئی اور ایک مینا چپ چاپ پھاٹک پر بیٹھ کر کریز کرنے لگی تو مینا کی ساس برآمدے میں سینہ کوٹتی ہوئی آئی اور اونچے اونچے بین کرتی ہوئی بولی :

"ہائے میری بھولی بہو۔ ہائے میری سادہ بہو ..... میں تو سمجھتی تھی کہ اس کا دل ہی عورتوں جیسا نہیں ہے ..... ہائے میری مینا مر گئی ..... ہائے سوتیا ڈاہ میں جل گئی میری مینا ..... ہائے میری الٹی مت۔ میں سمجھتی رہی اسے ایسی باتوں کا شوق ہی نہیں ہے۔ ہائے میری مینا ..... ہائے میری سیدھی بہو۔ ہائے میں تو سمجھتی تھی وہ مرد کے سائے سے بھاگتی ہے ....."

صرف سلیپنگ پلز کھا کر سو رہنے والی مینا کی آنکھیں اس طرح کھلی تھیں جیسے وہ اب بھی کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ گجرے، سانچی پان اور تصویروں سے لدا ہوا خواب جس میں ایک بھی لمس نہ تھا اور چاروں طرف بوسے ہی بوسے بکھرے تھے۔ اس خواب کی خبر خدا جانے پھاٹک تک کیونکر پہنچی کہ پھاٹک پر بیٹھی مینا نے ایک بار سر اٹھایا۔ زور زور سے چیخی اور پھر زور زور سے پنجے جھاڑتی ہوا میں پھڑپھڑاتی اڑ گئی۔

سمجھوتہ

لانس نائیک عبدالکریم بڑا مفرح آدمی تھا۔ بڑی دیر میں روٹھنے والا اور بہت جلدی من جانے والا۔ لمبی بات کو ریف ناٹ لگا کر وہ بڑی تیزی سے مختصر کر دیا کرتا۔ اس کی آنکھیں کسی بچے کی آنکھیں تھیں۔ اجلی اجلی دھلی دھلائی اور پر اعتماد۔ عبدالکریم سے ملنے کے بعد کسی اور سے ملنے کی تمنا دل میں باقی نہ رہتی کیونکہ وہ بہت کم سوال پوچھتا اور اس سے بھی کم اپنے متعلق باتیں کرتا۔ وہ نہ لوگوں کے انتشار کرید نے کا عادی تھا نہ اپنے اندر کے لاوا کی چنگاریاں باہر پھینک کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر زندگی ایسے گزرتی جیسے چپ چاپ بنسی لگائے ندی کے کنارے مچھلیاں پکڑنے والوں کا گروہ بیٹھا ہو۔ زندگی کے دریا سے بڑی مچھلی پکڑ لی تو بھی خوش اور بنسی خالی نکل آئی تو بھی خوش۔ خوشی کا تعلق عبدالکریم کے ساتھ بڑا گہرا تھا۔ خوشی، خوش خلقی، خوش وقتی اس کی عادت تھی۔ اس کا پہناوا تھی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔

اسی لئے جب الہ آباد کیمپ میں رات کے تین بجے لیفٹیننٹ ہربنس کھنہ تین سکھ سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوا تو اس وقت بھی عبدالکریم مسکرا رہا تھا۔ رات کے تین بجے از سرِ نو تلاشی شروع ہو گئی۔ ابھی پونے گیارہ بجے وہ تلاشی سے فارغ ہوئے تھے۔ اب ایکبار پھر وہی سلسلہ شروع ہوا اور سپاہیوں نے اپنی جیبیں مرے ہوئے کتوں کی جیبوں کی طرح باہر لٹکانی شروع کیں تو سب کے چہروں پر خونخوار بھیڑیوں کی درندگی امڈنے لگی لیکن عبدالکریم مسکراتا ہوا فٹافٹ اٹھا۔ لیفٹیننٹ کو

سلوٹ کیا۔ پھر اپنے کٹے کو اٹھا کر جھٹکے، دو سگرٹیں اور ایک میلا سا چوکور لکیردار چیتھڑا اٹھالیا۔

"دونوں ہتھیلیاں کھولو ——" سپاہی نے اس کے کندھے کو بٹ سے چھو کر کہا۔

عبدالکریم نے اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول دیں۔

"یہ چیتھڑا کیوں رکھا ہے تم نے سرہانے تلے۔"

"کونسا چیتھڑا ؟ ——"

"یہ اندھے —— یہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ تو رومال ہے ہمارا۔ —— جھلی لہجے میں عبدالکریم بولا —— "ادھر چوہاگاچھا پہ ہماری ایک بنگالی بہن نے دیا تھا ہم کو۔"

ہربنس آگے بڑھا۔ وہ بڑا ہی کم عمر لیفٹیننٹ تھا۔ اس لئے اس میں جو بھی نفرت تھی خالص ٹریننگ کی وجہ سے تھی:

"تم مسلوں کی غیرت کو کیا ہوا —— چوہاگاچھا کا نام لیتے شرم نہیں آتی۔ سپاہی جس میدان سے مفرور ہوتا ہے جہاں شکست ملتی ہے اس جگہ کا نام کبھی نہیں لیتا۔"

عبدالکریم مسکراتا رہا۔ وقت پر۔ ہربنس پر۔ اپنے آپ پر!

"میں جانتا ہوں اس بہن کے ساتھ تم نے کیا کیا ہوگا۔ ختنے شدہ کتوں کی کوئی بہن نہیں ہوتی کوئی ماں نہیں ہوتی، کوئی بیٹی نہیں ہوتی۔ ان کا دنیا کی ساری عورتوں سے بس ایک رشتہ ہوتا ہے ..... زناکا رشتہ!"

عبدالکریم پٹھے کی طرح سخت ہوگیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی، اس کے بازوؤں کی ہڈیاں، اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں، سب بپھرے ہوئے گھوڑے کی طرح اینٹھ گئیں۔

پہلی بار عبدالکریم کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

جب واہگہ بارڈر سے کچھ دور ہماری بس رکی تو میرا سانس کچھ دیر کیلئے بند ہوگیا۔ سامنے میرے دیس کی عافیت تھی۔ جھنڈیوں سے لدا ہوا پھاٹک تھا۔ میرے ملک کے نغمے۔ اپنے لوگ۔ آہستہ آہستہ

چلتے ہوئے نگاہیں جھکائے ہم دورویہ سرخ قالینوں تک پہنچے۔ ان قالینوں پر سے چل کر ہمیں اس شامیانے تک جانا تھا جس کے لاؤڈ سپیکروں کی آواز آرہی تھی۔

سب قیدی سرخ قالین پر اکھڑے قدموں سے اپنے اپنے قرآن کریم کندھوں سے لٹکائے ہوئے ہوئے چل رہے تھے۔ وقت اور فاصلے طے ہو چکے تھے۔ ہر طرف ہارے ہوئے لوگوں کیلئے جیت جانیوالوں کا سا سوانگ تھا۔ فضا میں ترس کی آہیں گونج رہی تھیں۔ میں نے سرخ قالین سے بچکر چلنا چاہا کیونکہ میں قیدی تھا۔ قیدی رہا تھا اور قیدی کبھی سرخ قالین پر نہیں چل سکتا۔ وہ سرخ قالین سے ارنے بھینسے کی طرح بدکتا ہے۔

شہر والے پرشوق نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی دلہن دیکھنی ہو اور میں یوں نگاہیں آگے بڑھا رہا تھا گویا میں پیدائشی نامرد ہوں اور ان مشتاق نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہندوستان کی قید نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ صرف مجھے خصی کر کے چھوڑ دیا تھا۔

مجھے اس کا احساس سرخ قالین کو دیکھ کر ہوا —— میں ذہنی طور پر، جسمانی طور پر، اخلاقی طور پر، مذہبی طور پر، ہر طرح سے نامرد ہو چکا تھا اور میرے لئے میرے شہر کے لوگوں نے سرخ قالین بچھا رکھے تھے۔ اونچے اونچے گیٹ، سرخ سبز جھنڈیاں، سیلوٹ، بغل گیریاں، بوسے ..... دعائیں ..... یہ سب کیا تھا؟ —— کیوں تھا؟ —— یہ سرخ قالین کس کے لئے بچھا تھا؟ —— کس لئے؟ ——

قید اس وقت شروع نہیں ہوتی جب سپاہی اپنے ہتھیار اتار کر دشمن سے سمجھوتہ کر لیتا ہے بلکہ بے یقینی کا وہ لمحہ اسے قیدی بناتا ہے جب پہلی بار اسے اپنے زورِ بازو پر اعتماد نہیں رہتا۔ اور دشمن کی قوت کا اندازہ لگا کر اس سے بدکتا ہے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں قید ہوا تھا۔

میں اس وقت دیناج پور میں تھا۔ رات بھر گھمسان کی جنگ رہی تھی۔ پو پھٹتے ہی دشمن کے نو ہوائی جہازوں نے ہم پر مسلسل بمباری کی تھی۔ فضا میں گوشت جلنے کی خوشبو تھی۔ نئے حملے سے

پہلے بڑی جاندار خاموشی تھی۔ ہر حملے سے پہلے، ہر بمباری سے پہلے، ہر انسانی رشتہ ٹوٹنے سے پہلے ایسی ہی خاموشی ہوا کرتی ہے۔ عبدالکریم میرے پاس ٹرینچ میں بیٹھا بڑے اطمینان سے اپنے ALL PURPOSE چاقو سے غلیل بنا رہا تھا۔

"عبدالکریم!"

"جی سر!"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں سر۔"

"یہ لکڑی سی تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔"

"کچھ نہیں سر۔ غلیل ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "سندری لکڑی سے بنائی ہے سر۔"

میں چپ ہو گیا۔ ہماری تربیت ہی ایسی تھی کہ میں موت سے دو قدم ادھر ہو کر بھی عبدالکریم سے بے تکلف نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے دل میں دشمن کے ہوائی جہازوں کی گھن گرج تھی۔

میرے کانوں میں مالک شاہ کے پیام تھے۔

میرے وجود میں گھر کی یاد گندی نالی کی طرح رینگ رہی تھی۔

ہر قیمت پر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہ سارا قتل و غارت، یہ لہو کی پیاسی دھرتی، بنگالی لہو کی، مغربی پاکستان کے لہو کی، ہندوستانی سپاہی کے لہو کی پیاسی سرزمین۔ یہ مٹی، ماشیلا کے پھول، سندری کے درخت، اناس کے پودے، کرشن چوڑا کے شگوفے اگا اگا کر بھول بیٹھی تھی یہاں بوڑھی گنگا پہ بہنے والی سبک رو نوکا سے اب گانے کی آواز نہیں آتی تھی۔ اب ہر طرف بم چھوٹتے تھے۔ ہوائی جہازوں کی سوپر سونک چیخیں تھیں۔ کالی ماتا کا ناچ تھا! لہو کا ناچ۔ موت کا ناچ۔ بیرحمی، ظلم کا ناچ۔

لہو کی پیاسی کالی ماتا، سرخ زبان نکالے کھیتوں کو جھلس رہی تھی۔ ناریل اور تاڑ کے درخت منہ کے

بل گر رہے تھے۔ کنیائیں اس کے سراپ سے بن باپوں کے بچے، سوکھے مردار جسموں میں پروان چڑھا رہی تھیں۔ بوڑھی مائیں ہڈیں بھرے ہاتھ لئے جوان بیٹوں کا ماتم کر رہی تھیں۔ جہلم کے نوجوان ناریل اور تاڑ کے درختوں کی طرح گر رہے تھے۔ کٹی ہوئی ٹانگوں والے سپاہی زخموں سے چور وطن سے دور ان لوگوں کو بچانے کیلئے آئے بیٹھے تھے جو اندر ہی اندر پھٹے ہوئے دودھ کی طرح ان سے الگ ہو چکے تھے کالی ماتا کا سراپ روپ دور دور پھیلا تھا۔

ابھی کل تک جو بھائی بھائی تھے اب دشمن تھے۔ ابھی کل تک جو ہم وطن تھے ہم مذہب تھے اب کیا تھے؟

میں نے ڈرتے ڈرتے عبدالکریم کی طرف دیکھا اور آہستہ سے قیدی ہونے سے پہلے ایک سوال کیا۔

"عبدالکریم۔ تمہارا کیا خیال ہے ہم جیت جائیں گے"۔

"جیتنے کا سوال نہیں ہے سر۔ سوال اس بات کا ہے کہ ہمارا بھائی ہم کو پہچانے۔ یہ جان لے کہ ہم دشمن کی طرح اس کے ایمان کو پامال کرنے والا نہیں ہے"۔

"بنگالی ہندوستانیوں کے دوست ہیں"۔

"ہونے دو سر۔ ہم ان کے بھائی! دوست اچھا رشتہ ہے لیکن بھائی اپنا لہو ہے"۔ وہ مسکرانے لگا ——!

مجھے عبدالکریم پر رشک آ رہا تھا کیونکہ میری آزادی کے یہ آخری لمحے تھے۔ میں شکوک و شبہات کی صلیب پر چڑھا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

"عبدالکریم"۔

"جی سر!"

"دشمن کی ہوائی طاقت بہت ہے"۔

"اللہ کی طاقت اس سے بھی زیادہ ہے سر!"

"مانک شاہ چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ہم ہتھیار ڈال دیں"۔

عبدالکریم نے لمحہ بھر کو میری جانب دیکھا۔ شاید اس وقت وہ کوئی گالی دینا چاہتا تھا۔

"سر۔ اس کا دھوکا مت کھاؤ۔ مسلمان یا معاف کرتا ہے یا بدلہ لیتا ہے۔ . . . . تیسرا صورت کوئی نہیں"۔

اس وقت ہوائی حملے کا سائرن بجا۔

عبدالکریم اپنی پوسٹ پر جم گیا۔

لیکن میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور تیسری صورت قبول کر لی۔

میں ہندو فوج سے لڑ سکتا تھا۔ مکتی باہنی سے لڑ سکتا تھا لیکن کالی ماتا کے سراپ سے نہیں بچ سکتا تھا۔ میں بڑی دیر عبدالکریم کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر قیدی پن کے کوئی آثار نہیں تھے۔

بالکل اسی طرح میں دیر تک اپنی اس وردی کو دیکھتا رہتا ہوں جس پر کٹی ہوئی صلیبیں بنی تھیں۔ یہ سیاہ رنگ کے کراس جن میں آدھا سواستیکا اور آدھی صلیب موجود ہے۔ اس سیاہ مہر کے دونوں جانب پی ڈبلیو لکھا ہے۔ ہماری وردیوں کو بڑی خوشی کے ساتھ دشمن نے داغا تھا تاکہ وہ ہمیں بتا سکے کہ وہ ہم پر کس حد تک قابض تھے! مجھے اس مہر نے اس کالے کراس نے، اس آدھے سواستیکا نے مصلوب کیا اور میری مردمی مجھ سے چھین لی۔ میرے اندر کی دھلی دھلائی سفید شخصیت پر جا بجا غلامی کا سیاہ نشان پڑ گیا۔

پی فار پیس۔

ڈبلیو فار وار۔

جنگ اور امن . . . . ایک کالے کراس پر ساتھ بنے ہیں۔ یہ ہر جگہ ساتھ ساتھ ہیں۔ . . .

ہر جگہ امن کے دل میں جنگ کی گھڑی بجتی رہتی ہے۔

پی فار پرزنرز۔

ڈبلیو فار واٹ ؟

پرزنرز آف وار۔

پرزنرز آف واٹ۔

انسان کیا ہے ___ جنگ میں بھی قیدی ___ امن میں بھی قیدی ___ کبھی کالے کی قید کبھی گورے کی ___ کبھی ابلیس کی قید ___ کبھی خدا کی!

میرے پلنگ کے سامنے ۱۹۷۲ء کا کیلنڈر پھڑپھڑا رہا ہے۔

۱۹۷۱ء سے لیکر اس کیلنڈر تک کچھ ایسا فاصلہ نہیں ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے ان سالوں میں کئی صدیاں بیت گئیں۔ کئی مذاہب آ گئے۔ کئی قومیں مٹ گئیں۔ کئی نئے جزیرے پیدا ہو گئے۔ براعظم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ دریاؤں کے رخ مڑ گئے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے رینگ کر کہیں اور جا کھڑے ہوئے۔

انسان بھی کس قدر سخت جان ہے۔ کتنا کچھ سہ جاتا ہے۔ کتنا کچھ برداشت کر لیتا ہے۔ سالوں میں صدیاں ہٹتا ہے اور صدیوں میں ایک انچ آگے نہیں بڑھتا۔ صرف اس جان کے اندر کی ہری بھری شاخ کے ساتھ ان گنت مردہ پتیاں لٹکی رہ جاتی ہیں۔ یہ خشک پتے ہر سمجھوتے ہر برداشت، ہر غم کے بعد اس کی ہری شاخوں سے لپٹے رہتے ہیں اور کوئی خزاں انہیں اڑا کر نہیں لے جاتی۔ سبز شاخ کے مردہ اعضاء ساری عمر اس کے ساتھ رہتے ہیں۔

یتجو فرش پر ٹاکی مار رہی ہے۔ میرے ڈھاکہ جانے سے پہلے بھی وہ اسی طرح اُن ماں جی سے صفائی کیا کرتی تھی۔ اس کی زندگی فرش دھونے، ٹاکی پھیرنے، فلش صاف کرنے، نالیاں اُجلانے میں گزری ہے۔ وہ ہم لوگوں کا اتنا میل کاٹ چکی ہے کہ اب فرقہ ملامتیہ کی طرح اس کی روح آئینے کی طرح شفاف ہو کر بڑے لشکارے مارتی ہے۔

یتجو کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا بڑا فراخدل اور رن چھوڑ قسم کا تھا جب وہ سرائے سے نکلتا تو اس کے سفید کپڑے اور بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر کسی کو بھی شبہ نہ ہوتا کہ وہ یتجو عیسائی کا بیٹا ہے

اور کارپوریشن کی گند گاڑی پہ سارے شہر کا کوڑا ڈھونے جاتا ہے۔

جب تیجو کے بیٹے نے اپنے گھر سے دُور اپنے ماحول سے پرے اپنا نام، مذہب اتہ پتہ تبدیل کر کے ماچھیوں کی ایک لڑکی سے عشق کر لیا تو اسی امیری کے باعث اسے ایک سو روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ صرف یہ رقم لینے اپنے گھر آیا۔ تیجو کو گھر میں ٹاکی پھیرنے، فلش دھونے سے کہاں فرصت تھی کہ وہ گلزار مسیح پہ پہرے بٹھاتی۔ نذیر سبزی فروش سے ایک روز سو روپے ادھار لیکر وہ واپس چلا گیا۔ پورے چار سال بعد واپس لوٹا تو اس بار کارپوریشن کا اصلی چوہڑا لگ رہا تھا۔

تیجو نے گلزار کے بال پکڑ کر پہلے تو دو چار سیدھے ہاتھ کی ماریں۔ پھر بلبلا کر مُنہ سر چُوما۔ منہ ہاتھ دھلایا اور صاف چمکتے کٹورے میں ہمارے گھر کی لسّی پلائی۔ پھر گلزار اور تیجو بڑی دیر تک آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ گلزار کے منہ پہ جھندرے پڑے تھے۔

"اتر گیا چندری ماچھن کا شوق! میں نے تجھے نہیں بتایا کہ یہ اونچی جاتی والے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ پہ تیرا تو جی چاہتا ہے کہ اپنی برادری سے اڑ کر کسی اور سے جا ملے۔ مل گیا تو ماچھیوں سے۔ ملا لیا انہوں نے تجھے اپنے ساتھ"۔

"نہیں"۔

"وہ نذیر میری جان کو الگ روتا ہے۔ میں بھلا گُوہا کوڑا کرنے والی سو روپیہ اسے کہاں سے لا دوں؟"

"دے دوں گا سو روپیہ بھی"۔

"چار سال بعد ماچھن نے دھکا دے کر نکال دیا ناں ــــ" تیجو بار بار وہی قصہ دہرا رہی ہے اپنے بچے کے دھتکارے جانے کا اسے اتنا رنج تھا کہ اس کی جدائی کا سارا روگ بھی اسکے سامنے ابذ ہیچ نظر آ رہا تھا۔

"مجھے دھکے دے کر کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں خود آیا ہوں اپنی مرضی سے"۔

"ہاں۔ اپنی مرضی سے۔ اسے پتہ چل گیا ہو گا تُو ذات کا عیسائی ہے، پیشے کا چُوہڑا"۔

گلزار نے نظریں جھکا لیں۔ وہ بڑی دیر تک اپنی دائیں مونچھ کا ایک، کونہ دانتوں میں لے کر کچھ سوچتا رہا پھر بڑی نحیف آواز میں بولا:

"ہاں۔ پتہ چل گیا تھا"۔

اب تیجو کے اندر خوشی کا فوارہ پھوٹ بہا جیسے اُن دیکھی بہو کے خلاف کورٹ میں وہ کیس جیت گئی ہو۔ جھٹ گلزار کی کمر میں دھموکا مار کر بولی: "دیکھا۔ دیکھا ــــ زنانی کے پیچھے ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ دیکھا کیسے دھکے مار کر نکالا اس نے"۔

"میں تجھے بار بار بتا رہا ہوں اس نے مجھے نہیں نکالا۔ میں خود آیا ہوں پر تُو سنے بھی"۔

ایک بار پھر ٹلے کی ہتھی کی طرح تیجو کا وجود لٹک گیا۔

"سچ سچ بتا دے تو مان لوں میں"۔

بڑی دیر کے بعد گلزار نے ایک سسکی بھری: "اچھی بھلی گزر رہی تھی ماں..... چار سال گزر گئے..... آدمی کی عمر ہی کتنی ہے۔ چالیس برس اور گزر جاتے..... پر"۔

"پر ــــ پر کیا؟"

"وہ فیملی پلاننگ والوں سے چھلّا لے آئی تھی۔ میں چار سال یہی سمجھتا رہا کہ اسے بچے کا شوق نہیں میرا ہی شوق ہے بس ــــ پچھلی جمعرات کو....."

گلزار کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو گرنے کو تیار کھڑے تھے۔

"وہ اپنی بہن کا بچہ نہلا رہی تھی۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ میں نے اسے دو چار بار بلایا۔ رشیدہ آئی نہیں میں نے غصے سے کہا: "اتنا شوق ہے بچے کا تو اپنا بنا لے"..... کوئی ایک گھڑی ہوتی ہے ماں جب مرد اور زنانی آمنے سامنے ہو جاتے ہیں۔ اصلی روپ میں۔ وہ کہنے لگی۔ اب جو میں سارے دن کی باتیں سنتی ہوں۔ اس بے دوش کو کیوں باتیں سننی پڑیں جگ کی۔ میں اپنے بچے کو اتنے دکھ کیوں دوں۔ مجھے اس سے اتنا پیار ہے۔ اتنا پیار ہے کہ....."

تیجو کا سارا وجود برف کی مانند ٹھنڈا پڑ گیا۔

رات تک رشیدہ روتی رہی۔ بار بار ہاتھ جوڑ کر کہتی: "دیکھ مجھے تیری ضرورت ہے تجھے میری بچہ بے چارہ کیا کیا کرے گا ایسے ظالموں میں آکر۔" پہلی بار مجھے سمجھ آئی کہ وہ سب کچھ جانتی ہے۔ اس کے گھروالے۔ اس کے برادری والے ..... میں نے دل میں سوچا کہ یہ اپنے بچے کے پیار میں پوری اتر سکتی ہے تو میں اس کے پیار میں پورا کیوں نہیں اتر سکتا۔ میری خاطر کیوں مفت کی باتیں سنتی پھرے ـــــ کیوں اپنے بچے سے جدا ہے بے چاری۔"

"اس کمینی کو بے چاری نہ کہہ۔"

"آدھی رات کو میں اٹھا۔ وہ روتے روتے سو گئی تھی۔ بڑی دیر میں دبدھا میں رہا۔ پھر جی نے سوچا یہ کیوں سمجھوتے کرتی پھرے میرے لئے۔ میں ہی کیوں نہ آخری بار سمجھوتہ کر لوں کارپوریشن کی گند گاڑی کے ساتھ۔"

وہ آہستہ سے اٹھا اور جھاڑو ٹوکری لے کر تیجو کے پاس سے اٹھ گیا۔

گلزار کے آتے ہی سو روپے مانگنے والا سبزی فروش بھی آگیا۔ گلزار کے پاس ایک ٹوٹا ہوا دل تو تھا لیکن اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ بڑی دیر تک تنکے کے ساتھ زمین کھودتا رہا۔ پھر نذیر نے اسے ماں بہن کی گالیاں دینی شروع کر دیں۔

نذیر ابھر ابھر کر کہہ رہا تھا:

"رشیدہ ماچھن سے ادھر کوئی ماں تجھے نہیں ملتی تھی کم ذات ـــــ کوڑھ کرلی ہو کر شہتیروں سے جھپیاں ڈالنے کا نتیجہ دیکھا۔ جونہی انہیں پتہ چلا کیسے چونڑوں پہ ڈنڈے مار کر نکال کہ گیا ـــ تجھے تو دس سال کی قید ہونی چاہیئے کم بخت۔"

گلزار مسکراتا ہوا اٹھا مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر نذیر کے کلّے پر مُکہ مار کر بولا: "دھی دیا خصما سو روپے ہی ہیں ناں۔ دیدوں گا مرا کیوں جاتا ہے۔"

نذیر اسوقت چپ چاپ چلا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اردگرد کسی کو پتہ چلے کہ گلزار نے اسے مارا ہے لیکن بات ساری سرائے میں یوں پھیلی کہ پھیلتے ہوئے دھانوں میں سے چونچ چونچ بھر ان گنت چڑیاں چاروں کھونٹ لے جائیں۔ نذیر کو اس کے دوستوں نے خوب ٹھٹھہ کیا۔ واہ بھئی! اچھا جوان ہے تو بھی۔ اچوہڑے سے مُکہ کھا آیا۔ سارا دن نذیر کھولتا رہا۔ آدھی رات کو رشیدہ کا گلزار تیجو کا گلزار مسیح الانی چارپائی پر آنسو بہاتا اوندھا لیٹا سو گیا تو نذیر منہ پر کپڑا باندھے آیا اور اس چابکدستی سے گلزار کی پیٹھ میں چھرا گھونپا کہ آنکھیں کھولتے کھولتے گلزار کے دیدوں کی ڈلک ماری گئی اور وہ گند گاڑی جیسا بے وقعت ہو گیا۔

جس روز میں ڈھاکہ گیا ہوں اس مقدمے کی پیروی کا پہلا دن تھا۔

تیجو کے ہاتھ میں نذیر کی ٹارچ تھی۔ وہ اسے جلدی میں گلزار کے پلنگ پر ہی بھول گیا تھا۔

وہ بار بار ٹارچ مجھے دکھا کر کہتی:

"سرکار! کیسے مُکرے گا نذیر۔ میں نے عدالت میں جب یہ ٹارچ پیش کی تو پھر کیسے مکرے گا۔ مجسٹریٹ پھانسی لگا دے گا کُتّے پیر۔"

تیجو کو علم نہ تھا کہ قانون اور انصاف دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ایک سے دوسرے تک کوئی ایسا پل آج تک تعمیر نہیں ہوا جس پر ہر طبقے کا آدمی چل کر اپنی منزل پا لے۔ ڈھاکہ سے دو ایک خطوں میں تیجو کے مقدمے کے متعلق میں نے پوچھا تھا لیکن پتہ چلا کہ پیشیاں چل رہی تھیں۔

میرے سامنے ۱۹۷۲ء کا کیلنڈر پھڑپھڑا رہا ہے اور تیجو حسب سابق ٹاکی مار رہی ہے۔

"بچیاں آلیا۔ تیرے بغیر تو یہ گھر کال کوٹھڑی تھا۔ کرم کیا کرنی والے نے۔ جو تیرا منہ دکھایا۔"

"تیجو۔ تیرے گلنار کا کیا بنا۔"

تیجو نے ٹاکی چھوڑ دی اور لمبا سانس بھر کر بولی۔ "مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے سرکار۔ ہر جی روٹی بھی کھاتا ہے۔ ہنستا بولتا بھی ہے۔ کون مرتا ہے مرنے والے کے ساتھ۔"

"مقدمے کا کیا بنا تیجو۔"

"بننا کیا تھا سرکار۔ سخت آدمی کا ستی یہاں سو ہوتا ہے۔"

تیجو لمبی سانس لے کر چپ ہو گئی۔

"کیا ہوا مقدمے کا۔ نذیر کو پھانسی کا حکم ہوا کہ تو نے اسے معاف کر دیا۔

"کہاں سرکار۔ میں تو اسے جنم جنم معاف نہ کروں پر میں نے سمجھوتہ کر لیا نذیر کے ساتھ۔ اس نے دھمکی جو ایسی دی تھی"۔

"کیسی دھمکی"۔

"نذیر ساری سرائے میں کہتا پھرتا تھا۔ اب گلزار کو ختم کیا دوسری بار سردارے کو ختم کروں گا..... مرنے والا تو مر گیا۔ اب سردارے سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ بدلہ لینے کی مجھ میں شہ نہیں۔ معاف میرا دل نہیں کرتا۔ میں سمجھوتہ نہ کرتی تو کیا کرتی سرکار"۔

میں چپ ہو گیا۔

سمجھوتہ کرنے والی آہستہ آہستہ ٹاکی پھیرتی رہی۔

میرے سامنے گلزار کا سارا وجود گھوم رہا تھا۔ سفید سفید چادر پہنے گلے میں کنٹھا اور سونے کے بٹن لگائے ایک بار وہ کرسمس کے دن مجھے سلام کرنے آیا تھا۔ گلزار جو بڑا رن چھوڑ سامنے کی طرح اکڑا ہوا جھاڑو کے تنکے جیسا سخت تھا۔ دوسرے بچے کی جان بچانے کو ماں پہلے بچے کا قتل پی گئی۔

یہ سمجھوتہ کیا چیز ہے!

اپنی ناطاقتی کا احساس ہے۔

کہ بچے کھچے سرمایہ کا تحفظ!

وہ کونسی چیز ہے جو انسان کو سمجھوتے پر مجبور کرتی ہے۔

کون سی چیز؟

کونسی طاقت؟

کونسا خوف؟

جس روز صبح کے تین بجے ہماری بیرک کی تلاشی ہوئی اور عبدالکریم کے ہاتھوں میں بنگالن کا

دیا ہوا رومال نکلا۔ اس سے کوئی پندرہ دن پہلے سے ہماری بیرک میں آہستہ آہستہ کسی کسی لمحے امید کا نوزائیدہ بچہ رونے لگتا جس طرح کسی ہلاکو خاں کے دربار میں پہلی بار کسی درویش کی آمد ہو۔ جونہی ہماری نظریں ایکدوسرے سے ٹکراتیں گویا چقماق رگڑتے اور ننھی ننھی چنگاریاں چھڑنے لگتیں۔

بیرک میں ہم آٹھ آدمی تھے۔ ہم سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے کونے عموماً پیلے رنگ کی گِد سے بھرے رہتے اور ہمارے ہونٹوں پر آٹے جیسی خشکی نظر آتی۔ ہمارے چہرے بھوکے کتوں کی طرح چیں چیں کرتے نظر آتے۔ پوٹھوہار کا میاں خاں بھی ہم سے مختلف نہ تھا۔ گو وہ صبح سویرے قرآن خوانی کرتا اور اپنی نمازیں باقاعدگی سے پڑھتا۔ لیکن عبدالکریم ہم سب سے مختلف تھا۔ کئی مہینے سے وہ نہایا نہیں تھا لیکن اس کا چہرہ اس کے ہاتھ اس کی آنکھیں اجلی تھیں۔

میاں خاں اتنے منہ اندھیرے قرآن کی تلاوت شروع کر دیتا کہ ابھی حروف دیکھنے کیلئے روشنی نہ ہوتی لیکن شاید وہ اپنے ذہن سے کھرچ کھرچ کر یادداشت کے بھروسے پر آیات پڑھا کرتا تھا۔

ہم سب شبخون مارنے والے جانوروں کی طرح اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے فرار ہو جانے کا خواب دیکھنے سے ڈرتے ہوئے اس کی آواز سنتے رہتے۔ ہر لحظہ کچھ ہو جانے کی آرزو رہتی۔ کوئی کرشمہ، کوئی کرامت، کوئی معجزہ پیش آ جانے کی خواہش بدن پر گیہوں کے سٹے کی طرح پڑی رہتی رینگتی رہتی۔ کبھی لگتا یہ خواہش دل سے اٹھی ہے کبھی لگتا کان کی لو کے قریب کہیں سے صدا آئی ہے۔ کبھی پنڈلیوں میں اس آرزو کی دستک سنائی دیتی۔

اور میاں خاں آہستہ آہستہ کہتا رہتا:

"اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتار ہی دیں اور ان سے مردے بھی باتیں کریں اور زندہ کھڑا کر دیں تب بھی یہ لوگ ایمان لانیوالے نہیں بجز آنکہ خدا چاہے"۔

پھر آہستہ آہستہ دل باغی ہونے لگتا۔ ایسا دل جو ایک قیدی جسم میں رہ کر ہی باغی ہو سکتا ہے

دل اپنی چکی میں ہمیں پیسنے لگتا اور پوچھتا: "بتاؤ۔ تمہارا خدا کب تک نہ چاہے گا۔"

کب تک ــــ کب تک ــــ؟

جب جسم قیدی ہو تو دل کو سمجھانا آسان نہیں رہتا۔

ایسے لمحوں میں جب دشمن کے بوٹوں کی آواز آ رہی ہوتی۔ خدا سے سمجھوتہ کرنے کو جی نہ چاہتا۔ وہ اتنی دور تھا۔ اور انسان کفر کی باتوں سے زیادہ تسلی حاصل کر سکتا تھا۔

وہ مشرق اور مغرب کا مالک تھا۔ اس کی تو ساری دنیا تھی۔ پھر ہم ایک چھوٹی سی بیرک میں رہنے والوں کے ساتھ اس کا کوئی خاص رشتہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ اسے ہمارا دل رکھنے، ہمارا دل جیتنے کی اتنی کیا ضرورت تھی۔ ہم اس کے رحم کے بغیر بے دست و پا تھے لیکن اسے تو کوئی ایسی مشکل نہ تھی۔ وہ تو کسی کا محتاج نہ تھا۔ نہ میرا نہ پوٹھوہاری میاں خان کا نہ عبدالکریم کا۔

آہستہ آہستہ صبح کا تارا ڈوبنے لگتا۔ میاں خاں کی آواز بے رنگ ہوتی جاتی۔ . . . وہی خدا جو رات کی تنہائی میں اندھیرے کی طرح قریب رہتا آہستہ آہستہ دور ہوتا جاتا۔ لاتعلق ــــ بے پروا ــــ خدا تک ہماری رسائی نہ تھی۔ ہماری رسائی تو ان افسروں تک نہ ہو سکی جنہوں نے ہم سے ہتھیار ڈلوا دیئے۔ ہماری رسائی تو ان لیڈروں تک نہ ہو سکی جنہوں نے ہماری قسمت کا فیصلہ کیا۔ ہم تو ان ملکوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے جن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی رسیاں تھیں۔ پھر خدا تک کوئی کیسے پہنچتا۔ کیا خدا کو بھی اس سازش کا علم نہیں تھا۔

جس رات صبح تین بجے تلاشی ہوئی اسی رات کو کپتان فرید اور اس کے تین سپاہی فرار ہوئے۔ اس واقعے سے پورے پندرہ دن پہلے ہماری بیرک میں عجیب گم سم خوشی تھی۔ ہمارے دماغوں پر بخار کی سی کیفیت تھی۔ دوپہر کے وقت ارہر کی ابلی ہوئی دال کے ساتھ روٹیاں آئیں تو دیر تک آسیب زدہ شکلوں سے کبھی ہم کھانے کو دیکھتے اور کبھی ایکدوسرے کا چہرہ تکتے ۔ اس روز ہم جنون کی آخری سرحدوں پر زندہ تھے۔ کبھی کبھی ہمیں لگتا" ہم سب اتنے لمبے اور وجیہ ہیں کہ لیفٹیننٹ ہربنس اور اس کے سپاہی ہمیں سب بالشتیے نظر آنے لگتے۔ کبھی ہم سب اتنے بونے

نظر آتے کہ ہربنس اور اس کے سپاہی چھت تک اونچے دکھائی پڑتے اور اپنا وجود بونوں جیسا نظر آتا۔

دماغ پر بخار کی سی کیفیت تھی EUPHORIA کی کیفیت! ایسا بخار جس میں کبھی کبھی دل و دماغ سن ہو جاتے اور پھر کبھی کان کی لوئیں جلنے لگتیں اور پپوٹے بھاری ہو جاتے۔ جتنے دن کپتان فرید اور تین سپاہی فرار نہیں ہو گئے ہم سات آدمی ۔ بہم وولٹ کی ننگی تاریں تھیں۔

لیکن عبدالکریم ہم سے مختلف تھا۔

وہ ارہر کی دال اور باسی روٹی کھا کر اٹھا تو سیٹی بجا رہا تھا۔ جب سے وہ قیدی ہوا تھا اسے سیٹی بجانی آ گئی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز سن کر ہمیشہ لگتا گویا وہ آزاد ہے اور کسی بجرے پر سوار ندی پر بہتا جا رہا ہے۔

ساڑھے دس بجے کے قریب اسی رات جب ــــ تلاشی ہوئی اور کیپٹن فرید فرار ہوا اسی رات ساڑھے دس بجے گارڈ کا سپاہی ہماری بیرک میں آیا:

"یہ سیٹی کون بجا رہا ہے؟"

"میں جی۔ عبدالکریم!"

"نمبر؟"

"نمبر باسٹھ سر!"

"کیوں سیٹی بجا رہے ہو؟"

"بس جی۔ ایسے ہی۔"

سپاہی نے دانت نکال کر دھسے کہا: "تمہیں کتنی بار کہا ہے ایسے ہی کچھ مت کیا کرو۔ . . . . سمجھے!"

"اچھا جی۔"

عبدالکریم خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ گارڈ کا سپاہی دروازے تک جا کر رک گیا۔

"نمبر باسٹھ"

"جی صاحب"

"لتا منگیشکر کا نام سنا ہے تم نے ــــــ ؟"

"جی سر"

"یہ گانا سنا ہے ــــ آئے گا آنے والا ــــــ"

"جی صاحب"

"ذرا سیٹی بجاؤ اس دھن پر ــــ لیکن جب میں کہوں فوراً بند کر دینا"

"یس سر"

عبدالکریم دشمن کے سپاہی کو خوش کرنے کیلئے کافی دیر تک سیٹی بجاتا رہا۔

آئے گا آنے والا ــــــ

آئے گا ــــ آئے گا ــــ آئے گا ــــــ

بستروں پر تختوں کی طرح لیٹے ہوئے حملہ کرنیوالے چوکس چونکیل جانوروں کی طرح پنجے سکوڑے ہم سب اپنی سانسوں کا بوجھ نتھنوں پر محسوس کرتے رہے۔ ہمیں وہ لوگ یاد آنے لگے جو پاکستان میں ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ اس لمحے ہم قیدی نہ رہے۔ ہمارا اپنا کوئی غم نہ رہا۔ خود ترسی کی کیفیت مٹ گئی۔ غم کا دھارا گویا نشیب کی جگہ فراز کی جانب چلنے لگا۔ اس گیت نے ہمارا اپنا غم ذلتیں، رسوائیاں، بھوک، تنگدستی، ظلم، بے غیرتی، بے عزتی کو اپنے میں سمو لیا۔ اور اس پر ان لوگوں کا غم غالب آ گیا جو ہمارے لئے ترس رہے تھے ــــ جو ہماری راہ دیکھ رہے تھے ــــ ہمارے لئے نیم بسمل تھے۔ گویہ غم معکوس تھا لیکن ہمارے غم سے بھی زیادہ جان لیوا تھا۔

واہگہ کا راستہ اب بہت سرسبز ہے۔ دونوں جانب گھنے گھنے کیکر کے بڑے بڑے جھاڑ ہیں۔ چاولوں کے کھیت اور کھیتوں میں اگی ہوئی ٹاہلیاں ہیں۔ جس وقت میں اس سڑک پر سے گزرا

تو معاً مجھے خیال آیا کہ میں اپنی بے داغ دھرتی کیلئے کونسی سوغات لے کر آیا ہوں ؟ ــــــ میری قمیض پر تو دھوبی مارک تھے۔ برص کے داغ تھے۔ میں کیسا مسافر تھا جو اپنے وطن کے لئے داغدار قمیض کے علاوہ اور کچھ نہ لا سکا ؟

پی فار پیس

ڈبلیو فار وار

دونوں ایک ہی صلیب کے حصے تھے۔

وہ سارے پھول جو سرخ قالین پر چلتے وقت مجھ پر گرے ..... کیسے پھول تھے کہ مجھ پر گرتے ہی رہے اور میں ہی قبر کی مانند ان کو چھونے سے قاصر رہا۔ رنگین جھنڈیاں دو رویہ اکتوبر کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنی وردی کو دیکھا ــــ اپنے ہم وطنوں کے لباس کو دیکھا اور میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ مرد کو نامرد کرنے والا اس کا جسم نہیں ہوتا اس کی روح ہوتی ہے۔ جب مرد پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر اپنی کشتی کی پتوار کسی اور کو پکڑا دیتا ہے۔ جب وہ اپنے فیصلے، اپنی محبتیں، اپنی نفرتیں سمجھوتے کے عوض بیچ ڈالتا ہے۔ جب ہر طرف سے ALL WELL کا کاشن سن کر اس کے کان جنگل کے گیدڑ کی طرح کھڑے نہیں ہوتے تو مرد کے لہو میں ایک کیمیکل ردِعمل ہوتا ہے۔ سمجھوتے کا CATALYST اس لہو کی خاصیت بدل دیتا ہے اور وہ نامرد ہو جاتا ہے۔

جب جاگتے رہنے کے باوجود وہ سویا ہوا ہو۔

جب چلتے پھرتے ہوئے وہ ٹس سے مس نہ ہو۔

جب وہ مر چکا ہو لیکن زندہ رہے۔

تو قوتِ مردمی آخری سانس بن کر اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

ہمیں خصی کرنے میں ہندوستان کو کچھ اتنی زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ ہتھیار ڈالنے سے کچھ دیر بعد ہم سب مر چکے تھے جیسے پھول ٹوٹنے کے بعد بہت دیر تک شگفتہ رہتے ہیں اور کسی کو

احساس نہیں ہوتا کہ وہ مر چکے ہیں۔ ہم بھی تر و تازہ رہے۔ کھاتے پیتے رہے اور زندہ رہے۔

جس رات پورے تین بجے دوبارہ تلاشی ہوئی اس سے کچھ دن پہلے کی بات ہے ہندوستان کے تمام جنگی کیمپوں میں شام اتر رہی تھی۔ یہ شام کا مزاج ہے کہ اپنے ساتھ دھندلکے، ٹھہراؤ، خاموشی اور گھر کو واپسی کا تصور لے کر آتی ہے۔ میں سلاخوں والی کھڑکی سے گھر لوٹتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے چڑیاں غول در غول گئیں کیونکہ چڑیاں اندھیرے میں گھر لوٹنے سے ڈرتی ہیں۔ پھر کوے ہوائی جہازوں جیسی فورمیشن میں بسیرے کیلئے لوٹے۔ پھر کالی کلیچوں کی ایک ڈار گئی اور آخر میں دھبوں کی مانند سفید سفید رنگ کے پرندے گئے نہ جانے ان سب کا کونسا بسیرا تھا۔ یہ سب اتنی آزادی کے باوجود اپنے اپنے گھروں سے بندھے تھے۔ وہاں پہنچنے پر مجبور تھے۔ انسان بھی آزادی کی شدید خواہش کے باوجود اپنے وطن اپنے شہر اپنے گھر سے بندھا ہے۔

اس کے بعد شفق کا منظر بجھ گیا۔ کاشی کی جانب سے غول در غول بادل آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیروں میں پانی کی بوندیں کسی کنواری کے آنسوؤں کی طرح برسنے لگیں۔

کیپٹن فرید اس وقت چوکنے جانور کی مانند چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ اسکے فیصلے کی گھڑیاں کاشی سے آنیوالے بادلوں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

عبدالکریم نے مری ہوئی آواز میں کہا: "یہ خبر ہے اجبار کی۔"

"تم چپ کرو عبدالکریم۔"

"لیس سر۔"

عبدالکریم خاموش ہو گیا لیکن ٹین کی چھت بارش کی بوندوں سے ٹپاٹپ بول رہی تھی۔ غالباً ہماری اکلوتی بیرک ایسی تھی جس میں آفیسر اور رینک کے آدمی اکٹھے تھے۔ ورنہ ہندوستانیوں نے سپاہیوں اور آفیسروں کو علیحدہ علیحدہ کر کے دونوں کی جذباتی زندگی کو مجروح کر رکھا تھا۔ یہ بھی اس لئے ہوا کہ آفیسر کے کیمپ کی چھت ایک رات اچانک گر پڑی اور انہیں ہمیں ادھر ادھر بانٹنا پڑا۔

"آج کونسی تاریخ ہے؟" میاں خاں نے بڑی دیر بعد سوال کیا۔

"تاریخ پوچھنے سے کونسا فرق پڑتا ہے۔ ان بیرکوں میں رہنے والوں کو صرف ایک تاریخ یاد ہے۔ سترہ دسمبر ۱۹۷۱ء۔"

سب خاموش ہو گئے۔

لیکن عبدالکریم سیٹی بجانے لگا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی میں کوئل جیسی لہکتی سیٹی۔

ہم سب سترہ تاریخ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ کھلی آنکھوں میں اپنے سمجھوتے کا دن ٹنگا تھا شعب ابی طالب سے اٹھنے والی چیخیں ہم سب کے اندر منجمد ہو گئی تھیں۔ ہم سب قطار در قطار فاتح کے حضور کھڑے تھے۔ ہمارے افسروں کے کندھوں پر سے ان کے ملٹری سٹار، برسوں کی محنت کے بعد حاصل کئے گئے اعزاز، بیدردی سے کھینچ کھانچ کر پھینکے جا رہے تھے۔ فوجی لوگ ساری ساری زندگیاں ان ہی ستاروں، ان ہی اعزازوں کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ ہمارے کرنل۔ ہمارے جنرل یتیم بچوں کی مانند رحم کی آرزو دل میں لئے لب بھینچے کھڑے تھے۔

ہم سب کے ہونٹ سفید تھے۔ دل ساکت تھے۔ سب کی نبضیں خاموش تھیں۔ ہم سب سمجھوتے کا دن منا رہے تھے۔ اندر ہی اندر مر رہے تھے۔ نامرد ہو رہے تھے۔

ذلت کی لہریں قطار در قطار کھڑے سپاہیوں کو روند رہی تھیں۔ ہمارے لہو کا خمیر بدل رہا تھا۔ اس کے ردِ عمل مختلف تھے۔ اس کا رنگ اس کا مزہ بدل چکا تھا۔ یہ متعفن نالی کی طرح رک رک کر چل رہا تھا اور ہم سب کھڑے تھے۔ گویا یہ بریکن ہیڈ ڈرل ہو۔ ابھی ابھی جہاز کے عرشے سے پھسل کر ہمیں ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہہ میں ڈوب کر بہادری اور جانبازی کی ایک بہت بڑی روایت چھوڑ جانا ہو۔

انسان مرنے سے پہلے، ذلت سے پہلے، بربادی اور تباہی سے ہمکنار ہوتے ہوئے ہمیشہ معجزوں کی آرزو میں مرتا رہا ہے۔ ہمیں بھی یقین نہیں تھا کہ ابھی چند گھنٹے بعد ہم اجنبی سپاہیوں کے ساتھ بغیر ہتھیاروں کے، بند بسوں میں مختلف کیمپوں میں بھیج دیئے جائیں گے اور پھر خاردار تاروں کے پیچھے ہمیں قدم قدم پر نت نئے دھوبی مارکوں سے داغا جائے گا۔

پی فار پیس

ڈبلیو فار وار

ہمیشہ ساتھ ساتھ۔ سیامی توام بچوں کی طرح۔

اسوقت جب کیپٹن فرید اپنے دل میں کاشی کے بادلوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور عبدالکریم کی سیٹی آخری پنچم کو چھو رہی تھی۔ لیفٹیننٹ ہربنس داخل ہوا۔

"تم سب کی رپورٹ کی ہے حوالدار بھاٹیہ نے"۔

ہم سب خاموش رہے کیونکہ قیدی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔

"تم سب کی رپورٹ کی ہے حوالدار بھاٹیہ نے"۔

کیپٹن فرید جو دیوار کے ساتھ لگا بادلوں کو شام کی آخری روشنی میں دیکھ رہا تھا، انگریزی میں بولا:

"کیسی رپورٹ"۔

"تم سب آدھی آدھی رات تک باتیں کرتے ہو۔ سازشیں کرتے ہو۔ منصوبے بناتے ہو"۔

ایک سیکنڈ کے اٹھارہویں حصے میں کیپٹن فرید نے ان تین سپاہیوں سے آنکھیں ملائیں جو اس کی کمپنی کے آدمی نہیں تھے لیکن اس کے ساتھ مفرور ہونیوالے تھے۔

میاں خاں نے گلا صاف کیا اور پوٹھوہاری لہجہ میں بولا:

"سر۔ ہماری کیا باتیں ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان عورتوں اور بچوں کی باتیں کر لیں گے جو ہم سے میلوں دور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس ملک کی باتیں کر لیں گے جو اَب ہمارا ملک نہیں ..... زیادہ سے زیادہ ہم اس خدا کی باتیں کر لیں گے جس کا نصیحت ہم کو سمجھ نہیں آتا ــــ فی الفور"۔

ہربنس نے اپنی بندوق کا بینٹ کیپٹن فرید کی کالربون پر مارتے ہوئے کہا:

ALL OF YOU FILE

ہم نے اپنی ٹریننگ کے زور پر جلدی سے لائن بنائی۔

سکھ سپاہی نے کاشن دیا۔

"مارچ ــــ لفٹ رائٹ ..... لفٹ رائٹ ....."

ہم میکہ سے باہر نکل آئے۔

بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے سینوں کے پاس ٹھنڈی ٹھنڈی رائفلوں کے دہانے چمک رہے تھے شام گہری ہو چکی تھی اور کیمپ کی بتیاں بارش میں اور بھی چمک رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر جیپیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ ہم سے کافی دور دھوبی مارک لگے کچھ اور سپاہی مارچ کرتے ہوئے جا رہے تھے!

لیفٹیننٹ ہربنس ہمارے سامنے تھا اور دو رویہ ہمارے ساتھ ساتھ جو سپاہی مارچ کر رہے تھے ان کے ہاتھ لبلبی پر تھے اور بندوقوں کے منہ ہماری جانب تھے۔ املی کے درختوں کے پاس پہنچکر ہمیں رکنے کا کاشن ملا۔ پھر ہمیں سیدھی لائن بنانے کا حکم دیا گیا۔

میاں خاں اب اونچی آواز میں سورۂ یٰسین پڑھ رہا تھا۔

"تم ہمارے خلاف کیا بڑبڑا رہے ہو نمبر ۱۴۹ NI"۔

"جناب میں سورۃ پڑھ رہا ہوں"۔

"ہماری صورت کو تم کافی نہیں پڑھ چکے ہو ڈھاکہ میں ــــ کہو تو لاہور میں بھی جلوہ دکھا دیں"۔

لیفٹیننٹ ہربنس اور اس کے سپاہی بڑے کھل کر ہنسے۔

"سنو۔ تم سب ہند سرکار کے خلاف آدھی آدھی رات کو بیٹھ کر باتیں کرتے ہو۔ DAMN IT ہمارا لاکھوں روپیہ تم پر خرچ ہو رہا ہے اور تم ہمارے ردیہ میں کیڑے ڈالتے ہو۔ حوالدار بھاٹیہ نے یہ سب کچھ لکھ بھیجا ہے ہیڈ کوارٹر کو۔ تم کہتے ہو پاکستان سے آنیوالے پارسلوں کو ہم چرا لیتے ہیں..... BASTARDS تم وشال ہند سرکار کے خلاف ایسی باتیں کرنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہو؟"

ہربنس بولتا چلا گیا۔

پھر کتوں کی آواز نزدیک ہوتی گئی۔

اور نزدیک —— اور بھی نزدیک —— بالکل نزدیک۔

پھر ان کتوں کو لانے والے سپاہیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹھنڈی ہوا املی کی ٹہنیاں جھلانے لگیں اور پانی کی بوندیں ہربنس کے چہرے پر بڑے تواتر سے گرنے لگیں۔ سارے گراؤنڈ میں خوف کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ جانے وہ بل ٹیریئر تھے کہ السیشین۔ جانے وہ دس تھے کہ بیس۔ جانے وہ رسیوں سنگلوں سے بندھے تھے کہ نہیں۔ بس گہری شام میں چمکتے ہوئے کھلے جبڑے تھے۔ بھیگی بھیگی جھری پوستین تیز ناخنوں والے پنجے اور بھیڑیوں جیسی چیر پھاڑ دینے والی خوف ناک آوازیں تھیں۔

سپاہی کو اپنے ہتھیاروں پر ایسا ہی بھروسہ ہوتا ہے جیسا وہ اپنے مورال اپنی مردی اور اپنے افسر پر کرتا ہے۔ ان سب چیزوں کو ملا کر سپاہی کا حوصلہ، اس کی بہادری، اس کی جوانمردی بنتی ہے۔ اس وقت ہم ایک ایسی طوائف کی طرح محسوس کر رہے تھے جو اپنے سازندوں، میک اپ کے سامان اور خوبصورت لباس سے بچھڑ گئی ہو۔

ہم خالی ہاتھ خالی ذہن تھے۔

ہم نہ بہادر تھے نہ بزدل۔

ہم بس کھڑے تھے۔ کچھ اپنے اندر خوف سے سکڑے ہوئے اور کچھ اپنے وجود سے باہر اپنے وجود پر گھن کھائے ہوئے۔

نامردی کا بھی ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ بے اعتمادی، کم حوصلگی اور خوف کا باربط سلسلہ، گزشتہ سے پیوستہ۔ ہمارے فیصلے ہمارے نہ تھے۔ مرد وہ ہوتا ہے جو اپنے فیصلے سے زندہ رہتا ہے۔ اپنے فیصلے سے مر جاتا ہے۔ ہم نہ زندہ رہنے پر قادر تھے نہ مر جانے کے قابل۔ ہم سنگ میل کی طرح کہیں راہ میں کھڑے تھے۔ بے حوصلہ، مٹے ہوئے نقوش لئے۔

ہم ہربنس کے سامنے کھڑے تھے جو اس وقت بارش میں جیک لیمین کی طرح نظر آ رہا تھا۔

وہ بڑے ملائم رخساروں والا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر کسی ہندو استری کی چھاپ تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ امرد پرستی کا نو عمری سے شکار رہا ہو اور ہمیشہ مفعول کا کردار ادا کرتا رہا ہو۔ اسکے نازک لمبے ہاتھوں میں نرت کی سی کیفیت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بچپن میں اتنی بار کرشن کنہیا کا ناچ ناچا ہو کہ اب اس کی چال ڈھال آنا جانا سب ایک مرلی بجانے والے سے مشابہ تھے۔ جنگ، سختی، درشتی، بدکلامی، سب اس کی ٹریننگ کا نتیجہ تھی۔ ان چیزوں کا ہربنس کھنہ کی روح سے کوئی تعلق نہ تھا۔

وہ املی کے درخت تلے کھڑا تھا۔ بارش سیدھی اس پر نہیں پڑ رہی تھی لیکن پتوں سے پھسل کر جو بوندیں اس کے چہرے پر گرتیں وہ اس کی مونچھوں میں پھنس جاتیں۔ اتنے ملائم رخساروں پر اتنی گھنی مونچھیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔

وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ فاتح کی سرگرمی کے ساتھ۔

"تمہیں پھر ایسی باتیں کہنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ تم لوگ وہ ختنہ شدہ کتے ہو جو اپنی کسی غلطی سے کچھ نہیں سیکھتے۔ اگر سیکھ سکتے تو مغل DYNASTY کا یوں DOWNFALL ہوتا نہ تم نے انگریزوں کو ہندوستان میں گھسنے دیا۔ پہلی غلطی! تم نے پاکستان بنایا۔ دوسری غلطی! تم نے مشرقی پاکستان کو آزادی نہ دی۔ تیسری غلطی! —— لیکن نہیں۔ تم کو اگر سو بار سکھایا جائے تو بھی تم کچھ نہیں سیکھو گے۔ ختنہ شدہ کتا کبھی کچھ نہیں سیکھتا۔"

یکدم وہ چپ ہو گیا۔

صرف بارش کی آواز آتی رہی۔ بہت دور بیرکوں کی طرف ایک فائر کی آواز بلند ہوئی۔ ہم نے گردنیں موڑ کر دیکھنا چاہا لیکن موت کے ڈر سے ایسا نہ کر سکے۔ اس فائر کے ساتھ ہی دور کتوں کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ اکٹھے دس بیس کتے چھوٹی بڑی کرخت آواز میں بھونکنے لگے۔

بارش اور بھی تیز ہو گئی۔

ہمارے سروں پر جوتوں میں ہمارے دھوبی مارکس پر سردیوں کی یخ بارش پڑنے لگی۔

پھر کسی نے کاشن دیا اور کتے یکبار ہم پر جھپٹے۔

بارک دور تھی اور ـــــ آسمان دُور تر۔

بارش پھر تواتر سے برسنے لگی تھی۔ بیرک کی بتیاں روشن تھیں اور کاشی کی جانب سے ہوائیں آنے لگی تھیں۔ ہربنس اور اس کے سپاہی ہنس رہے تھے۔

کتے ہماری وردیاں نوچ رہے تھے۔ ہم کیچڑ میں گر رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔ کتوں سے لڑ رہے تھے۔ کتے بھاگ رہے تھے۔ حملہ کر رہے تھے کیونکہ یہ انہی گراؤنڈوں میں ٹرین کئے گئے تھے۔ یہ ان کا گھر تھا۔ یہ کتے چاہتے تو ہمیں ختم کر سکتے تھے لیکن وہ ہمیں ختم نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ختم کرنا ان کی ٹریننگ میں شامل نہیں تھا۔

ہم بھاگ رہے تھے۔ لڑھک رہے تھے۔ پسپا ہو رہے تھے۔ ہمارا ایسا کوئی گھر نہیں تھا جس کی سمت ہم جا سکتے۔ میدان سے آگے خاردار تاریں تھیں۔ ان سے آگے خندقیں تھیں۔ بندوقیں تھیں۔ مشین گنیں تھیں۔

کھونٹی پر میری وہ وردی لٹک رہی ہے جس پر صلیب کے سے دھبے پڑے ہیں۔ صلیب کی ایک جانب امن کا پہلا حرف پی لکھا ہوا ہے اور صلیب کی دوسری جانب جنگ کا اولین لفظ ڈبلیو ہے۔

میں سوچتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں۔

کیا ہر امن کیلئے جنگ ضروری ہے؟

کیا امن صرف ماندگی کا وقفہ ہے؟ یعنی جنگ سے جنگ تک ـــــ عافیت کا درمیانی وقفہ۔ جس طرح ہم پر جھپٹتے کتے تھوڑی دیر تک دم سادھے ہمارے سینوں پر رہتے تھے۔ ہمیں آزاد ہونے کی مہلت دیتے تھے۔ کیا امن کی بھی اتنی ہی مہلت تھی۔ صرف اپنا پنڈا چھڑانے کی مہلت!

یہ یو این کیا تھی؟

سیکورٹی کونسل کے کیا چکر تھے؟

ویٹو کا نشہ ـــــ ویٹو کا اندھا نشہ۔

یونیسکو، ہُو، فاؤ، سیٹو، سنٹو ـــــ یہ سب ماندگی کے وقفے تھے۔

تھکی ہوئی قوموں کے سستانے کیلئے بڑی بڑی شاندار بلڈنگیں ـــــ بڑی بڑی امن گاہیں عافیت کے لمحے، ـــــ پنڈا چھڑانے کی مہلتیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے میری بڑی بیٹی عائشہ میرے پاس تھی۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ طلاق ہو جانے کے باوجود وہ اپنے شوہر کے پاس لائلپور چلی گئی ہے اور شوہر کے سرونٹس کوارٹر میں رہتی ہے۔

کسی نے مجھے عائشہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ مجھے اپنے گھر والوں کی کئی باتیں اوپری اور اجنبی لگتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی اس طرح باتیں کرنے لگتے ہیں کہ میں اصلی متن کو سمجھ نہیں پاتا۔ مجھے سیاق و سباق سمجھنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے اور میں اصل نفسِ مضمون کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ پھر مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کسی شعبدہ باز کی رسی پر چڑھا ہوا میں معلق ہو گیا ہوں۔ میری کتاب زندگی کے کئی صفحے بیچ میں سے غائب ہو گئے ہیں۔ گویا بر بنائے کثافت حذف کر دیئے گئے ہوں۔ اپنے گھر والوں میں بیٹھے بیٹھے مجھے لگتا ہے گویا ابھی مجھے گھر جانا ہے۔ میں کسی ایسے محبوب کے روبرو شکستہ دل بیٹھا ہوں جو میرے رقیب کے ساتھ آنکھوں آنکھوں میں لمبی چوڑی داستانیں کہہ سن رہا ہے۔ ان دونوں کی چتونوں میں کئی رمزیں ہیں۔ وہ دونوں ٹیلی فون کے چونگے اٹھائے آپس میں ٹیلیفونی باتیں کر رہے ہیں اور میں ٹیلی فون کے کھمبے سے کان لگائے ان پیامات کو DECIPHER کر رہا ہوں۔

عائشہ ابھی لائلپور جانے سے پہلے میرے پاس آئی تھی۔

عائشہ کی عمر چھبیس سال ہے لیکن اس کا سارا وجود معاشرے اور مرد کی شان و شوکت کی بھٹی میں جل چکا ہے۔ اگر عائشہ کا خدا چاہتا تو ابھی وہ کچھ سال اور جوان رہ سکتی تھی کیونکہ کلیے خود بخود کہیں میرے اندر جنم لیتے رہتے ہیں۔

"جانتی ہو عائشہ۔ ہر ظلم سہنے والے کا بھی اتنا ہی قصور ہوتا ہے جتنا کرنے والے کا ـــــ

ظلم کو برداشت کر کے تم ظالم کی پرورش کرتے ہو۔"

"ٹھیک ہے اباجی۔" وہ اپنے کھچڑی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"میں نے تمہیں منع کر دیا تھا لائلپور جانے سے۔"

"جی اباجی۔"

"مجید تمہیں طلاق دے چکا ہے ـــــ وہ تمہاری صورت سے نفرت کرتا ہے۔ تم میں اتنی غیرت نہیں۔ تمہاری عزتِ نفس اس قدر مر چکی ہے کہ تم اس کے سرونٹس کوارٹر میں رہنا پسند کرتی ہو.....۔"

اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مجھے اپنے کمرے سے وحشی کتوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"عائشہ۔ کیا تم نے مجید کو معاف کر دیا ہے؟ ـــــ"

"جی اباجی ـــــ معافی ـــــ معافی کا تعلق دل سے ہے اباجی اور میرا دل اتنا اچھا نہیں۔ نہ ہی دل کسی کی مانتا ہے۔"

"عائشہ۔ تمہیں معلوم ہے مجید تمہیں طلاق دے چکا ہے۔"

"جی قسم لے لیں۔ میں کبھی ان کے سامنے نہیں گئی۔"

"یہ سمجھوتہ ـــــ یہ ناپاک سمجھوتہ جو تم نے کیا ہے اس کی شرائط کیا ہیں۔"

عائشہ نے چند ثانیے اتنی شدت سے ہونٹ بند کئے کہ پھر جب اس نے منہ کھولا تو اس کے ہونٹوں پر سفید سفید لکیریں پڑ گئی تھیں۔

"جی ـــــ ایک شرط تو یہ ہے کہ میں کبھی کوٹھی میں قدم نہیں رکھوں گی۔ اور دوسری یہ ہے کہ..... کہ میں مجید صاحب سے کبھی نہیں ملوں گی ـــــ نہ علیحدگی میں نہ کسی کے سامنے۔"

"تم نے یہ اندھا گونگا بہرہ سمجھوتہ کیوں کیا ـــــ کیوں کیوں کیوں؟"

"میں کیا کرتی اباجی ـــــ وہ منی کو ایک دن سکول سے فیصل آباد لے گئے تھے۔ میں کیا کرتی بتائیے اباجی۔ میرے پاس منی کے سوائے اور ہے کیا ـــــ بتلایئے؟"

میں چپ ہو گیا۔ ٹین والی بیرکوں پر بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔

عائشہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ راندۂ درگاہ تمامتر نسوانیت سے عاری ہو چکی تھی۔ نسوانیت میں ٹھوکر لگانے، عزم سے چلنے اور ملیامیٹ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ ہرنوں کے تیتری بلاتی ہے۔ بادشاہیاں الٹ دیتی ہے۔ تگنی کا ناچ نچانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ عائشہ مکمل طور پر پسپا شدہ عورت تھی جس کے جسم کا ایک ایک بند، ایک ایک ہڈی، ایک ایک شریان، ایک سمجھوتے کیلئے سانس لے رہی تھی۔ اس میں نسوانیت کا شوشۂ واحد بھی باقی نہ بچا تھا۔

عائشہ کے پاس اپنے گھر میں داخل ہونے کا کوئی ویزا کوئی پاسپورٹ نہیں تھا۔

اس کے گھر کے چاروں طرف ڈھاکہ کی ہری گھاس لگی ہے لیکن یہ سب اس کیلئے ممنوعہ علاقہ ہے۔ ایک سمجھوتے کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ چکی ہے حتیٰ کہ اپنی نسوانیت بھی۔

جس رات کیپٹن فرید تین سپاہیوں کے ساتھ فرار ہوا اس رات بڑی ٹھنڈ تھی۔ ہمالہ کی جانب سے اچانک ٹھنڈی ریڑھ توڑ ہواؤں کا ریلا آ گیا تھا۔ ٹین کی چھتوں سے ٹکراتی ہوئی یہ ہوائیں خوفناک جناتی سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ سیاہ مرمر جیسی ٹھنڈی اندھیری رات تھی۔

ڈرامے کا آخری سین جاری تھا۔ ہم سب پانی کی اٹکی ہوئی بوند کی طرح صرف حلق میں زندہ تھے۔ کیپٹن فرید درد سے اونچے اونچے کراہتا ہوا فرش پر لوٹنیاں لگا رہا تھا۔ بڑی دیر تک کیپٹن روتا چلاتا اور خدا کے واسطے دیتا رہا لیکن ہم سب جانتے تھے کہ جلدی شنوائی نہ ہو گی۔ کیپٹن کی آواز اس رونے دھونے کی وجہ سے بالکل بیٹھ چکی تھی۔

پھر اچانک قفل میں چابی پڑی۔

کیپٹن فرید کے سپاہی مساموں تک ALERT ہو گئے۔

"کیا بات ہے؟"

"مجھے اسی وقت کسی ڈاکٹر کو دکھایئے ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

کپتان فرش پر اس شدت سے ٹھکے مارنے لگا کہ فرش پر جا بجا لہو کے داغ پڑ گئے۔

"اس وقت ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں" گورکھا سپاہی بولا۔

"خدا کیلئے ____ آپ کو راجا رام کا واسطہ"

"ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ صبح دیکھی جائے گی"۔

گارڈ واپس مڑا۔

تینوں نیولے نما سپاہی گارڈ کے مڑنے کے منتظر تھے۔

کیپٹن اب اپنے سینے پر مکے مار رہا تھا اور زور زور سے بوٹ فرش پر دھاڑ رہے تھے۔

گارڈ کے مڑنے کا فیصلہ کن لمحہ تھا۔

کچھ باتیں یا فیصلے اگر ٹھنڈے دل سے کئے جائیں تو محض ان کی خوف ناکی کے پیش نظر آدمی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے لیکن انسان کی سائیکی میں کچھ لمحے ایسے سر پھرے بے پروا اور لاابالی ہوتے ہیں کہ جب آدمی ہواؤں میں اڑنے کی سوچتا ہے اور اڑتا ہے۔ مشتری کو پیچھے چھوڑ جانے کا فیصلہ کرتا ہے اور ایسا ممکن ہو جاتا ہے۔ ان لمحوں میں سالوں کی قوت بند ہوتی ہے۔ اپنے آباء و اجداد کی جملہ صلاحیتیں منجمد ہوتی ہیں۔ یہ قوت اور فیصلہ کا لمحہ اپنے اندر ابدیت کے جراثیم رکھتا ہے۔

اسی ایک لمحے میں تینوں سپاہیوں نے بستر کی چادر گارڈ پر ڈالی پھر مرنے سے پہلے گارڈ کے حلق سے ایک ہچکی سی نکلی اور بندوق کی لبلبی پر اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ کیپٹن فرید نے اسی لمحے کے اندر اندر گارڈ کی وردی پہنی اور وہ چاروں اسی لمحے میں ہمارے کیمپ سے بہت دور نکل گئے۔

احتیاط در احتیاط۔ پھند در پھند۔

بارود، بندوقیں، جوان، مشین گنز، جیپیں، کتے ____ پولیس پارٹی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی کیونکہ اس لمحے میں فطرت، بقائے انسانی کی مدد میں نکلے ہوئے معجزے اور رضائے الٰہی بند تھی۔

اس واقعے کے بعد ہر جگہ کیمپوں میں جوان، رینکس، آفیسر اور جی او سی کے لوگ سختی کے ساتھ

علیحدہ علیحدہ نظر بندیوں میں منتقل کر دیئے گئے۔

اس ایک لمحے میں جب ہم صدیوں کا سفر کر رہے تھے۔ ہم باقی چار آدمی سناٹے میں صرف سانس کے سہارے زندہ تھے۔ سانسوں کی آواز اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ ہمیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی تلعی گر بیٹھا اپنی بھٹی جلا رہا ہے۔ ہم سب کے چہرے گارڈ کے جسم سے لپٹی ہوئی چادر کی طرح سفید تھے۔

صرف عبدالکریم اسی طرح تھا۔

وہ کیپٹن فرید کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کے مطابق اونچے اونچے سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کی سیٹی میں ذرہ بھر خوف، شک و شبہ اور ابتلا کی شکل نہ تھی۔ اس کی سیٹی ایسے اجالے کر رہی تھی جیسے کان کن کی ٹوپی کے ساتھ لگی ٹارچ اندھیرے پہاڑ میں راستہ دکھا رہی ہو۔

عبدالکریم پورے پونے تین بجے تک سیٹی بجاتا رہا۔

اور پورے تین بجے ہر بنس کھنہ تلاشی لینے ہمارے کیمپ میں آیا۔

میری وردی کھونٹی سے لٹکی ہوئی ہے۔

اس پر جا بجا صلیب کے سیاہ پرکٹے سے نشان ہیں۔

ہم لوگ کون ہیں؟

ہم لوگ جو دشمن کی قید میں رہے۔

ہم لوگ کون ہیں؟

ہم نہ غازی تھے نہ شہید۔

ہم نہ محب وطن تھے نہ سرحدوں کو پار کر جانے والے۔

ہم نے دشمن کی قید میں وطن کی محبت سیکھی۔ کمزور اور بے ہمت آدمی کے پاس دو سہارے ہوتے ہیں۔ یا وہ روتا ہے یا بھاگ جاتا ہے۔ ہم کمزور تھے لیکن نہ رو سکتے تھے اور نہ ہی بھاگ سکتے تھے۔ دشمن ہمیں بزدل سمجھتا تھا اور ہمارے اپنے دیس کے دانشور ہمیں ظالم، انسانیت کش اور زانی سمجھتے تھے۔ اپنوں کے الزام ہزاروں میل کا سفر کر کے دور مار میزائلوں کی طرح ٹھیک ٹھیک

بندی خانوں تک جا پہنچے تھے۔

ہم اپنوں کو کیا بتاتے کہ پردیس کیا ہوتا ہے اور غریب الوطنی کیا شے ہے؟

ہم انہیں کیا بتاتے کہ جس دھرتی کو ہم اپنا گھر سمجھ کر آئے تھے اس سرزمین والوں کی بیوفائی نے ہمارے اندر کیا کیا؟ ـــــ ہم اپنے ملک والوں کو کیسے سمجھاتے کہ قحط زدہ علاقوں کی عورتیں کیا ہوتی ہیں؟ اور کیسے کیسے کیا کچھ کر گزرتی ہیں؟ ـــــ ہم انہیں کیا سمجھاتے کہ دشمن کی جیت تلوار سے زیادہ قلم سے بھی ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ہم کس کس کو سمجھانے جاتے۔

ہم تو نہ غازی تھے نہ شہید پھر ہمارے ملک والے ہماری باتوں کو کیسے مان لیتے . . .

STATUS QUO کے لوگوں کی باتیں کون سنتا ہے؟ کون مانتا ہے؟

الزام دھرنے والوں نے پھر کس لئے ہماری راہ میں سرخ قالین بچھائے۔

انہیں کس کا انتظار تھا؟

یہ الزامات وہ ہتھیار تھے جن سے ہمیں دشمن نے خصّی کیا۔

انہوں نے ہمارے دیس سے آئے ہوئے ان الزامات سے ہماری مردمی چھین لی اور ہم سوچتے رہ گئے کہ پارسل بھیجنے والوں کو تحفے اور دوائیاں بھیجنے والوں کو کیا ہم سے اتنی ہی نفرت تھی۔ ہم قیدی تھے اور ہمارے جذبات میں رہی مبالغہ تھا جو بندی خانے میں رہنے والے ذی روح میں ہوتا ہے ـــــ لیکن وہ لوگ تو اپنے وطن میں تھے۔

ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔

صرف ہماری روح پہ دھوبی مارک تھے۔

پی فار پیس ـــــ ایسا امن جو بڑے ملک چھوٹے چھوٹے ملکوں کو پیکٹ بند خوبصورت پھول لگا کر کچھ عرصہ کیلئے اپنا توازن برقرار رکھنے کیلئے دیتے ہیں۔

ڈبلیو فار وار ـــــ ایسی جنگ جو چھوٹے ملک بڑے ملکوں کے ایماء پر اپنے ہی ملک کو تباہ کرنے کیلئے لڑتے ہیں۔

ہم تو پرزنرز آف وار تھے ـــــ ایسے قیدی جو جنگ میں آزاد رہے اور امن میں قید رہے۔

ہمارے پاس تو اپنے اور پرایوں کے الزام تھے۔

وہ ہمیں پوچھتے تھے ـــــ "سنا ہے ختنہ شدہ لوگ تو بہادر ہوتے ہیں۔ پھر تم کائر کیوں ہو"

ہم انہیں کیا سمجھاتے کہ رہبری پر ایمان رکھنے والے اگر ڈوب بھی جائیں تو بزدل نہیں کہلاتے! ـــــ

وہ ہمیں کہتے ـــــ "مذہب کی اساس پر ایمان رکھنے والو! یہ ۷۱ء مذہب والوں کا سارا پول کھول دے گا"

ہم انہیں کیا بتاتے کہ ایمان کی کمی نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟

ہم انہیں سمجھا نہیں سکتے تھے کہ گھر کی بنیاد ہلانے والے گھر کے فرد نہیں ہوتے۔ گھر کے سارے فرد ازل سے لڑتے جھگڑتے آئے ہیں لیکن وہ جدا نہیں ہوتے۔ لیکن جب کوئی باہر کا چاہنے والا سیندھ لگا کر آ جاتا ہے تو پھر گھر کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

گھر ہمیشہ مہربانیوں سے لٹتے ہیں۔ نئی محبتوں سے اجڑتے ہیں۔ ایسی مہربانیاں جو گھر کی سالمیت کو دیمک بن کر چاٹ جاتی ہیں۔ ایسی مہربانیاں جو ماں سے زیادہ چاہ کر کی جاتی ہیں۔ جب کوئی چاہنے والا گھر کے ایک فرد کی انا کو جگا کر اسے وہ سارے مظالم سمجھاتا ہے جو گھر کے دوسرے فرد اس پر کرتے رہے ہیں۔ وہ ان ساری لڑائیوں کے ڈھکے چھپے معنی واضح کر دیتا ہے تو گھر کی پہلی اینٹ گرتی ہے۔

گھر کی ایک ایک اینٹ محبت سے اکھاڑی جاتی ہے۔ ہر چوکاٹ ہر دہلیز پیار سے چوم کر توڑی جاتی ہے۔ جب باہر کا چاہنے والا لفظوں میں شیرینی گھول کر گھر والوں کے خلاف بھکاتا ہے تو پھر کوئی سالمیت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ہر انسان کمزور لمحوں میں خود ترسی کا شکار رہتا ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق میں لگا رہتا ہے کہ اس پر مظالم ہوئے اور اسی لئے وہ ظلم کرنے میں حق بجانب ہے۔

ہم اپنوں کو نہ سمجھا سکے تو ان کو کیا بتاتے کہ ہمارے گھر کی اساس غلط نہ تھی چاہنے والے

غلط تھے۔ ہر پرانی محبت میں پرانے پن کی وجہ سے جو غلطیاں کوتاہیاں موجود ہوتی ہیں انکو اجاگر
کرنیوالے بہت ذہین تھے ___! ہندوستان کی نئی چاہت کے سامنے بنگلہ دیش ہماری بات
کیا سنتا!

اب اگر اپنے اور پرائے سب اپنے اپنے الزام واپس بھی لے لیں تو بھی وہ دھوبی مارک کہاں جائیں
گے جو ہماری روح پر برص کے داغوں کی طرح پڑ گئے ہیں۔ وہ سرگوشیاں کہاں جائیں گی جو ہمارے
جسم کے اندر لہو کے ہر مولی کیول میں پھرتی ہیں۔

یہ سرگوشیاں پھیلتے پھیلتے سیلاب کے پانیوں کی طرح ہمارے وجود کو سیاہ راتوں میں جب
گھر کا کلاک تین بجاتا ہے، گھیر لیتی تھیں۔

لہو میں گھومنے والی سرگوشی کہتی ہے۔ غیرت مند لوگوں کیلئے ایک اور راستہ بھی ہوتا ہے۔

"کونسا؟"

"خودکشی کا راستہ ___ فرار کا راستہ ___ نجات کا راستہ"۔

ہم اس سرگوشی کو ننھے بچے کی طرح تھپک کر کہتے ہیں۔ "ہم مسلمان ہیں اور مسلمان پر خودکشی
حرام ہے"۔

پھر یہ سرگوشی رات کے تین بجے کلاک سے ٹکرا کر پوچھتی ہے:

"کیا تمہارا کوئی خدا ہے"۔

ایسا خدا جو یہودیوں کے خدا کی طرح ہر ظلم کے بعد ان کے کندھے پر دستِ شفقت رکھتا ہو۔
ایسا کوئی خدا جو ہندو کے برہما کی مانند ہر اتیاچار کے بعد ہون کنڈ جلا کر انہیں آشیرباد
دیتا ہے۔

ایسا کوئی خدا جو عیسائیوں کے خدا جیسا بے گناہ ویت نامیوں پر بمباری کرنے کے عوض دنیا بھر
میں تمہاری سرخروئی کا انتظام کر سکے۔

سرگوشیاں الزام ___ الزام سرگوشیاں!

خیالات ٹپہ کھاتی گیند کی طرح ابھرتے رہتے ہیں اور گیس کے مولیکیول کی طرح جوں جوں
انہیں ہماری ابتلا کی گرمی ملتی ہے ان کی KINETIC ENERGY بڑھتی چلی جاتی
ہے، بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ رات کے تین بجے میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور کیلنڈر کی طرف
دیکھ کر سوچنے لگتا ہوں۔

یہ کس کا کمرہ ہے؟

یہ کونسا ملک ہے؟

مشرقی پاکستان ___ بھارت ___ کہ مغربی پاکستان!

یہ کس کا وطن ہے؟

دیہاتی آبادی کا کہ ان کا رد بیہ لوٹنے والوں کا؟

میرا کہ الزام دھرنے والے سرخ قالین والوں کا؟

لوگ ہمیشہ کس کا ساتھ دیتے ہیں؟ کس کا؟

پھر دل کے اندر جنگ ہونے لگتی ہے۔ خوف کے بڑے بڑے فینٹم طیارے چمگادڑوں کی
طرح اڑنے لگتے ہیں اور امید کی ننھی ننھی میزائلیں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ریکائلس ٹینک شکن
توپیں فائر کرتی ہیں لیکن دل کے ارد گرد کوئی کانٹے دار تاریں بچھائے چلا جاتا ہے ___ بچھائے
چلا جاتا ہے ___ بچھائے چلا جاتا ہے۔

اسی طرح بالکل ایسی رات کے تین بجے جب صرف ہماری سانس زندہ تھی ہر بنس لکھنہ کے
آنے سے بہت پہلے اس کے قدم ہماری بیرک کی طرف بڑھتے چلے آئے۔ بڑھتے ہی چلے آئے۔
اس وقت کیپٹن زبیر کو فرار ہوئے پونا گھنٹہ ہو چکا تھا لیکن ہم سب اسی ملے میں زندہ
تھے جب وہ چار دن بیرک سے نکلے۔

ہر بنس نے گھستے ہی نعرہ لگایا:

"تم سب چاہتے کیا ہو ___؟"

ہم سب خاموش رہے۔ غالباً عبدالکریم کے سوائے ہم سب پیشاب کرنا چاہتے تھے۔

سامنے مرا ہوا گارڈ ادھ کھلی چادر میں پڑا تھا۔

ہربنس کھنہ کے ساتھ والے سپاہی تازہ تازہ نیند سے جاگے تھے اور ان کی آنکھوں میں سوائے ڈیوٹی کی بجا آوری کے اور کسی قسم کے جذبات نہ تھے۔

ہربنس کھنہ بڑی دیر تک چپ چاپ ہم چاروں کے چہرے دیکھتا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بھرپور توجہ کے ساتھ عبدالکریم کے پاس پہنچا۔

عبدالکریم کے چہرے پہ سکون تھا۔

اس نے بڑے احترام اور فراخدلی کے ساتھ سیلوٹ کیا۔

سپاہیوں نے عبدالکریم کی تلاشی لینا شروع کردی۔ اس کی جیبیں مرے ہوئے کتوں کی زبانوں کی طرح باہر کو لٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے سرہانے تلے سے چند سکے، دو سگریٹ اور ایک چیتھڑا اٹھا کر کھلی ہتھیلی میں سامنے پیش کر دیا۔

"یہ چیتھڑا تم نے کیوں چھپا رکھا تھا؟"

"یہ رومال ہے چیتھڑا نہیں۔ ادھر جوہا گاچھا پہ ایک بنگالی بہن نے ہم کو دیا تھا۔"

سارے فاتح سپاہی ہربنس کھنہ سے آنکھ بچا کر مسکرا دیئے۔ معاملے کی نزاکت سے تھوڑی سی کلفت دور ہوئی۔

یکدم ہربنس پھر اٹنشن ہو گیا اور کڑک کر بولا —— "جوہا گاچھا کا نام لیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ہم خوب جانتے ہیں۔ وہاں اس بنگالی بہن کے ساتھ تم نے کیا کیا ہو گا۔ INCCOTUAL BEAST"

عبدالکریم انگریزی اس قدر نہیں جانتا تھا لیکن پہلی بار اس کی آنکھوں کا اپرچر بند ہوا گویا وہ بہت زیادہ روشنی میں آ گیا ہو۔

"تم سب جانتے تھے کہ آج کیپٹن فرید اور اس کے ساتھی فرار ہو رہے ہیں۔"

ہربنس نے یہ سوال تین مرتبہ دہرایا۔

یہ لمحہ قیامت کی طرح لمبا تھا۔

عبدالکریم کے سوائے ہم تینوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم جانتے ہو عبدالکریم؟"

ایک ثانیے کیلئے وہ آگے کی طرف جھکا۔ بالکل نامعلوم سا جھکاؤ، جیسے کوئی نن آور درخت شبِ معراج کو سجدے کیلئے جھکا ہو۔ پھر وہ نئی طاقت پاکر ایستادہ ہو گیا۔

"جی سر ہم کو معلوم تھا" INFRA RED شعاعوں کی طرح تیکھا چبھ جانے والا جواب آیا۔

"تم کو معلوم ہے کہ ان کا کیا پروگرام ہے؟"

ہربنس اپنی ایڑیوں پر یوں گھوم گھوم کر بات کر رہا تھا جیسے ٹینک شکن اپنے ٹرٹ پر مڑتا ہے۔

"جانتا ہوں سر۔"

باقی تین سپاہی بھی مکمل طور پر ساکت ہو گئے۔

"تم جانتے ہو وہ کس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈائریکشن میں گئے ہیں۔ کس طرف۔"

"جی۔ جانتا ہوں۔"

اب ہربنس نے محبت سے عبدالکریم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا: "دیکھو بھائی میرے! ہندوستان اور پاکستان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کچھ لیڈروں کی بے وقوفی، نااہلی، کم سمجھی تھی کہ ہم کو جدا کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی میرے! ہندوستان پر نظر دوڑاؤ۔ یہاں تیرہ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ یہ بھی تمہارا ملک ہے۔"

عبدالکریم ماں سے زیادہ چاہنے والے کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا: "اگر ہمارا ملک اچھے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا اور ہم اتنے کمزور نہ ہوتے تو یہ تیرہ کروڑ مسلمانوں کی سی زندگی

زندگی بسر کرتے۔ اب بے چارے دھوبی کے کتے کی طرح زندہ ہیں۔"

ہربنس بدک گیا لیکن شاید اسے نرم رہنے کا حکم ملا تھا، وہ اسی ملائم آواز میں بولا:

"بھائی عبدالکریم ـــــ اگر تم ہمارے ساتھ سمجھوتہ کرلو تو ہم تمہیں اس بغاوت سے معافی دلا دیں گے۔"

"سمجھوتہ؟ ـــ کیسا سمجھوتہ؟"

ہربنس کے چہرے پہ وعدوں کی خوشامد تھی۔

"پہلا BATCH جو پاکستان گیا اس میں تم بھی جاؤ گے۔"

عبدالکریم شرمن ٹینک کی طرح اپنے بوٹوں میں اڑا کھڑا تھا۔

"جتنی دیر تک تم قیدی رہو گے تمہارا راشن دوگنا ہوگا۔ تم سے بہت اعلیٰ سلوک کیا جائے گا عبدالکریم۔"

اس کے ہاتھ میں اب بھی دھاری دار چیتھڑا بھینچا ہوا تھا۔

"تم صرف اتنی بات بتا دو عبدالکریم کہ وہ کس دشا میں گئے ہیں۔ اتنا سا سمجھوتہ کرلو ہم سے۔"

"سمجھوتہ ـــ ظلم کے ساتھ؟ اپنے اصولوں کے ساتھ غداری؟ مرد مسلمان یا تو معاف کرتا ہے یا بدلہ لیتا ہے۔ سمجھوتہ وغیرہ وہ نہیں جانتا کبھی۔"

عبدالکریم آج یوں بول رہا تھا جیسے جن چڑھے پر کوئی ان پڑھ لڑکی عربی فارسی بولنے لگتی ہے۔

"یہ تمہارا آخری چانس ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"آخری چانس۔"

اب ہربنس کھنہ کا ہاتھ اس کے پستول پہ پہنچ چکا تھا۔

"بدلہ ـــ یا معافی جناب ـــ سمجھوتہ نہیں۔"

"تم مسلے۔ بدلہ لو گے ہم سے۔ ابھی نصیحت نہیں ہوئی تمہیں۔ ابھی کوئی سبق نہیں سیکھا تم نے۔ قید میں تمہارا یہ حال ہے تو رہا ہو کر تم لوگ کیا کیا نہ سوچو گے۔ ہم نے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ پھر بھی تم ہمارے نہیں بنے۔"

"اپنوں کو چھوڑ کر ہم آپ کے کیسے بن سکتے ہیں سر۔ ہم اپنوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"نہیں بن سکتے تو نہ سہی۔ ہم راہ کے پتھر ہٹانا جانتے ہیں۔ ہم تمہیں بھی پاکستان جانے نہیں دیں گے۔"

یکبارگی تین فائر ہوئے۔

وہ منہ کے بل نہیں گرا۔ تن آور درخت کی طرح پیچھے گرا۔ اپنے بستر پہ چیخ نکلنے کی آواز آئی اور پھر بیرک میں سناٹا ہوگیا۔

ہندوستان کی ساری فوج عبدالکریم کا راستہ نہ روک سکی۔

چیتھڑا عبدالکریم کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہربنس کے قدموں میں جا گرا۔

اتنا سا دو بڑا پیش کرنے کے بعد بغیر سمجھوتہ کئے عبدالکریم واہگہ کے گیٹ میں داخل ہوگیا۔ شاید یہ سرخ قالین اپنوں نے اسی کیلئے بچھا رکھا تھا۔ دیس والوں کو ہماہمی عبدالکریم کا انتظار تھا۔

ناخواندہ

جس وقت ایک مقامی کالج سے مجھے کونووکیشن ایڈریس پڑھنے کا دعوت نامہ موصول ہوا میں اپنے دفتر میں تھا۔ میرے سامنے فائلوں کا انبار ٹھوڑی تک جما تھا اور پانچ ٹلے اپنی اپنی ضرورت کو مسکراہٹ تلے اس طرح چھپائے بیٹھے تھے جیسے کنگرو مادہ اپنے بچے کو اپنی تھیلی میں نہاں رکھتی ہے۔ ان کے لبوں پر بڑی سرسری باتیں تھیں لیکن کمشنر کے دفتر میں لوگ ہمیشہ زانو زدگی کیلئے آتے ہیں۔ اس کے پیچھے ان کا ذاتی مفاد کاربن پیپر کی طرح چھپا ہوتا ہے۔ سارے میں ایئر فریشنر کی خوشبو تھی۔ کمرہ بھیڑ کی وجہ سے زندہ کبوتر کے پوٹے کی طرح گرم تھا۔ دفتری میز پہ چھ پیالیوں میں کافی بھاپارہ دے رہی تھی۔ اس ساری آسودہ فضا کے باوجود میرے اندر کہیں عاشورہ کی سی فضا پھیلی تھی۔

میں نے ان پانچ فطین جہاندیدہ گرگ صورت آدمیوں کے سامنے پرنسپل کا خط کھولا۔ انکی آوازیں دب گئیں۔ میں نے کرسی پر کہنی ٹکا کر قدرے بناوٹی تکبر سے خط پڑھا۔ رقم تھا:

"آپ جیسی مشہورِ عالم، مقتدر، زمانہ شناس ہستی سے کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے لیکن ایک تعلیمی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے چند باتوں کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارا ملک آپکے سامنے ہے۔ اس کے انتشار کی کیفیت سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ نوجوان جس عبوری دور سے گزر رہا ہے اور جس توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہا ہے،

اس کی تفصیل میں جانے سے تضیع اوقات ہونے کا اندیشہ ہے۔ میری آرزو ہے کہ کالج سے رخصت ہونیوالے طلباء کیلئے کوئی ایسا WORKABLE خطبہ ہو جو انہیں اس تضاد سے بچائے جس نے نوجوان ذہن کو آج گرفت میں لے لیا ہے۔ انہیں پرانی اقدار، اپنے کلچر اور مذہب کی طرف اس طرح پھیرا جائے کہ وہ کالج سے نکل کر اپنے معاشرے کے تحفظ کے ضامن ہوں اور معاشرے کے بخیئے ادھیڑنے میں برسرِ پیکار نہ رہیں۔ رواداری، محبت، نظریاتی فراخ دلی، محنت ایسی خوبیاں ہیں جو استحصال کو جڑ سے کاٹتی ہیں۔ آپکو اس ضمن میں راستہ دکھانا آپ کے علمی تجربے سے ناانصافی ہے۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ خطبہ اس تضاد کو کم کرے جس سے آج کا نوجوان دوچار ہو رہا ہے۔ اس بحران کی بیخ کنی کرے جس میں آج کا نوجوان غلطاں و پیچاں ہے۔"

خط طویل تھا اور یوں لگتا تھا جیسے پرنسپل صاحب نے ایک عرصہ صرف ریڈرز ڈائجسٹ کا مطالعہ کیا ہو۔ اس کے خط میں دینی اور اخلاقی اقدار پر کچھ ایسا زور تھا جیسے گرامر کے پجاریوں کی تحریر میں کولن اور سیمی کولن کی تکرار ہوا کرتی ہے۔ پانچوں شاطر ہولے ہولے کافی متحرک رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کن الفاظ میں پرنسپل کو انکار کروں کہ اسے کھنچ کے ملنے کا احساس نہ ہو۔

میرے پاس ایسا کوئی قابلِ عمل نظریہ موجود نہ تھا جسے میں عبوری دور کے نوجوانوں کے ذہنی بحران کو ٹھنڈا کرنے کیلئے بطور نذرانہ پیش کر سکتا۔

میرے پاس مذہب ضرور تھا لیکن میں اس مذہب کے استعمال سے قاصر بھی تھا۔

میرے پاس بہت سے مثبت نظریے تھے اور ہر مثبت نظریے کے بطلان کیلئے اَن گنت قدِ آدم جاندار اور نظریے موجود تھے۔

میں وطن کی خاطر جان پر کھیل جانے والا سپاہی بھی تھا اور وطن پرستی کو انسان دوستی کے منافی بھی سمجھتا تھا۔

میں حدود میں مقید آزاد تضادوں کا متلاشی درندہ تھا۔

میرے لئے ہر پگڈنڈی جو شاہراہ سے نکلتی بالآخر شاہراہ بن جاتی تھی۔

میرے لئے ہر جھوٹ سچا تھا اور ہر سچ جھوٹا۔

میرے لئے محبت موت بھی تھی اور زندگی بھی۔

میں جو آگ اور پانی کے اتصال سے کچھ یوں پیدا ہوا کہ نہ کبھی پوری طرح آگ بجھتی تھی نہ کبھی پوری طرح پانی سطح پر تیرتا۔ میں نوبالغ بچوں کو کیا سمجھاتا؟

میں نے انکار کا خط لکھنے کیلئے قلم اٹھایا ہی تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے پانچ یہودی جو من و سلویٰ کھاتے کھاتے تھک چکے تھے، میرے جواب کے سامنے دیوار بن کر تن گئے۔ ان پانچ آدمیوں کی آنکھوں میں خوشامد کا حرص تھی جو انکساری اور گیروا لباس اوڑھے رکھتی ہے اور خاکِ گزر بھی جسے دھندلا نہیں سکتی۔

میں نے دل میں سوچا کم از کم میں لڑکوں سے یہ تو کہہ سکوں گا کہ بالآخر ہر فلسفہ قناعت پر ختم ہوتا ہے۔ ہر مرحلے کے آگے صبر کی کڑی منزل ملتی ہے اور جب کوئی آدمی ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد اس قدر طلب کرنے لگتا ہے کہ اس کا اللہ شرمندہ ہونے لگے تو پھر نعمتوں کی سیڑھی کو جھٹلانے والے کیلئے ہر زینہ دیمک زدہ بنتا جاتا ہے۔ میں نوبالغ لڑکوں کی بے چینی میں کم از کم اس طرح شمولیت تو کر سکتا تھا جیسے نصاریٰ بپتسمہ لیتے ہیں۔ میں شاید اتنی صلاحیت تو رکھتا تھا کہ اگر علاج نہ بتا سکوں تو ڈیل کارنیگی کے اصول برت کر عیادت کرنے ہی چلا جاؤں۔

یہی عیادت کا جذبہ مجھے کالج کی حدود میں لے گیا۔

لیکن اس روز جب میں سالانہ کنووکیشن کے جلسے میں پہنچا، مجھے معلوم نہ تھا کہ اسی دن مجھے ایک نہایت اہم بلی چھڑانے خوشیوں کے سٹیشن پر بھی جانا تھا۔

جس وقت میں کالج کی حدود میں پہنچا دو رویہ خوش اعتماد فرسٹ ایئر کے نوجوان لڑکے گارڈ آف آنر کی شکل میں کھڑے تھے۔ کھچڑی کپے، سفید سروں والے پروفیسر پیش پیش تھے۔ ان کی بختگی شکستہ برتنوں کی طرح بڑی قابلِ ترس تھی۔ نوجوان پروفیسر جو یا تو سول سروس کے خواب دیکھ کر ناکام

ہو چکے تھے یا جو سول سروس ملنے تک مارک ٹائم کر رہے تھے قدرے پیچھے اور ان ملنے جی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

شکستہ رو بزرگ پروفیسر۔

شاکی مستقبل سے مایوس پروفیسر۔

قطار در قطار بے چین، متجسس طالب علموں کا انبوہ۔

پرانی نسل سے بیزار آنیوالے مستقبل سے خوفزدہ نوجوان۔

ان نوجوان بیٹوں، بھانجوں، بھتیجوں کے معجوب سرپرست۔

اور ان میں بیٹھی ہوئی وہ نوجوان لڑکیاں جو تعلیم حاصل کر کے نہ تین میں نہ تیرہ میں، ہو رہی تھیں۔

معزز شہری جو اندر سے بہت پتیلے اور سلور کے برتن کی طرح ہلکے تھے۔

ہال میں یہ سب لوگ جمع تھے اور مجھے ان سے کچھ ایسی جامع، ٹھوس اور بایقین باتیں کرنا تھیں کہ انہیں کچھ دیر کیلئے یہ بھول جائے کہ زندگی بڑی الجھیلی ہے اور تقریر کرنے والا کوڑی کی طرح اندر سے کھوکھلا ہے جس وقت میں سرخ مخمل سے مڑھی ہوئی کرسی میں بیٹھا، میں احساسِ ذمہ داری سے چُور تھا۔ . . . . لیکن جس وقت میں نے اپنا ایڈریس شروع کیا۔ اسی وقت صائمہ کی سسکیاں میرے سارے بدن پر رینگنے لگیں۔ اس کی لمبی لمبی موی انگلیاں جن پہ ہمیشہ نیلے ہیرے کی انگوٹھی رہتی تھی۔ ان ٹھنڈی انگلیوں کا لمس میری گردن کو اس طرح سہلانے لگا کہ سیاہ گاؤن کے اندر بوٹوں تک میرے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کاش اللہ تعالیٰ کے پاس بھی ویسی ہی معمولی گھڑی استعمال کیلئے ہوتی جو اس دنیا کے لوگ عام طور پر کلائی سے باندھے پھرتے ہیں۔ پھر اس کے اور ہمارے ٹائمنگ میں زیادہ سے زیادہ اتنا فرق ہوتا جتنا گرین وچ ٹائم سے دوسرے ممالک کے وقتوں میں ہوا کرتا ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ خدائے بزرگ و برتر کی گھڑی قرن چلتی ہے اور سیکنڈ بتاتی ہے اور انسانی گھڑی سیکنڈ چلتی ہے اور صدیاں بتاتی ہے۔ شاید اسی لئے اللہ شاکی ہے کہ اتنی نعمتوں کے باوجود آدم کی اولاد ناشکری ہے

اور انسان ازل اور ابد تک پھیلے ہوئے خدا کے سامنے خوفزدہ کھڑا بلبلا بلبلا کر کہتا ہے:

یا باری تعالیٰ! تیرے جہاں میں آرزوئیں اتنی دیر سے کیوں پوری ہوتی ہیں؟

زندگی کے بازار میں ہر خوشی سمگل ہو کر کیوں آتی ہے؟ اس کا بھاؤ اسقدر رنیز کیوں ہوتا ہے کہ ہر خریدار اسے خریدنے سے قاصر نظر آتا ہے؟ ہر خوشی کی قیمت اتنے ڈھیر سارے آنسوؤں سے کیوں ادا کرنا پڑتی ہے۔ آقائے دو جہاں؟ ایسے کیوں ہوتا ہے کہ جب بالآخر خوشی کا بنڈل ہاتھ میں آتا بھی ہے تو اس بنڈل کو دیکھ کر انسان محسوس کرتا ہے دکاندار نے اسے ٹھگ لیا ہے۔ . . . . جو التجا کی عرضی تجھ تک جاتی ہے اس پر ارجنٹ لکھا ہوتا ہے اور جو مُہر تیرے فرشتے لگاتے ہیں اس کے چاروں طرف صبر کا دائرہ نظر آتا ہے؟ ایسا کیوں ہے باری تعالیٰ؟ جس مال گاڑی میں تو انسانی خوشی کے بنڈل روانہ کرتا ہے وہ صدیوں پہلے چلتی ہے اور قرن بعد پہنچتی ہے۔ لوگ اپنے اپنے نام کی بلٹی نہیں چھڑاتے بلکہ صدیوں پہلے مر کھپ گئی ہوئی کسی دوسری قوم کی خوشی کی کھیپ یوں آپس میں بانٹ لیتے ہیں جیسے سیلاب زدگان امدادی فنڈ کے سامنے معذور کھڑے ہوں۔ خوشی کو قناعت میں بدلنے والے رب سے کوئی کیا کہے؟ جب آج تک اس نے کبھی انسان کی ایجاد کردہ گھڑی اپنی کلائی پر باندھ کر دیکھی ہی نہیں۔

لوگ مشتاق نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ آج خوشی کے سٹیشن پر جو مال گاڑی آنیوالی ہے اس میں سے مجھے بھی ایک بلٹی چھڑانے جانا ہے۔ خدا جانے اس بلٹی پر کس کا نام درج ہو گا؟ ہابیل قابیل کے عہد کا ٹکٹ لگا ہو گا کہ مصری ملکہ نفرتیتی کے زمانے کی مہر ہو گی۔

جب پرنسپل سالانہ رپورٹ پڑھ چکا اور میں نے مائیکروفون کے سامنے جا کر اپنی ٹائی کی گرہ کو ہاتھ لگایا تو میرے سامنے کالے سروں کا ایک قالین سا بچھا تھا۔ انسانی ذہن کی ایک لمبی چوڑی سائیکی میری منتظر تھی۔ نوجوان مجھ سے اس بات کے طلب گار تھے کہ میں ان کے جوش، ولولے، امید اور بغاوت کے رنگوں میں بسے ہوئے پرچم کو ہاتھ میں لوں اور اونچے اونچے کہوں ـــــــ زندگی زندہ باد اشرف المخلوقات زندہ باد ـــــــ بقائے انسانی زندہ باد ـــــــ

معمر گم گشتہ صورت زنہار زنہار پکار رہے تھے۔ فسردہ بوڑھے سلے ہوئے لبوں سے کہہ رہے تھے، دیکھنا کسی باغِ بہشت کا وعدہ نہ کرنا۔۔۔۔۔ دیکھنا کسی ریگ زار کو باغ بابل سے مشابہ نہ کر بیٹھنا۔۔۔۔۔ ہم نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا ہے کہ زندگی کو پرکھ چھان کر کے انکے سامنے پیش کر دو۔ پھر یہ جانیں اور ان کی آبلہ پائی۔ دیکھنا ہمیں دغا نہ دینا۔

میں نے ایک بدطینت ریفری کی طرح ایک نوجوان بازو اٹھایا اور دوسرا مفلوج ہاتھ بلند کر دیا۔ اور اسی وقت میری آواز صائمہ کی ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

جب مائکروفون کو ٹسٹ کرنے والا اسے اپنی خرابی سمجھ کر جا چکا تو ایک بار پھر میں نے اپنے میں ہمت پیدا کی۔ ایک ہاتھ راجا ارجن کے کندھے پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ میں کپل وستو کے راجہ دریودھن کے بیٹے مہاتما بدھ کی انگلیاں پکڑیں اور تقریر کا آغاز کر دیا۔

میں جب بھی کسی جلسے، تقریب یا سیمینار میں مطلوب ہوتا ہوں اپنے ماضی کا ذکر ضرور کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری ہسٹری سے شہر کے تمام عزت دار خوب واقف ہیں۔ سیلف میڈ آدمی چاہے باہر ہاتھی کی کھال کا بنا ہوا زرہ بکتر پہنے اس کا اندر جلے ہوئے کاغذ کی طرح ہوتا ہے اور اس اندر والے کھوکھلے وجود کو شہر والے اس سے بہتر جانتے ہیں۔ میں بھی ہر سیلف میڈ آدمی کی طرح پیش بندی کے طور پر اپنی غربت کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ پیشتر اس کے کہ لوگ کہیں ہم تمہارے ماضی کو خوب جانتے ہیں۔ ہم ان مور پنکھوں کی اصلیت سے آگاہ ہیں جنہوں نے تمہیں کوے سے مور بنا رکھا ہے۔ ہم اس گدڑی کے ہر تکینے کو جانتے ہیں جس کے تم لال ہو۔ میں بھی ہر عقلمند سیلف میڈ آدمی کی طرح بڑے تپاک سے وہ پرانی پوستین لا کر سب کے سامنے ڈال دیتا ہوں اور کہتا ہوں شہر کے عزت دارو! اس میں پانچ سوراخ ہیں۔ اس کے کف بوسیدہ اور چاک پھٹے ہوئے ہیں۔ اسکے کالر پر جو پیچ لگی ہے اسے میں نے نشانی کے طور پر ہمیشہ ساتھ رکھا ہے۔ میری ہر تقریر تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ ہمیشہ کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

معزز خواتین و حضرات!

میں ایک معمولی گارڈ کا بیٹا ہوں۔ لال اور سبز جھنڈیاں ہلانے والا معمولی گارڈ۔ اسی لئے مجھے گاڑیوں سے بڑی مناسبت رہی ہے۔ میرے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ یہ سب عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ اس طرح مجھے وراثت میں غربت تو ملی لیکن محبت کی دولت عام گھروں سے زیادہ میسر آئی۔ ہمارے معاشرے میں غربت اور محرومی لازم و ملزوم گردانی جاتی ہیں۔ یہاں غربت انگشت نمائی کا دوسرا روپ دھار گئی ہے لیکن میرا تجربہ بہت مختلف ہے۔

آپ سب کالج سے رخصت ہو کر اپنی اپنی راہ پر گامزن ہوں گے۔ کچھ خوش قسمت لوگوں کے لئے دولت کی رو پہلی پری ہار لئے منتظر ہوگی۔ کچھ غربت کے جھولے میں برسوں ہکورے لیتے رہیں گے۔ میں آپ سب کیلئے مساوی حالات کی خوشخبری تو نہیں لا سکا لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکوں گا کہ غربت مسلسل جدوجہد کیلئے ایک درسگاہ ہے۔ حساس طبیعت غربت کے پانیوں پہ راج ہنس کی طرح تیرتی ہے۔ غربت ترقی کا زینہ۔۔۔۔۔ خلوص کا ترازو۔۔۔۔۔ اور انسان کی پرکھ کے لئے بہترین کسوٹی ہے۔

ہال میں تالیوں کی گونج ہے۔

دانے کے لالچ میں چڑیاں زیرِ دام آ چکی ہیں۔۔۔۔۔ ترقی، خلوص اور پرکھ کے چونچال رنگوں سے لوگ چندھیا گئے ہیں۔ سب سے خطرناک سچ وہ ہوتا ہے جس میں جا بجا جھوٹ کی پچریں لگی ہوں۔

یہ درست ہے کہ میرا باپ گارڈ تھا۔

یہ بھی درست ہے کہ ہمارے ہاں کھانے والے زیادہ اور روٹی کم ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ میں محبت کی دولت سے مالا مال رہا۔ جس وقت میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا وہ پورے سات بچے جن کر چاروں شانے چت ہو چکی تھی۔ اس کے کولہے بیمار بھینس کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے اور دونوں گالوں پر بدرنگ چھائیاں تتلیوں کی طرح آ بیٹھی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر وہ خشک کھانسی کھانستے کھانستے اس زور سے چارپائی کی پٹیاں پکڑتی کہ بان کا نشان اس کی ہتھیلیوں پر

جم جاتا۔

شاید میرے باپ کو میری ماں سے دلی پیار تھا؟

ہو سکتا ہے کہ ہر غریب آدمی کی طرح میرے باپ کی بیوی بھی گھر گرہستی کی مشین کا ضروری ترین پرزہ تھی۔

عین ممکن ہے کہ جنسی تکمیل کے لئے میرے باپ کے پاس اس سے سستا اور کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ وجہ کچھ بھی تھی اتنی بات واضح تھی کہ میرا باپ میری ماں کی موت کے خوف سے خوفزدہ تھا۔ اگر میرا باپ امیر آدمی ہوتا تو شاید اسی ماں پر کئی اعتراضات بھی ہو سکتے تھے لیکن اس وقت شادی کی گاڑی دلدل میں پھنسی تھی اور اس میں جتے ہوئے بیلوں میں سے میری ماں کا زور زیادہ لگتا۔ اسی لئے میرے باپ کی بڑی شدید آرزو تھی کہ کچھ دیر اور میری ماں کا کندھا ہلکا نہ کرے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے باپ کو میری ماں سے واقعی پیار ہو۔ کبھی کبھی غربت میں اس نعمت اور آسائش کیلئے عجب قسم کے سبب پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اپنے باپ کی جو سب سے پہلی شفقت میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ جب میں نے اپنی ماں کے رحم میں قدم رکھا اور باپ کو اطلاع ہوئی تو اس ناگوری بیل نے ماتھا پکڑ لیا اور دبے اصرار پر اصرار کرنے لگا کہ دائی فضلاں سے مل کر بچہ ضائع کر دیا جائے۔

پہلے تو دو چار ہفتے ماں رضامند نہ ہوئی۔ منڈ کڑی مار سارا دن سوچتی رہتی۔ بے چاری پرانے خیالات کی عورت تھی۔ اللہ اور رسول کو جیتے جاگتے انسانوں کی شہ رگ کے ارد گرد ہی کہیں چھپا ہوا سمجھتی تھی۔ بہت ڈری کہ کہیں دونوں ہی ناراض نہ ہو جائیں۔ پھر مجازی خدا کو سارے گناہ اور ثواب کے اختیارات سونپ کر مندی پڑ گئی۔

خدا جانے میری ماں واقعی رحم دل تھی یا صحت خراب ہونے کی وجہ سے اسکی آنکھوں میں ہر وقت آنسو جھلملاتے تھے پر سنتے ہیں جس روز اس نے فضلاں دائی کا بنا ہوا کاڑھا پیا اور کھیس کی بکل مار کر نومبر کی نیم گرم دھوپ میں چارپائی پر لیٹی اس روز ماں بہت روئی۔ دائی کا کہنا تھا کہ اول تو کاڑھے سے ہی اندر کی صفائی ہو جائے گی لیکن اگر رحم کا منہ نہ کھلا تو پھر وہ باقاعدہ علاج کریگی

مگر اس علاج کے پورے پچاس روپے لگیں گے۔

خدا جانے اکٹھے پچاس روپوں کا خوف تھا کہ بچہ ضائع کرنا ماں کے اخلاقی کوڈ کے خلاف تھا۔ وجہ کچھ بھی تھی۔ ہوا یہ کہ اسقاط حمل کا واقعہ تو پیش نہ آیا ہاں ماں کو ایسی ہچکی لگی کہ کلائی کی چوڑیاں آپ ہی آپ ڈھلک کر ہاتھوں سے گر گئیں۔ جب ایک نگ اور بڑھنے کا خوف ذرا کم ہوا تو میرا باپ مجسم دعا بن گیا۔ ماں کو تسلی دیتا کہ اولاد تو رحمت ہے کون جانے اسی بچے کے نصیب رزق کا دروازہ کھول دیں۔ بھلی لوک! ایک نگ اور بڑھ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے —— باپ کی ہر بات سے ماں کی تسلی ہو جایا کرتی تھی۔

یہ الگ حادثہ ہوا کہ جس روز میں پیدا ہوا اسی روز ہمارے گھر سے ایک نگ آپ ہی آپ ختم ہو گیا۔ جب دو موریہ پل کی طرف سے موذن کی آواز آئی اور میری بڑی بہن نے مجھے کھیس میں لپیٹ کر میری ماں کے پہلو میں ڈالا۔ اسی وقت میری ماں نے مجھ سے منہ پھیر کر کھانستے ہوئے بیٹی کو ٹٹولا پھر زندگی اور بیٹی دونوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

شاید اصلی وجہ یہی تھی کہ میرے باپ کو میری ماں سے محبت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ننھے بچے کی ذمہ داری کے باعث اسے کام پر جانے کی تکلیف ہوتی ہو۔ وجہ جانے کیا تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ میرے ابا کو مجھ سے خصوصی نفرت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ صرف اتنی سی بات تھی کہ گھر میں نومولود کیلئے کوئی باہمت عورت موجود نہ تھی۔ ہر فعل کے پیچھے جو نیت ہوتی ہے اس کا تجزیہ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ کئی بار یہ نیت خود فعل کرنیوالے پر بھی آشکار نہیں ہوتی۔ وجہ جو بھی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ میرا وجود مطلوب نہ تھا۔ میں اس مہمان کی طرح دہلیز پر کھڑا تھا جو اتفاقاً آ نکلے اور گھر میں پارٹی ہو رہی ہو۔ میں اس بہو کی مانند چوروں کی طرح گھونگھٹ کاڑھے کھڑا تھا جسے دولہا گھر والوں کی نارضامندی کے باوجود بیاہ لایا ہو۔ جس طرح کپڑے کے تھان پر گز گز کے بعد مُہر ہوتی ہے اسی طرح میرے وجود کے ہر گز پر نامطلوب نامطلوب لکھا تھا۔

مجھ نامطلوب بچے کو زبردستی ابا نے خالہ کی گود میں دے دیا۔ ہر سال پلے جننے والی کتیا کے

بچے جس طرح بیدردی سے بانٹ دیئے جاتے ہیں اسی طرح زبردستی بڑی چابکدستی سے ابا نے خالہ کو شیشے میں اتارا اور مجھے ان کا لے پالک بنا دیا۔۔۔۔۔ ایسا متبنہ جس کے قانونی حقوق صفر ہوتے ہیں۔ یہ احساس ساری عمر میرے تعاقب میں رہا گو گزر پر لگی ہوئی اپنی مہر میں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھی ہے۔ جب مجھے لوگ کبھی ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ میرے اندر رہی نامطلوب مہر کا کچا رنگ بگڑنے لگتا ہے۔

اس وقت بھی میرے سامنے نظروں کا ہجوم ہے۔

تالیاں تڑا تڑ ہال میں گونج رہی ہیں۔

آٹو گراف کا چھٹہ میری میز پہ اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ کئی مشتاق اسوفت وہ ٹاپک تشکیل دے رہے ہیں جو اگر انہیں مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو مجھ سے کہیں گے۔ نیوشلزم، عورتوں کے حقوق، مذاہب کی اہمیت، نظریۂ پاکستان کی تردید یا توضیح، کلچر آرٹ کی رنگا رنگی، بدلتے ہوئے معاشرے کی الجھنیں، پاکستانی فلموں کی یک رنگی اور پنجابی گیتوں کی گوناگوں صحت مندی، بیرونی ممالک سے آنیوالے ابلاغِ عام کے وسائل، ٹھا پٹاخ جیسی امریکن فلموں کا افادی یا مضرت رساں اثر، جنسی اور محبت کی حدود اور فاصلے، بیرونی ممالک کی تعلیم، اپنے ملک کی بیروزگاری —— ان گنت چالو ٹاپک جن پر ہر پڑھا لکھا آدمی سوچتا ہے اور اپنی تربیت تعلیم اور پس منظر کے مطابق ابلتا اور ٹھنڈا ہوتا ہے، ان لوگوں کے ذھنوں میں گھوم رہے ہیں۔ میرے نزدیک ہر آدمی کا BOILING POINT مختلف ہے۔ اسی طرح کس ڈگری پر جا کر وہ منجمد ہوتا ہے یہ بھی ہر انسان کی منفرد کیفیت ہے۔ اس کا شبنمی نکتہ اس کے سکڑنے اور پھیلنے کے اصول بھی صرف اسی پر لاگو ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم فزکس کے اصولوں کے تحت عام مادے کے خواص معلوم کر لیتے ہیں اس طرح ممکن نہیں کہ ہم کوئی بندھا ٹکا اصول ایسا بھی مرتب کر لیں کہ ہر آدمی کا نقطۂ انجماد یا اس کی وسعت کے متعلق کوئی سیٹ تھیوری قائم کر لیں۔ لوگ مجھ سے بات کرنے کی آرزو میں سٹول پر کچھ آگے کو جھک آئے ہیں۔ کرائے کے صوفوں پر بیٹھی کولون اور ہیئر سپرے سے معطر لڑکیاں دل ہی دل میں مجھ سے ہلکا ہلکا فلرٹ کر رہی ہیں اور مجھے مکمل

طور پر فرش راہ کرنے کے منصوبے بنا رہی ہیں۔

اس وقت اس ساری توجہ کا فوکس پوائنٹ میں ہوں۔

اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس چڑیا کے گھونسلے کی طرح نامطلوب ہوں جو وہ عام طور پر چھت کے ساتھ لٹکے ہوئے پنکھے کے پیالے میں بنا لیا کرتی ہے لیکن جس میں اس کا گھر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ دراصل میرے اس جسمانی وجود کے اندر کسی اور مقتدر، مدبر اور قابلِ احترام شخصیت کا سواگت کر رہے ہیں۔ یہ اس آدمی کو نہیں دیکھ سکتے جو اس قیمتی سوٹ کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ میں اس دیا سلائی کی تکڑی کی مانند ہوں جس پر ٹیک کی لکڑی لگا کر دنیئر کر دیا گیا ہو۔ ساری زندگی مجھے شدت سے احساس رہا کہ میں کسی انسان، کسی مشن، کسی خاص جگہ، مقام یا موقعے کیلئے ضروری نہیں ہوں۔ لیکن اس احساس کے باوجود میری تقریر کے دوسرے صفحے پر لکھا تھا:

معزز خواتین وحضرات!

دراصل ہر انسان اس دنیا میں کسی خاص سکیم کسی طے شدہ پلان کے تحت وجود میں آتا ہے، چاہے بظاہر وہ کتنی ہی بے بضاعت زندگی کیوں نہ بسر کرے اس کی زندگی ہمیشہ کارآمد ہوتی ہے بالکل ان کیلوں کی طرح جو بظاہر ضروری نہیں ہوتے لیکن فرنیچر کو مضبوطی بخشنے کے لئے ٹھونکے جاتے ہیں۔ (تالیاں)

جب آپ کالج کی حدود سے باہر نکلیں گے تو پہلی بار زندگی آپ سے ہاتھ ملانے آئے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے باکسنگ کے دستانے بھی پہن رکھے ہوں اور آپ کا کلہ بہت نازک ہو۔ کالج کی زندگی میں ایک نقص ضرور ہے۔ یہ انسان میں قالین کے شیر جیسی دلیری پیدا کرتی ہے۔ آئیڈیلزم کے جراثیم بھی ساون کے اندھے کی طرح ایک ہی سمت میں دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں سے جو تعلیم آپ نے اساتذہ سے حاصل کی جو کچھ آپ نے تبادلہ خیالات سے اپنایا۔ جو موتی آپ نے کتابوں سے چُن چُن کر اکٹھے کئے۔ ممکن ہے اس سب کیلئے کوئی جوہری بر وقت مہیا نہ ہو سکے اور آپ محسوس کریں کہ زندگی نے دراصل آپ سے دغا بازی کی۔ جب آپ باہر نکلیں گے تو ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ آپکا چھکا

نہ پڑے۔ ہمیشہ آپکے ہاتھ میں ترپ کے پتے نہ آئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعلیم نے جو کچھ آپ کو ودیعت کیا زندگی مکمل طور پر اس تعلیم کی نفی کے اسباب پیدا کرتی رہے لیکن میں آپ لوگوں سے دست بستہ عرض کروں گا کہ جو آدمی ناکامیابی کی دستک پر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے وہ اپنے مشن میں فیل نہیں ہوتا۔ وہ دراصل اللہ کی سکیم اور اس کے پلان کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ ناکامیابی بعض دراصل کامیابی کا ہی دوسرا روپ ہے۔ جو کیل بظاہر غیر ضروری نظر آتی ہے عموماً وہی مضبوطی کا باعث بھی بنتی ہے ......"

یہاں ایکبار پھر بڑی گرمجوشی اور تواتر سے کچھ ناتجربہ کار نوجوان تالیاں بجاتے ہیں۔

اس کے بعد میں بڑے تسلسل کے ساتھ بابر بادشاہ کی وہ کہانی بیان کرتا ہوں جو میں نے اردو کی پانچویں جماعت میں پڑھی تھی اور جس میں بابر بادشاہ نے فرغانہ پر حملہ کرنے سے پہلے ہمت کا سبق بے چاری ننھی چیونٹی سے سیکھا تھا جو حوض کے کنارے بار بار چڑھتی تھی اور بار بار گرتی تھی.....

لوگ اس کہانی سے بخوبی واقف ہیں۔ کوئی اسے صلاح الدین ایوبی سے، کوئی رابرٹ بروس سے منسوب کرنے کا عادی ہے۔ پرانی انفرمیشن کا اگر اعادہ کیا جائے تو عموماً دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ اسی لئے اس وقت لوگوں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ہے .... گو چیونٹی سے جو سبق میں نے اصل میں سیکھا ہے وہ بابر بادشاہ سے بہت مختلف ہے۔

میں جانتا ہوں جن کھٹے انگوروں کیلئے انسان بہت دیر اچھلتا ہے اور بالفرض وہ اپنی کوشش سے ہاتھوں میں آ بھی رہیں تو وہ کبھی میٹھے نہیں ہو پاتے۔

میری تعلیم کی منزلیں میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہی ہیں۔

میں چیونٹی کی طرح بار بار حوض میں نہیں گرا بلکہ بڑی تواتر سے پاس ہوتا رہا۔ ٹرم بہ ٹرم، کلاس در کلاس، سال بہ سال اوپر ہی چڑھتا رہا لیکن اس کامیابی کے باوجود میری کیفیت ہمیشہ ایسی رہی کہ قدم جرمن کا بڑھتا ہے فتح انگلینڈ کو ہوتی ہے۔ کامیابی سے جس خوش اعتمادی کو جنم لینا چاہیئے اس کامیابی نے کبھی میرے دروازے پر دستک نہ دی۔ خدا جانے کیا وجہ تھی؟

میری خالہ ہر وقت اللہ رسول سے ڈرتی تھیں اسلئے کبھی کسی نے انہیں ننگے سر نہ دیکھا۔ انہیں جب کبھی بہت پیار آتا وہ اپنے بچوں کو چھوئے بغیر ان کے ماتھے چوم لیا کرتی تھیں۔ میرے لئے ایسے فروعی جذبات بھی خارج از فہرست تھے۔

میں جب بھی سالانہ امتحان میں پاس ہو کر گھر آیا یا کوئی ٹرافی یا سکالرشپ کا حقدار ٹھہرا خالہ اور مجھ میں ہمیشہ کچھ ایسی گفتگو ہوئی۔

"رزلٹ نکل آیا؟"

"جی....."

"پاس ہو گئے؟"

"جی....."

"مبارک ہو۔ آپا کی روح آج کتنی خوش ہو گی"۔

میں آپا کی روح کو خوش کرتا رہا اور پاس ہوتا گیا۔ لیکن پتہ نہیں اتنی ساری کامیابی نے مجھے بھیگی ہوئی روئی کی طرح بوجھل ہونے کا احساس کیوں دلایا؟ ——— خالہ نے مجھ سے کبھی برا سلوک نہ کیا۔ اس گھر میں توازن، اعتدال، تناسب اس قدر تھا کہ ساری زندگی گھڑی کی سوئیوں کی طرح ٹھیک ٹھیک چلتی تھی۔ ہر حصہ بقدرِ ضرورت نہیں بقدرِ جثہ ترازو میں تل کر ملتا تھا۔ لڑائی جھگڑے میں حد ادب ملحوظ رہتا۔ پیار محبت میں عزت نفس بند باندھ دیتی۔ زندگا ٹرین کی لائنوں کی طرح ہمیشہ متوازی لائنوں میں چلتی تھی اور افق پر جا کر بھی اس میں کسی قسم کے ملاپ کے امکانات نہ تھے۔

یہ نہیں کہ خالہ مذہبی عورت تھی بلکہ نہیں تو یہاں تک کہوں گا کہ نماز روزے کی پابندی بھی وہاں عجیب قسم کی ٹھنڈی ٹھنڈی رسمیں تھیں۔ ہمارا گھر جیسے تھرموس میں لگا رہتا۔ ایک سی حرارت ——— ایک سی خنکی ——— ایک سی یخ بستگی!

خالہ نے مجھے کبھی نہیں جھڑکا۔

خالہ کے بچوں نے مجھ سے کبھی کوئی زیادتی نہیں کی۔

خالہ نے میری تعلیم پر بڑی توجہ دی۔

خالہ نے میری تمام ضرورتوں کا بڑے سلیقے سے خیال رکھا۔

اسی لئے آج میں یہاں اونچے تختے پر کھڑا باتیں کرنے کے قابل ہوا ہوں لیکن بلی کو دودھ کے علاوہ مس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے یہ احساس ضرور ہونا چاہئے کہ وہ کسی کیلئے اہم ہے ...... میری زندگی اس احساس سے عاری رہی۔ مجھے اس گھر میں اتنی اہمیت بھی حاصل نہ تھی جتنی ڈکی میں بند سٹپنی کی ہوا کرتی ہے...... کہ وہ ہو تو وافر لیکن اپنی ضرورت کے باعث ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے۔

میری تعلیم کے مراحل اور نوکری کے مدارج بے رنگ نثر کی مانند ہیں۔

یہ ساری منزلیں مجھے محنت کے ہاتھوں ملیں۔ ایسے اعزاز، ڈگریاں، عہدے جن پر میں فائز رہا، منزلیں نہیں تھیں، منزلوں کے سراب تھے۔ میری ہر کامیابی میں اس درجہ محنت پڑتی تھی کہ جب کامیابی ہار یان لیکر آگے بڑھتی تو میں اس سے نظریں چرانے لگتا۔ مجھے کوئی ایسی خوشی یاد نہیں جو مجھے بلاقیمت ملی ہو...... کبھی کبھی لومڑی جوش میں اتنی مرتبہ گر چکتی ہے کہ اگر وہ دیوار پر چڑھ بھی لے تو بھی انگور کھٹے ہی رہتے ہیں۔

میں نے محبت کی تلاش میں بڑی آبلہ پائی کی۔ صحرا در صحرا چلا۔ گم سم...... بظاہر فرعون صورت لیکن اندر سے کاسہ پھیلائے۔ بڑی دشت نوردی کی لیکن اس دشت میں ایسی آندھیاں چلتی ہیں کہ ٹھیک سے قدم بھی نہیں جمنے پاتے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان محبت کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چلتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے ریگستان میں یہ آب حیات تو نہیں ملتا۔ ہاں ستانے کو شہرت کا نخلستان ضرور مل جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا....!

خدا جانے کس صدی میں کس بدنصیب شاعر نے شہرت کی آرزو کی ہوگی۔ اس کی خوشی کا پارسل جانے کس صدی میں چلا اور مجھے جو محبت کے بنک ڈرافٹ کا منتظر تھا اس کے ہاتھوں میں

آگیا۔ یہ بھی زندگی کا طرفہ تماشا تھا کہ دنوں میں میری غزلیں اخباروں رسالوں کی زینت بن گئیں۔ کسی نے ان میں میر کا رنگ تلاش کر لیا۔ کسی حیلہ جو نے انہیں غالب سے مماثل کر دیا۔ میں نے کبھی آرزو نہ کی تھی کہ میں سقراط کی مانند دوسروں کے ذہنوں کو اجال دوں۔ لوگ مجھ سے سیاسی، لنظریاتی مافوق الطبیعیاتی اجنبی بوقلمون نظریوں کی آس لگائے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے بامعنی مربوط اظہارِ خیال کے متمنی ہیں۔ حالانکہ میں چاند کی دوات میں قلم ڈبوتا ہوں اور سمندر کی سطح پر لکھتا ہوں۔ میں لوگوں سے کیا کہوں؟ کہ ایسے غیر منطقی ذہن سے تبادلۂ خیال کیسا؟ میں تو کانگڑے کا بندر ہوں جو رتی کے درختوں کی ہر ٹہنی پر لپکا کرتا ہے اور جسے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ رتی کی ہر ڈالی اوّل و آخر ڈالی ہوتی ہے وہ خاص سمت میں جھکتی ہے اور اس پر ایک خاص حد تک بوجھ ڈالا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اندر ہی اندر میرے کھوکھلے پن کو محسوس کرتے ہوں لیکن آپس میں مارے خوف کے اظہارِ خیال نہیں کر سکتے کیونکہ جب کسی دلدارِ شہر کے متعلق ایک روایت جنم لیتی ہے تو پھر اس روایت کو توڑنے کے لئے جب تک اس سے بڑا فقیہ شہر پیدا نہ ہو...... دلدارِ شہر کے سر پر روشنی کا ہالہ منور رہتا ہے۔

سارے ہال میں خوش فہمی، خوش اعتقادی، خوش دلی کا ارتعاش خوشبو کی طرح پھیلا ہے۔ اگر اس ارتعاش کو ہم کسی کمپیوٹر سے جانچ سکتے تو بڑا ہی متوازی گراف بنتا جس کے اتار چڑھاؤ میں کچھ زیادہ تفاوت نہ ہوتا۔

ان خیالات کے باوجود میں بولے جا رہا ہوں۔ بالکل اس کار کی طرح جو کھڑی ہوتی ہے لیکن اس کا ڈرائیور اسے ریس دیئے جاتا ہے...... میں کہہ رہا ہوں۔

"انسانی بقا کیلئے ہوا پانی سے کہیں زیادہ محبت ضروری ہے لیکن عام طور پر لوگ محبت کو اپنے لاکر کا زیور سمجھتے ہیں۔ وہ اسے اپنے سیف میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ تعویز ہے جو ان کے حق میں دوسروں پر چلتا ہے۔ یہ وہ جادو ہے جو وہ دوسروں پر کرتے ہیں۔

دراصل محبت اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا نام نہیں۔ محبت بڑھی ہوئی ہتھیلی نہیں ہے۔ جو لوگ چاہے جانے کی آرزو میں جلتے ہیں وہ راکھ کی شکل میں لب گور پہنچتے ہیں اور جو اپنی محبت کو دوسروں

کے قدموں میں نچھاور کرتے ہیں ان کی قبر پہ ٹھنڈے آنسوؤں کی بارش ہوتی ہے اور بہار کے دنوں میں خود رو گھاس کے ساتھ ساتھ خوش رنگ پھول بھی جنم لیتے ہیں۔

جب آپ لوگ کالج سے نکلیں گے تو آپ سب کو خیال ہوگا کہ رانجھے، کوہکن، مجنوں کی محبت بانہیں کھولے کھڑی ہوگی۔

. . . . لیکن محبت کے خواب صرف ان ہی کے پورے ہوتے ہیں جو اپنے لئے کچھ طلب نہیں کرتے۔ جو محبت کرتے ہیں۔ محبت مانگتے نہیں۔"

میرے کندھے اور گردن پر صائمہ کے آنسو ہیں۔

اور میرے ہونٹوں پر فریب کی باتیں ہیں۔

میں نے ساری عمر صائمہ سے محبت کی اور اپنے لئے کچھ نہ مانگا۔ میں اس اونٹ کی طرح اونٹ کٹارے کے جنگل سے گزرا۔ جس نے اپنے منہ پر چھینکا بندھا ہو اور اب میری حالت اس بڈھے کی طرح ہے جو برہنہ عورتوں کے جھرمٹ میں اپنا منہ اس لئے چھپائے بیٹھا ہو کہ اس کی وہ عمر گزر چکی جب وہ جسمانی محبت کے قابل تھا۔

میں نے صائمہ سے ساری عمر محبت کی اور پلٹ کر ایک دن بھی اس سے اپنے لئے محبت کی بھیک نہ مانگی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس جہاں میں ایسے بھی ہوں جنہیں پائدان بن کر ہی زندگی بسر کرنے میں ہی لطف ملتا ہو لیکن مجھے یہ احساس رہا گویا لذیذ کھانا پکا کر اس میں کسی نے ریت کا بگھار لگا دیا ہو۔ چاہے جانے کی آرزو کو میں دل میں دباتا رہتا ہوں اور وہ بظاہر دب بھی جاتی ہے لیکن پھر دھواں سا بن کر میرے ہر بن مو سے پھوٹتی ہے۔ یہ وہ خواہش ہے جو کبھی کبھی مجسم انکساری کا روپ دھار لیتی ہے کبھی فرعون صورت بن کر الف ہو جاتی ہے۔ اپنا سر ٹکرانے کو ساحل نہیں پاتی تو دوسروں کے دلوں کو پاش پاش کئے جاتی ہے۔ تھک کر سجدہ ریز ہونے کیلئے کوئی مجسمہ کوئی بت کوئی مسکن نظر نہیں آتا تو کلٹا کے ہر ہر منظر کے سامنے جھکتی ہے۔ روتی ہے اور سسکے ہی جاتی ہے۔ یہی کچلی ہوئی منہ بند خواہش میری غزلوں کا ماحصل ہے۔ یہی تہی دامن شکست آشنا آرزو میری کشش ہے۔

اسی کشش کے آگے بالآخر صائمہ کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پتہ نہیں صائمہ خوبصورت تھی کہ اس کے سینٹ، جوتے، زیور، کپڑے مہنگی دکانوں سے آتے تھے؟ خدا جانے میں اس کی شخصیت سے مرعوب تھا کہ اس کے باپ کی دولت کا رعب مجھے لے ڈوبا۔ خدا جانے یہ شعلہ رو دبلی پتلی کٹے بالوں والی صائمہ کا اثر تھا کہ میں شارٹ کٹ کے رستے اونچی سوسائٹی کا جزو بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بہر کیف میں کئی برس صائمہ کے خیالوں میں اس طرح گم رہا کہ جیسے کنوئیں میں لگنے والا ٹوٹا زار ریز رہا کرتا ہے۔ صائمہ اور میری محبت میں رسہ کشی کی کیفیت تھی.... جب دو شخصیتیں مکمل طور پر مدغم ہونے کی صلاحیت نہ رکھیں اور اپنی اپنی اکائی کا بچاؤ کرتی رہیں تو اکھاڑے کی سی محبت جنم لیتی ہے جس میں پچھاڑنے کی آرزو فریقین کی جانب سے ابھرتی رہتی ہے۔

میں چاہتا تھا کہ صائمہ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرے بغیر ادھوری ہو۔ اس کی ہر خوشی میری ذات سے وابستہ ہو۔ اس کا ہر لمحہ میرے وجود سے آباد ہو. . . . . صائمہ محبت کو فون کی طرح استعمال کرتی تھی کہ ضرورت پڑی تو نمبر ملا لیا ورنہ چونگا کریڈل سے اتار کر میٹھی نیند سو گئے۔ صائمہ نے بہت سارے برس مجھ سے محبت کی ٹیبل MANNERS والی محبت۔ وہ مجھ پر سینما کی ریزرو سیٹ کا آرڈر لگا کر خود یہ بھول گئی کہ میں اس آرڈر کی وجہ سے ہمیشہ خالی بیٹھا رہا۔

صائمہ سے محبت کے یہ سال کان کان پانی میں گزرے۔ کئی بار میں نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ اس نے محبت سے انکار کیا لیکن شادی پر رضامند ہو گئی۔ کئی بار اس نے شادی سے انکار کر دیا لیکن محبت کا اقرار گرمجوشی سے کرتی رہی۔ صائمہ کے پاس دراصل معاشی، تعلیمی، مذہبی ایسے کوئی فرسودہ عقائد نہ تھے جن کو مضبوطی سے پکڑ کر متوسط طبقے کے لوگ عموماً زندگی کی راہ سے بخوف و خطر نکل سکتے ہیں۔ وہ مغربی لوگوں کی طرح نظریوں کو شخصی آزادی کی موت سمجھتی تھی۔ وہ بیرونی ممالک کے سکول کالجوں میں پڑھی تھی جہاں نوجوان طبقہ ساری مراعات حاصل کرنے کے بعد خودکشی کی دہلیز پر کھڑا مسکراتا ہے۔

صائمہ کے نزدیک جنس اور محبت بالکل دو اکائیاں تھیں۔ برابر ساتھ ساتھ ہوں تو گیارہ کے بنا ہے

کی طرح مضبوط ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ایسے ممکن نہ ہو تو پھر بھی ایک کی مفرد حیثیت مسلّم رہتی ہے۔ میں مشرق کی غزل میں پلا تھا۔ میں نے پریوں کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں نے ایسے آدرشوں کو پلّے باندھ رکھا تھا جو زبانی کلامی غیر فانی ہوا کرتے ہیں۔

صائمہ زندگی تھی . . . . . میں خواب تھا۔

اس بیّن فرق کے باوجود میں دل ہی دل میں صائمہ سے کہتا کہ چاہے میرا خدا ایسا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اسے میرے دل کے شوالے میں رہنے دو جس طرح بستر سونے کے کام آتا ہے اور ساتھ ساتھ اندھیری راتوں میں اس پر آنسو بھی جذب ہوتے ہیں۔ اسی طرح میرا خدا میری ذات کی ہر پاکی، پلیدی کو جذب کرنے کیلئے ضروری ہے۔ میں اچھا ہوں تو اس سے جزا طلب کر سکتا ہوں۔ گناہ گار ہوں تو اس سے عفو کا طالب ہو سکتا ہوں۔

صائمہ کے پاس حب الوطنی کا کوئی نظریہ نہ تھا کیونکہ اس نظریے کو انسان دوستی ہڑپ کر گئی تھی . . . . . اور انسان دوستی اس لئے بے معنی تھی کہ آگے نہ کوئی رسول تھا نہ خدا نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی راہ . . . . . شادی اور محبت کھوکھلے قہقہوں کی طرح تھے۔ صائمہ کی ساری تعلیم نظریوں کے ابتلا کی کہانی تھی۔ یہ چھوٹے بڑے سانپ تھے جو ہر وقت ایکدوسرے کو کھانے کی دھن میں مگن تھے۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ صائمہ سے کہوں۔ صائمہ! یہ لوگ جن کی تعلیم نے تم کو شخصی آزادی اور فرد کی اہمیت کا اس قدر پکا احساس دلایا ہے جو اجتماعی زندگی کو خاندان کی بقا سے لے کر سوشلزم کے اجتماع تک انسانی روح کی موت تصور کرتے ہیں۔ ذرا ایک بار غور سے انکی جدوجہد کا اندازہ لگا کر مجھے جواب دو۔ بچپن ان کا اس لئے خراب گزرتا ہے کہ شادی شدہ جوڑے شخصی آزادی کو حق سمجھ کر بچوں کو لاوارث چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بچے تو پی آئی اے کے انڈوں سے بھی بدتر حالت میں وقت بسر کرتے ہیں جنہیں اگر باپ کا سایہ میسر نہیں تو کم از کم ماں کی آغوش تو مل جاتی ہے . . . . . جوانی اور بلوغ کا عہد ان کا اس قدر ہیجانی، طوفانی اور تجرباتی گزرتا ہے کہ ایل ایس ڈی سے لیکر جنسی عیاشی کے ہر پہلو پر وہ پہلے سے تھیسس بنا کر ہر قسم کے نشے سے زندگی بھر کیلئے محروم ہو جاتے ہیں۔ درمیانی عمر میں وہاں آدمی

ضعیف الاعتقادی کی لذت سے محروم ہوتا ہے۔ خاندان کی کھونٹی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ تصور کرم خوردہ کاغذ کی طرح پہلے ہی راکھ ہو چکا ہوتا ہے۔ بڑھاپا پنشن گھروں میں گزرتا ہے . . . . . بچوں سے دُور . . . . . جوانوں سے دُور . . . . . تعلقوں سے دُور،

میں صائمہ سے کہنا چاہتا . . . . . میرے پاس محبت، خدا، خاندان، وطن کے فرسودہ سہارے رہنے دو۔ میں اس آدمی کی طرح آنکھوں پہ پٹی باندھ کر چلنا چاہتا ہوں جو اندھا نہیں پر دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے محبت کے لافانی خواب پہ اعتماد کرنے دو۔ مجھے یقین کرنے دو کہ ہر چاہنے والا مرد اور جانثار عورت جب ہم آغوش ہوتے ہیں تو یہ ایک اکائی ہوتی ہے گیارہ کا ہندسہ نہیں ہوتا مجھے اعتبار کرنے دو کہ خدا سب کچھ دیکھتا، سنتا اور انصاف کرتا ہے۔ مجھے اپنے وطن کیلئے جھگڑنے دو۔ مجھے اپنے رسول سے محبت کرنے دو کیونکہ صرف وہی ایک مثبت اور واضح ثبوت میرے اور میرے رب کے درمیان ہے۔ لیکن صائمہ کا تلفظ اس قدر شائستہ تھا۔ ڈیموکریسی سے لیکر FREE LOVE تک اسکی تاویلیں اسقدر جاندار تھیں کہ میں گونگے، بہرے، اندھے کی طرح اپنا آپ مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیتا۔

وہ مجھے مسلسل بلوتی رہتی . . . . . بلوتی رہتی۔ چھاچھ کو بلوتے رہنے سے مکھن نہیں نکلتا صرف سطح پر جھاگ ہی جھاگ پیدا ہو جاتی ہے . . . . . یہی حال میرا تھا۔ صائمہ نے میرے سارے وجود کو جھاگ میں بدل دیا۔ اس کی آغوش میں سر رکھے کبھی کبھی میں بہت دور نکل جاتا۔

میں سوچتا شاید دنیا کے کسی گوشے میں، افریقہ کے ایک چھتنارے جنگل میں کسی گھونٹے پر سے مکھی پہ سے جھلتے ہوئے لبنان کے کسی گرم تنور کے پاس، میکسیکو میں کسی گدھے پر سوار تھائی لینڈ میں سارنگ پہنے ہوئے، سندربن میں سندری درخت کے سائے تلے کہیں کسی جگہ یہاں وہاں اس کائنات میں ایک عورت میری طرح ہراساں ہے۔ جب ابدی گھڑی کے مطابق ایک دن . . . . . کسی معین دن اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آئے گا۔ ہم قرن اور صدیاں ساتھ رہیں گے اور ہمیں ایکدوسرے کے بعد کسی اور کا سہارا نہ لینا پڑے گا۔ اس ملن کے بعد ہماری اکائی میں ہر تیسرا آدمی مخل ہوگا۔ ہمیں دل

لگانے کیلئے دوسرے لوگ، پارٹیاں، سینما گھر، بازار، گالف، ٹیلی وژن، بیرونی ممالک کی سیاحت کے جھوٹے سہارے نہ لینے پڑیں گے۔

جہاں ہم دونوں کی اکائی ہوگی وہاں انصاف ہوگا..... امن ہوگا..... امید ہوگی..... دل کو خوش رکھنے کیلئے اس جنت کا تصور خوب تھا۔ لیکن خدا جانے اس تصور کو بال بیرنگ کیوں لگے ہوئے تھے۔ ہلکے سے دھکے سے کہیں کا کہیں نکل جاتا۔

صائمہ میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اسے اپنی تعلیم پر پختہ یقین تھا۔ مشکل ساری میرے لئے تھی جو اپنے فرسودہ نظریات کو پھٹے ہوئے بادبانوں کی طرح چور نظروں سے دیکھا کرتا تھا اور مکمل طور پر ان کا ہم خیال بھی نہ ہو سکتا تھا۔

جس روز برسوں کے انتظار کے بعد میری شادی صائمہ سے ہوئی اس روز ہم نے سگریٹ کے اتنے کش لگائے کہ حجلۂ عروسی دھوئیں سے بھر گیا اور اس دھوئیں میں پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میری دلہن کنواری نہیں۔ اس بات کا اعتراف اس نے مجھ سے خود کیا.....

"امید ہے آپ اتنے اولڈ فیشن آدمی نہیں ہیں جو شادی کے وقت دلہن سے کنواری ہونے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

صائمہ کے لہجے میں نہ لجاجت تھی نہ احساسِ گناہ نہ وہ میرا منہ چڑا رہی تھی نہ میری دلآزاری کر رہی تھی۔ وہ بالکل دوستوں کی طرح آلتی پالتی مارے میرے سامنے بیٹھی مجھ سے بڑی جامع UNDERSTANDING کی توقع رکھتی تھی۔

حالانکہ کنوارپن کے متعلق میں بھی کچھ ایسا کٹر نہ تھا لیکن اس وقت مجھے لگا جیسے کسی احمق نے کٹ گلاس کا گلدان کھڑکی کی سل پر رکھ دیا ہو اور وہ ہوا کے تیز جھونکے سے لڑھک کر فرش پر جا گرا ہو۔
خدا جانے میرے چہرے میں کوئی بات تھی یا میری سانس نے چغلی کھائی تھی اسی لئے صائمہ نے میرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا..... "سنو! انسان کی بقا اسی میں ہے کہ ذہن کے دریچے ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ نئے نظریات کی تازہ اور معطر ہوا ان میں سے آتی جاتی رہے۔ نظریہ چاہے پولیٹیکل ہو، مذہبی ہو

کلچر سے تعلق رکھے یا جنس سے بالآخر نظریہ ہوتا ہے اور اس کی نفی کی ہر وقت گنجائش رہتی ہے۔ انسان کی سوچ سیال ہے زندہ ہے۔ اسی لئے وقت کا استرا، تجربے کی ریتی، دوسروں کی سوچ اس کے خیالات کو تراشتی رہے گی۔ یہ مسلسل عمل ہے..... اور نامعلوم طریقے سے جاری رہتا ہے اور اندر سے گرے تنا، سبزی مائل نکل آتا ہے پھر چھال سخت ہو جاتی ہے..... پھر اور تنا نکلتا ہے..... یہ تو ایک PROCESS ہے..... لمبا..... زندگی جتنا لمبا.....؛

صائمہ کی تعلیم تھی یا میرے تنگ نظریات کی تہی دامانی تھی۔ خدا جانے اس کی آواز کا لوچ تھا کہ منطق کی روانی..... اس روز پہلی بار میں نے محسوس کیا میں نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کیا اور صائمہ کے ساتھ زندگی بسر کرنا ایک عبادت ہو۔ اس نے میری گردن میں اپنا بازو حمائل کیا اور بولی:

"تم دراصل چھوٹے سکولوں میں جے وی ماسٹروں سے پڑھے ہو۔ تم نے شادی محبت اور جنس کا تصور جن سے مستعار لیا وہ مڈل کلاس کی MORALITY کے حامل تھے۔ جنس اور محبت دراصل دو قطعی مختلف چیزیں ہیں۔ کبھی کبھی لوگ خاص کر پڑھے لکھے جاہل ان دونوں کو یکجا کر دیتے ہیں۔ پانی اور وہسکی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ عموماً انہیں ملا کر پینے کے عادی ہیں۔ سیکس وہسکی کی طرح دماغ کو چڑھ جاتی ہے اور پانی زندگی کی بقا ہے"۔

محبت کی طرح..... سانس کی طرح.....

یہ وقت بھاگ جانے کا تھا۔

یہ وقت وہسکی اور پانی دونوں سے انکار کرنے کا تھا۔

لیکن صائمہ نے جو کچھ بھی دیا میں نے قبول کیا اور ایک بار بھی سوال نہ کیا کہ صائمہ!..... جو کچھ تم مجھے سکھا رہی ہو وہ میری پریوں کی کہانی کی نفی تو نہیں..... کیا تم تھوڑی دیر کیلئے اپنے ذہن کا دریچہ نہیں کھول سکتیں؟ کیا ہم دونوں ہی نظریات کے خدا نہیں پوج رہے؟..... کیا جتنی آزادی تمہیں اپنے مسلک پہ کاربند رہنے کی ہے..... کیا میں بھی ڈرتے ڈرتے اپنے مسلک کیلئے ہاتھ اٹھاؤں اور امید رکھوں کہ میری بھی شنوائی ہوگی۔ کیا تم اپنے دین پر اور میں اپنے دین پر قائم رہ کر ساتھ ساتھ قدم

نہیں اٹھا سکتے۔ کیا سوچ کی انفرادیت مٹائے بغیر ایک انسان دوسرے انسان سے محبت نہیں کر سکتا۔
میرے سامنے مہمانوں اور طلبا کا چہرہ در چہرہ امید سے روشن ہے ... وہ مجھ سے ایسی باتیں سننا چاہتے ہیں جو ان کے شکوک رفع کر دیں لیکن کچھ اس طرح کہ پرانی تعلیم مجروح نہ ہو۔ سائنس کی اس طرح رواداری ہو کہ مذہب جو انہیں ماں کی آغوش سے ملا ہے اس کی دل شکنی نہ ہو۔ یورپ کی آزادی مل جائے لیکن مشرق میں خاندان کے تصور کی جو سالمیت ہے وہ برقرار رہے ..... وہ منفی اور مثبت کو یکجا دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نفر کابت توڑے بغیر دین کی پرستش جاری ہو جائے۔

میں جی ہی جی میں ہنستا ہوں۔ تضاد کی آرزو میں لپٹی ہوئی یہ دروپدی میرے سامنے ہے۔ اس کے اوپر نظریوں کی جو ساڑھی بندھی ہے اتنی پھسلنی اور بل دار ہے کہ اگر میں صدیاں بھی یہ پیرہن کھولتا رہوں تو انسان کی اصل برہنگی پہ ہم سب کی نظر نہ پہنچ سکے گی۔ انسان کا جسم نہیں بلکہ اسکی روح اس کی سائیکی یک آگ اور پانی سے تشکیل ہوئی ہے۔ تضاد کی تشفی کے لئے میرے پاس کچھ نہیں پرنسپل صاحب کے خط میں اس بات پہ خاص طور پر زور دیا گیا تھا کہ میں عبوری دور کے نوجوان کیلئے جو مشرق کے پالنے میں پلا اور جس نے مغربی تعلیم پائی ہو اس بھونچکے نوجوان کو ضرور کوئی پیغام دوں۔
لیکن میرے پاس ایسا کوئی نظریہ موجود نہیں جو تضاد کے ساحلوں پہ پل کی مانند استوار ہو جائے پرنسپل صاحب کی آرزو ہے کہ میں کلچروں کے فرق مٹا کر انسان دوستی کی فضا قائم کر دوں۔ ان کا خیال ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز، غریبی امیری کا فرق، مختلف زبانوں کے لب و لہجہ کا بُعد، جغرافیائی حدود دراصل ساری نظر باقی اونچ نیچ وہ پھین ہے جو دودھ کو جوش دیتے وقت سطح پر آ چڑھتا ہے۔ اندر سے بنی نوعِ انسان ایک ہے۔

میں پرنسپل صاحب کی آرزو میں تو برابر کا شریک ہوں لیکن خوب جانتا ہوں کہ اگر نظریے باقی نہ رہے۔ اگر یک رنگی پیدا ہو گئی ..... تو غالباً انسان میں نہ کوئی BOILING POINT باقی رہے گا نہ اس کے منجمد ہونے کی کوئی سطح باقی رہ جائے گی ..... پھر انسان فرشتہ بن جائیگا

جو غالباً اس کا مفہوم نہیں ہے۔ یک رنگی اللہ کی مشیت نہیں ہے۔
میں مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہوں۔ سامنے وہ لوگ ہیں جو مجھے ہاتھوں ہاتھ لینے کی فکر میں ہیں لیکن اس وقت میرا وجود ایک کتبے کی طرح بالکل تنہا اور سرد ہے۔
مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہماری خالہ اس مٹی سے بنی تھیں جس سے پیر پیغمبروں کی مائیں اللہ میاں بنایا کرتا تھا۔ میں نے انہیں پورے ۲۲ سال کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ انہیں کبھی غصہ نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ انصاف کرتی تھیں۔ کسی بچے کی طرف ان کا میلان زیادہ نہ ہوا۔ ان کے سینے پر تضاد کی صلیب نہیں لٹکتی تھی۔ ململ کے دوپٹے میں ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر میں ہمیشہ نظریں جھکا کر پنجوں کے بل چلنے لگتا اور میری آواز اندر ہی اندر کہیں گم ہو جاتی۔
میری خالہ ہمیں کبھی کبھی پکنک پہ لیجاتی تھی۔
لیکن یہ پکنک ہمیشہ ایک قبرستان میں منائی جاتی اور مُردوں کے احترام میں ہر کام آہستہ آہستہ اور چپ چاپ ہو کر کیا جاتا۔
یہ قبرستان پہاڑ کے وسط میں واقع تھا اونچے دیودار اور چیڑھ کے درختوں سے گھرا تھا۔ دھند ان درختوں میں رینگتی پھرتی اور بجری والی سڑک کے ننھے ننھے سنگریزے ہاتھ لگانے پر بھیگے بھیگے لگتے۔ گوروں کے اس قبرستان میں زیادہ تر ان لوگوں کی قبریں تھیں جو ۱۹۰۵ء کے زلزلے میں اچانک جاں بحق ہو گئے۔ اسی جگہ لارڈ ایلگن کی وہ قبر بھی تھی جس کے گرداگرد لوہے کی موٹی سی زنجیر جنگلے کی صورت میں کھنچی تھی۔ قبر کے بائیں پہلو میں ایک پتھریلا سیلا سیلا گرجا تھا۔ اس گرجے کو دیکھ کر خدا جانے کیوں میکبتھ کھیل کا خیال آجایا کرتا۔
بجری کی روشوں، ڈیلیا کے پھولوں اور اَن گنت خوبصورت قبروں کے درمیان ایک گلابی رنگ کی قبر تھی۔ اس کا سنگِ مرمر جس میں باریک شریانوں جیسے ریشے تھے۔ اٹلی سے برآمد کیا ہوا تھا۔ اس کی سطح فارمائیکا کی طرح پھسلنی اور رنگ کسی یورپین بچے کے ہونٹوں کا سا تھا۔ اس قبر میں استراحت کرنیوالی لیڈی نے بھی اچانک زلزلے کی رات جان دی تھی۔

میں اس قبر کے اندر اور باہر دونوں جگہ موجود ہوتا مجھے ہمیشہ لگتا جیسے اندر دفن ہونے والی زلزلے میں جاں بحق ہونے والی لیڈی بھی میں ہوں اور باہر آہستہ آہستہ ہاتھ ملنے والا وجود بھی دراصل اسی عورت کا ہے جو قبر کے اندر ہے۔ میں کئی کئی گھنٹے اس قبر کے پائنتی بیٹھا رہتا۔ یہ آرام گاہ مجھے اپنی لگتی۔ اس میں سو کر اپنے اوپر آنسو بہا کر مجھے عجیب قسم کا سکون ملتا۔

اتنے برس گزر جانے کے بعد۔۔۔۔

اتنا بہت کچھ پا لینے کے باوجود۔۔۔۔

اس قدر نامور ہونے کے باوصف مجھے بہت بار یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ یہاں لوگ زندہ بھی ہیں اور اپنی اپنی قبروں پر کھڑے رو بھی رہے ہیں۔ یہاں زندگی کے قبرستان میں میں پکنک منانے آ گیا ہوں۔ اپنی گلابی قبر کے پاس کافی پیتے ہوئے نوجوانوں کو چکمہ دوں کہ زندگی دراصل ڈیلیئے کا پھول ہے۔۔۔۔ گلابی سنگِ مرمر نہیں ہے۔

میں کسی کو کیا سکھا سکتا ہوں؟

میں کسی کو کونسا نظریہ بخش سکتا ہوں جبکہ میرے اپنے بٹن ہول میں ہمیشہ سوکھی ٹہنی لگی ہوتی ہے۔ مروجہ اصولوں کے مطابق کارنیشن کا پھول نہیں ہوتا۔ میں نظریوں کی جنگ نہیں لڑ سکتا۔ میں نوجوانوں سے ہاتھ ملا کر نہیں کہہ سکتا کہ انصاف بالآخر ملتا ہے۔۔۔۔ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے اور سانچ کو آنچ نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ۔۔۔۔

امیری اور غریبی کے فرق نے جتنے دل دکھائے ہیں ان کی تلافی کب اور کہاں ہوگی؟

کبھی سفید قومیں سیاہ جلد والی قوموں کو بغیر احساسِ گناہ یا احساسِ برتری کے گلے لگا سکیں گی؟

کبھی ایسا وقت آئے گا کہ کلچر کے تمام فرق مٹ جائیں گے اور آدمی آدمی کو اس طرح ملے گا جیسے ایک حمام میں سبھی ننگے ہوں۔

نظریات کی یہ لمبی چوڑی جنگ جو نسلِ انسانی کو بانٹتے ہوئے ہے اتنے سارے لفظوں کو جنگ کو میں کس طرح ڈھاکہ کی ململ سمجھ کر ایک ماچس کی ڈبیا میں بند کر کے ان طلباء کے سامنے پیش کر دوں؟ میں جو صائمہ کا یہ چھوٹا سا نظریہ نہیں سمجھ پایا کہ جنس اور چیز ہے اور محبت اور کیفیت کا نام ہے۔ جب میں خود اس قدر تنگ نظری کا شکار ہوں تو اپنے خطبے میں وسیع القلبی کا ثبوت کیونکر دوں؟ میں صائمہ کے نظریے کیلئے کوئی انکار کے لفظ ڈھونڈ نہیں پاتا۔ میں اس کے نظریے سے اقرار کی کوئی قوت بھی اپنے دل میں نہیں ڈھونڈ سکتا۔ میں بہت جاگتا ہوں۔۔۔۔ بہت سوچتا ہوں اور اپنے آپکو سمجھاتا ہوں کہ دل اور جسم کی بھوک کے دو منبع ہیں اور دونوں کا نقطۂ اتصال کہیں نہیں اور پھر کہیں سے میرے دل کے اندر سے کوئی آواز پوچھتی ہے۔۔۔۔ اور وہ جو پریوں کی کہانیوں میں لکھا ہوتا تھا۔۔۔۔

اور پھر وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔۔۔۔ اس جملے کے کیا معنی ہیں؟

انسان کے بڑھنے پھولنے کے طریق نے اس سے سب مسرتیں چھین لی ہیں۔ یہ ساری قیمت جو زندگی ہم سے وصول کرتی ہے آگہی کی قیمت ہے لیکن یہ سارے لوگ جو مجھ سے کسی خاص ٹھوس نکتۂ نظر کی روشنی مانگنے آئے ہیں۔ انہیں میں کیا بتاؤں کہ تم نے اگر سوچا تو خوشی کو ہاتھ سے گنوا لو گے۔۔۔ اور اگر خوش رہنے کا طریق سیکھ لیا تو ساری عمر آگہی کی لذت سے ناآشنا رہو گے۔۔۔۔ انہیں میں کیسے بتاؤں کہ تعلیم فقط امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ تہذیب کا آغاز کرتی ہے، شعور کو بیدار کر کے چھوڑ دیتی ہے اور جب یہ تثلیث خوابیدہ نہیں رہتی تو پھر آدمی پھیلنے پھولنے لگتا ہے لیکن آہستہ آہستہ خوشی کا ایک ایک پتہ اس کا وجود چھوڑ دیتا ہے۔ اس درس گاہ میں جہاں تمام طلبہ تعلیم کی تلاش میں آئے ہیں۔ میں انہیں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ دوستو!۔۔۔۔ آگہی کے دروازے اپنے آپ پر بند کر لو۔ میں ان نوبالغ ذہنوں کو کیسے بتاؤں کہ پھر تم اپنی نشوونما کو قطع برید کر کے ایسے درخت بن جاؤ جو جاپان میں ہوتے ہیں۔ جن کی عمر کئی سو سال ہوتی ہے لیکن جو جسامت میں بالشت بھر ہوتے ہیں۔

اپنے خیالات کے چکر پھیروں سے نکل کر میں کہتا ہوں:

"خواتین و حضرات!

تنگ نظری پستول کی وہ گولی ہے جس کا ایکشن اور ری ایکشن بالکل برابر ہے۔ تنگ نظر نہ صرف

اگلے کے سینے میں پستول داغ دیتا ہے بلکہ یہ گولی اس کی اپنی شخصیت کو مجروح کر کے نکل جاتی ہے
دوسرے آدمی کا نکتۂ نظر سمجھنے کیلئے اپنا دماغ ہمیشہ کھلا رکھیں۔ دوسروں کے مذاہب، کلچر، سیاسی،
اقتصادی، اخلاقی نظریوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ سچائی کی رمق ادھر بھی ہو۔ ۔ ۔ ۔ انسان
کی ترقی اور بقا اسی میں ہے کہ دوسروں کے جوتوں میں کھڑے ہو کر سوچنے کی عادت ڈال لے۔

ہال میں تالیوں کا شور زخمی کبوتروں کی طرح پھڑپھڑا رہا ہے۔

میری گردن کندھے اور سینے پر صائمہ کے ٹھنڈے گرم آنسو ٹوٹ رہے ہیں۔

میں کسی ایک نظریے کا حامل نہیں ہو سکتا۔ کئی گڈمڈ کیفیتیں آج میرے ذہن پر دستک دے
رہی ہیں۔ آج میں قبر کے اندر بھی ہوں اور باہر بھی کھڑا سوگ منا رہا ہوں۔ آج میں مجسم نیکی بھی ہوں اور
میرے اندر ہابیل قابیل کی بدی بھی پرتول رہی ہے۔ آج میں مکمل انسان ہوں کیونکہ آج میرے سینے
پر تضاد کی صلیب عین دل کے قریب چمک رہی ہے۔

آج میری صائمہ کئی مہینے بعد میرے پاس لوٹ آئی ہے اور میں ہنٹر بیف کی طرح ٹھنڈا گوشت بن
گیا ہوں۔ اس کے ساتھ اس کا ہونے والا بچہ بھی ہے۔ اس کی بھاری بھاری آواز میرے کان کی لو سے
ٹکرا کر سنا رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صائمہ جس کی روح کو میں نے قید کرنا چاہا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جس کے جسم کو
میں نے آزاد رہنے دیا وہ صائمہ کہہ رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ "میں تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گی کیونکہ مجھے تم
سے محبت ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ مجھے ہمیشہ تم سے محبت رہی ہے۔ اب میں تم سے زندگی کا
کوئی راز چھپا کر نہیں رکھوں گی۔ یہ بچہ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میرا بچہ جو تمہارا بچہ کہلائے گا تمہارا بچہ نہیں ہے لیکن
تمہاری شفقت سے مجھے یہی امید ہے کہ تم اسے اصلی باپ کی شفقت دو گے۔ تمہارا دل شاعر کا دل ہے
کائنات کا دل ہے۔ اس میں انسان کی تمام برائیاں بھی جگہ پاتی رہیں۔ ۔ ۔ ۔ یہاں۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے
سینے میں وہ ساری نیکی موجود ہے جو انسان کی معراج ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

صائمہ کے آنسو میری گردن پر ہیں۔ ۔ ۔ ۔

- میں جانتا ہوں کہ میں ساری زندگی اس کے بچے سے محبت کروں گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ

ساری ہی عمر مجھے اس بچے سے نفرت رہے گی اور میں ساری عمر اس نفرت کا اظہار نہ کر سکوں گا
کیونکہ مجھے اپنی محبت اور اپنی نفرت کسی پر بھی کلی یقین نہیں ہے۔

میں قبر کے اندر بھی رہوں گا اور باہر بھی۔

ایک نوجوان پروفیسر سپاس نامہ پڑھ رہا ہے۔

"ایسے خوش نصیب لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کی ہر خواہش کائنات خود
پوری کرتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دولت، ثروت، شہرت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کونسی چیز ہے جس
سے خدا نے انہیں نہیں نوازا"

آواز مجھ سے جیسے دور بچھڑ چکی ہے۔

میں گردن جھکائے سرخ کرسی میں ایک نامطلوب مہمان کی طرح بیٹھا ہوں۔

میں جب دنیا میں آیا تو کسی کو خوشی نہ ہوئی۔

اور اب جب میرا بیٹا اس دنیا میں آئے گا تو وہ بھی میری طرح ہی نامطلوب ہو گا۔

اپنے وجود کی ناکامی سے لیکر اپنے بیٹے کے لاوارث وجود تک گلابی سنگ مرمر کی کئی منزلیں
ہیں۔ لیکن آج میں اس جلسے کو جلد چھوڑ جانا چاہتا ہوں کیونکہ آج میرے نام خوشی کی ایک اور بلٹی آنے
والی ہے۔ اگر اللہ اور انسان کا وقت ایک سا ہوتا تو خوشی کی بوگیاں ہمیشہ وقت پر آتیں۔ پارسلوں پر
صدیوں پہلے مر کھپ جانے والے بے نیل و مرام آدمیوں کے نام درج نہ ہوتے لیکن اب تو صدیاں
پہلے روانہ کئے ہوئے پارسل کو چھڑانے جانا ہی پڑتا ہے۔ دیکھئے میرے نام کی بلٹی میں سے لڑکا نکلتا
ہے یا لڑکی؟

دیکھئے اس نومولود کے سینے پر تضاد کی صلیب ہوتی ہے کہ نہیں؟

امر بیل

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ ہائی سنتھ کے پھول لگتے ہیں۔

تم نے کبھی ہائی سنتھ کا پھول دیکھا ہے نازری؟

ہائی سنتھ کا پھول جس کی پنکھڑیوں پہ تاسف کے آنسو منجمد ہوں اور جس کی مخملیں جِلد سے جدائی کی خوشبو آئے ـــــــ لیکن تم نے تو ہائی سنتھ کا پھول دیکھے بغیر ہی اپنے دل کے نہالچے پر کیوپڈ دیوتا کو سُلایا۔ اور پھر آپ ہی آپ ایک بات پچھلے پہر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ محبت کا کھیل گنجفہ کا کھیل نہیں ہوتا نازری ـــــــ پھر تم نے اسے بچوں کی بازی کیوں سمجھا۔ یہ تو ایک بجھارت ہے، ایک کہہ مکرنی ہے، ایک پہیلی ہے جس کی سمجھ برسوں نہیں آتی۔ تم تو ابھی فلیٹ بوٹ پہنتی تھیں۔ کندھے پر دو چوٹیوں میں سرخ ربن ڈالتی تھیں۔ تمہاری عمر آئس کریم کھانے اور نٹ بال کھیلنے کی تھی۔ پھر تم نے سانپ کی بانبی میں ہاتھ کیوں ڈالا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ پارے کا کشتہ اتنی آسانی سے بن جاتا ہے۔

تم نے محبت کیلئے جو ہدف چُنا وہ بڑا پُر پیچ تھا۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میری محبت تم سے مہ رخ کے توسط سے ہوئی۔ اگر وہ نجستہ صورت لیکن منحوس لڑکی میری زندگی میں نہ آتی تو تمہاری محبت کا سربند چشمہ میرے دل میں کبھی نہ پھوٹتا۔ تمہاری محبت میرے دل میں اس طرح بچھی ہے جیسے کسی پرانے مزار پر تازہ پھولوں کی چادر ـــــــ نئی عقیدت کا اظہار۔ اس مرقد میں تمہاری محبت دفن ہے اور تعویذ پر ہائی سنتھ کی پھولوں کی تازہ چادر رہتی ہے ـــــــ جن کے مومی وجود پر تاسف کے آنسو منجمد ہیں۔

ان کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے۔ موت کی ٹھنڈی باس اٹھتی ہے۔

آنڈرا سے پہلی ملاقات نیل کے کنارے ہوئی تھی۔ میں اپنے دیس واپس آرہا تھا اور وہ اپنے ہسپانیہ لوٹ رہی تھی۔ مسجدِ قرطبہ کے عقب میں رہنے والی آنڈرا جس کے چھپٹے سینے پر پلاٹینم کی صلیب آویزاں تھی، ہماری ملاقات چند روزہ تھی۔ بادام کے شگوفوں کی طرح معطر بیحد نازک اور اپنی موت کے احساس سے لرزاں۔ اس شام ہم دونوں ہوٹل سے اٹھ کر نیل کے ناسپاس پانیوں میں فاتلے آبیٹھے تھے۔ اندھیرا سست مدعی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا اور قاہرہ شہر کی بتیاں نیل کے ناسپاس پانیوں میں فانوس رنگ جل بجھ رہی تھیں۔ ان منعکس بتیوں کو دیکھ کر ہسپانیہ کی دخترنے کہا تھا :

"آصف! ان بتیوں کا اپنا تو کوئی وجود نہیں —— نہیں ہے ناں۔"

"کن بتیوں کا آنڈرا۔"

"جو بتیاں آپ ہی آپ نیل کے سینے سے آگئی ہیں۔ میلوں کا فاصلہ طے کرکے۔"

"نہیں —— "

آنڈرا لوناچاری تھی۔ جادوگرنی تھی۔ اس کا یمین ولیسار سیسہ پلائی دیوار کی طرح شکست سے ناآشنا تھا۔ اس میں کارمن کی روح تھی۔ وہ مسجدِ قرطبہ کی طرح خوبصورت اور جادو آفرین تھی لیکن نہ جانے اس روز ہمارے قیام کی آخری شام وہ شمع رو کیوں قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ اس کی ستواں ناک ضبط کئے ہوئے آنسوؤں کے باعث ٹیڑھی نظر آرہی تھی اور سینے کی چھپنی میں رُکی ہوئی آہوں نے زیروبم کا متواتر ساز چھیڑ رکھا تھا۔

"اس میں ان بتیوں کا بھی تو کوئی قصور نہیں جو قاہرہ میں جل رہی ہیں —— ہے نا —— "

مرد ہر لمحہ جرات ہیں بزدل بن جاتا ہے۔ وہ کچھار میں پناہ لینے والے شیر ببر کی مانند سویا رہنا چاہتا ہے۔ مجھ پر بھی اس وقت بزدلی طاری تھی۔ کوئی چیز فضا میں ایسی تھی جو نامانوس تھی جو بموں کی خوشبو سے مشابہ لیکن عطرِ حنا میں لپٹی گیس غبارے کی طرح اوپر اٹھ رہی تھی۔ شام پر انہوں نے

پن کی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔ مجھے.... لگ رہا تھا ... میں نہیں ہوں —— اور پھر بھی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میرا کوئی ماضی نہیں —— میرا حال بھی سائے کی مانند ہے جس کا اپنا کوئی وجود نہیں —— میں اس کیفیت سے ڈرتا تھا جیسے اپریشن ٹیبل سے بھاگ کر میں سڑکوں پر بلامقصد گھوم رہا ہوں اور میرے سر پہ میرے جسم، میری شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ شاں شاں کررہا ہے۔

"میری بات کا جواب دو آصف!"

اس کی بات کا ایک ہی جواب تھا کہ میں چپکے سے اٹھتا اور نیل کے پانیوں کو اپنا غیرمرئی حساس اور کلوروفارم سے مدہوش جسم سپرد کردیتا۔ لیکن میں نے اپنی بزدلی کو منسی ٹھٹھول میں چھپاتے ہوئے کہا —— "سیدھی بات کیا کرو۔ سمجھ میں آنے والی۔ ہر وقت کارمن بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔"

اس نے منہ پھیر لیا۔ نیلی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے وہ بولی:

"جو خواہ مخواہ کسی کا عکس اپنے دل میں ڈال لیں اور اُسے چھپائے رکھیں۔ .... وہ بیوقوف ہوتے ہیں ناں۔"

"خدا کیلئے اتنی خوبصورت شام کو تباہ نہ کرو۔"

لیکن آنڈرا کے اپنے وجود کے اندر خصی پرنالہ گر رہا تھا۔ اس کے اندر شکست وریخت کا ایک طوفان موجزن تھا۔ وہ شام رنگ لمحوں کی کیا پرواکرتی، بھڑک کر بولی : "اگر نیل ان بتیوں کو اپنے پانیوں میں یوں بسانا چاہتا ہے تو اس میں شہر کی بتیوں کا کیا قصور۔"

"تمہیں کیا ہوگیا ہے آنڈرا —— " میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

دور کسی ریڈیو پر ام کلثوم گا رہی تھی۔ ہر تان میں فی سبیل اللہ فی سبیل اللہ کی التجا تھی۔ میرے اردگرد رنگین چھتریاں، ان کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ، ان میں گھومنے پھرنے والے بیرے چرخے کی مال کی طرح گھومتے نظر آرہے تھے۔ آنڈرا نیم وا آنکھوں میں چقماق سے آنسو لئے بولی: ناں سنو

پھول کی کہانی سنی ہے تم نے"۔

"نہیں ——— اور میں سننا بھی نہیں چاہتا۔ میری ایک کزن مجھے فلمی کہانیاں سنایا کرتی ہے میں کبھی ان کے گھر نہیں جاتا"۔

"ہائی سنتھ کی کہانی فلمی نہیں ہے آصف۔ یہ تو دکھ کے پھول کی داستان ہے ——— ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن تھا"۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میری قوتِ مدافعت جواب دے چکی تھی۔ سارے میں زمستانی ہواؤں کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ چرخے کی مال گھوم رہی تھی اور اُم کلثوم التجا کر رہی تھی ——— رو رہی تھی۔ فی سبیل اللہ ——— فی سبیل اللہ۔

آنڈا اپنے آپ سے بولی ——— "کہتے ہیں کہ دیوتا اپالو کی دوستی ایک یونانی نوجوان سے تھی۔ ہائی سنتھ نامی یہ یونانی نوجوان حسن میں بے مثل تھا۔ انگور کے پتوں کا تاج پہنے اخروٹ کی لکڑی کی کمان سنبھالے چیتے کی کھال میں ملبوس جب وہ پہاڑیوں سے اترتا تو یونان کی دوشیزائیں پانی بھرنا بھول جاتیں۔ خود اپالو ——— سورج کی طرح پلک جھپکے بغیر اس کی طرف تکتا چلا جاتا ——— لیکن اپالو اور ہائی سنتھ کی دوستی چندروزہ تھی۔ اپنی موت کے احساس سے خود لرزاں۔ یہ بتاؤ آصف ہر خوبصورت چیز، ہر ملک ملاپ چندروزہ کیوں ہوتا ہے ——— کیوں ہوتا ہے۔ بتاؤ ناں؟"

میں چپ رہا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میرے منہ سے کچھ نہ نکلے۔

"سنو آصف۔ ابھی ہائی سنتھ اور اپالو پر محبت کی اوّلین سرشاری طاری تھی کہ ہائی سنتھ گیا۔ یہ بتاؤ جب محبت کا نشہ چڑھا ہو تب موت کا حادثہ ہو تو المیہ زیادہ ہے کہ محبت کا نشہ اتر جانے پر ——— یعنی دونوں میں سے کون سا بڑا المیہ ہے"۔

نیل کے پانی گنبد گونج بن کر میری طرف بڑھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اس کی کرسی پر جھک کر بولا ——— "یہ میری آخری شام ہے پردیس میں ——— اسے یوں مضمحل نہ کرو ——— آؤ بازار چلیں"۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولی ——— "تبھی کہا کرتے ہو کہ مشرق کے لوگ دل کے معاملے بہتر سمجھتے ہیں"۔

میں اس کے طعنے کا تھوتھا تیر کھا کر بیٹھ گیا اور وہ بولتی چلی گئی: "ہائی سنتھ کی قبر پر اپالو کے اتنے آنسو گرے کہ ایک دن قبر سے ایک پودے نے سر نکالا۔ ہولے ہولے اس میں شاخیں نکل آئیں اور پھر ایک پھول کھلا۔ ارغوانی رنگ کا ——— ہائی سنتھ کا پھول ——— جب اپنے دیس لوٹ جاؤ تو یاد رکھنا کہ آنڈا کو ہائی سنتھ کے پھولوں سے عشق تھا عشق ———"

میں نیل کے پانیوں میں جھلملاتی بتیوں کا رقص دیکھنے لگا ——— ارغوانی بتیاں ——— آسمانی بتیاں ——— گڈمڈ پھولوں کی قطاریں ——— آنڈا نے ایک چھوٹی سی سسکی لی سینے کے پہلو کی ہڈیوں میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آیا اور وہ میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی ——— "جانتے ہو۔ ہائی سنتھ کی پنکھڑیوں پر کیا لکھا ہوتا ہے ——— جانتے ہو آصف"۔

"نہیں ———"

اس کے ہاتھوں کا دباؤ شکنجے کی طرح بوجھل بھی تھا اور آسمان میں تیرنے والے پر کی مانند ہلکا بھی ———

"ہائی سنتھ پچھتاوے کا پھول ہے۔ محبت کا مدفن ہے۔ اس سے جدائی کی خوشبو آتی ہے اس میں تمناؤں کا لہو جھلملاتا ہے۔ اس کی ہر پنکھڑی پر لکھا ہوتا ہے افسوس ——— صد افسوس ———"

اس کی آنکھوں سے دو چھوٹے سے آنسو پھسلتے ہوئے مجھ پر آن گرے۔

"جب میں پاکستان آؤں گی تو مجھے تاج محل دکھاؤ گے ناں"۔

میں نے اس کے گریبان میں لٹکی ہوئی صلیب کو چھو کر کہا ——— "تاج محل ہندوستان میں ہے آنڈا ——— تمہیں اپنا ہمسفر بدلنا پڑے گا بارڈر پر ———"

آنڈا نے اب تک ضرور اپنا ہمسفر تلاش کر لیا ہو گا زری ——— یہ تم ہی تھیں کہ جس میں

سفرِ حیات کا حوصلہ نہ تھا۔ ورنہ راستہ چاہے جاں گسل ہی سہی لیکن اس راہ میں اور آبلہ پا بھی ملتے ہیں۔ آنڈا کا میری زندگی سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے بچوں کی نصابی کتابوں میں رنگین تصویروں کا وجود۔ ان تصویروں کا تعلق اصل متن سے ضمنی ہوتا ہے۔ اسی طرح آنڈا میری زندگی میں آئی اور چلی گئی۔ ایک طرح سے تو مہ رُخ بھی میری زندگی میں اصل متن نہیں ہے۔

جب بھی بارش آتی ہے زری اور بوندیں گرم مٹی سے لپٹ کر سوندھی خوشبو میں بھیگ جاتی ہیں میں تم کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں۔ تم اس خوشبو کی طرح تھیں۔ انوکھی، انجان ——— گرم اور سرد کے باہم اتصال کی خوبصورت دلیل ——— آج شام سے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی ان سیاہ بادلوں میں گھرائی پھرتی ہے۔ پہلے آسمان پر ایک سفید چادر لہرائی۔ پھر مشرق کی جانب سے اودی نیلی سیاہ سارھیوں کے تھان اڑ اڑ کر آنے لگے اور بہت جلد ان کپڑے کے تھانوں نے غف اونی تنبو کی شکل اختیار کر لی۔ اس تنبو کی طنابیں ابھی ٹھیک طور پر کسی بھی نہ گئی تھیں کہ جابجا غف کپڑے میں شگاف آ گئے۔ مینہ اس طرح برسا جیسے رکھیل عورت میکہ یاد کر کے رو دے۔ بارش کو دیکھ کر تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ مٹی کے گرم وجود سے لپٹی ہوئی ٹھنڈی بوندوں کی خوشبو اٹھی ——— کچھ لوگ کم ظرف اور پتیلے ہوتے ہیں۔ ان میں محبت کا مشکیزہ جب غٹ غٹ انگبیں گراتا ہے تو عموماً ان کا وجود گڈی کاغذ کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کچھ کیلئے محبت بھرنے اور اترنے کا موقع ہوتی ہے۔ وہ اُبچی بنے ہوا میں تلواریں مارتے ہیں۔ کچھ طفل زادے محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر کچے گھڑے کی طرح بے وقعت کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی فرعونوں میں میرا شمار بھی تھا لیکن مہ رخ سے ملنے کے بعد نہیں۔ اس وقت مجھے محبت اور محبت میں محرومی دونوں کا احساس پوری طرح ہو چکا تھا۔

جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تمہارے سینے پر دو لمبی لمبی چوٹیاں تھیں جن میں بل دیئے ہوئے سرخ ربن گڑھل کے پھولوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ تمہارے پیروں میں فلیٹ بوٹ، کانوں میں گول سنہری رِنگ اور کندھے پر سکول یونیفارم کا سرخ دوپٹہ تھا۔ تمہارے گال پکے ہوئے سیبوں کی طرح شنگرفی ہو رہے تھے۔ اس سرخی میں کسی آئرن ٹانک یا غازے کی آمیزش نہ تھی۔ اوپر والے لب پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے تھے۔ یہی پسینہ کسی معمر عورت کی بدصورتی کی وجہ ہو سکتا تھا لیکن تم پر یہ صحت اور تازگی کا اشتہار تھا۔ آنکھوں کے دونوں جانب دنبالہ دار سُرمہ تھا۔ بھاگتے تیر کی طرح پُرافشاں اور تیز رو۔

یہ عمر عشق و عاشقی کی عمر نہ تھی۔ یہ عمر سوڈا واٹر، لیمن ڈراپس اور آئس کریم کی عمر تھی۔ تم اگر چیونگم منہ میں، پچھڑتی کو لیے کو جُست قمیض میں لچکاتی بائی بائی کہہ کر میرے پاس سے گزر جاتیں تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ لیکن تم آکر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ تم نے نہ اپنی عمر پر ترس کھایا نہ اس مشکل راہ پر نظر کی جو تم نے اپنے لئے لمحوں میں انتخاب کر لی تھی۔ بس تم پر تو خبط اچھلا ——— اور تم میری محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ تمہاری طرف سے یہ پہلی نظر کی محبت تھی سا اس میں استانی جی سے والہانہ عشق کا دیوانہ پن بھی تھا۔ باپ سے دل شیفتگی بھی تھی اور ایک اور چیز بھی تھی جسے صرف تم ہی سمجھتی تھیں جو صرف تمہاری ہی رگِ جاں تھی۔

"میجر صاحب گھر پر ہیں بے بی؟"

بے بی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ڈیڈی نہیں ہیں جی۔ ممی ہیں اندر"

"تو انہیں جا کر بتایئے کہ آصف تنویر آیا ہے ——— آصف تنویر یاد رہے گا ناں؟"

"جی آصف تنویر صاحب ——— یاد رہے گا جی ———"

پھر تم جالی کا دروازہ کھول کر اندر بھاگ گئیں۔ گیلری میں تمہارے بھاگنے کی آواز آتی رہی۔ اس عمر میں بھاگنا کتنا فطری اور خوبصورت فعل ہے۔ ہرن کی قلانچوں سے مشابہ عربی گھوڑے کی جست کی طرح بے خوف چیتے کی طرح سڈول جسم کو فضا میں تولتے ہوئے بھاگنا۔ یہ نِمی بھاگنا نہ تھا۔ ٹپے کھاتی گیند کا سا دوڑنا تھا۔ چند ہی لمحوں میں تم واپس بھی آ گئیں۔

"جی ۔ اندر آجایئے۔ ممی بلا رہی ہیں۔"

تم مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ یہ بیٹھک یا دیوان خانہ کم تھا اور میجر اقبال کے شکار کئے ہوئے شیر چیتے، بارہ سنگھوں کا عجائب گھر زیادہ تھا۔ صوفوں پر ہرنوں کی ملائم گدم گوں کھالیں پڑی تھیں۔ آتش دان کے پاس دو چیتے مع اپنے چار بڑے بڑے خونخوار دانتوں اور نارنجی آنکھوں کے سر اٹھائے لیٹے تھے۔ کارنس پر بارہ سنگھے ٹنگے تھے۔ ان کے سینگ اخروٹ کی لکڑی کے بنے نظر آتے تھے۔ جا بجا ہاتھی دانت اور پیتل کا آرائشی سامان سجا تھا۔ سارے کمرے میں کملائے ہوئے چمڑے کی مہک تھی۔ تم مجھے کمرے میں بٹھاتے ہی پھر بھاگ گئیں۔ غالباً میں تمہارے رسی پہچاننے کے شغل میں مخل ہوا تھا۔

تمہاری ممی چند لمحے بعد تشریف لائیں۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ موٹی اور سانولی ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے نہایت دہشت انگیز قسم کی گلابی لپ سٹک بمقدار وافر استعمال کر رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کے بلاؤز اور بڑے بڑے پھولوں والی واش اینڈ ویر قسم کی ساڑھی میں وہ مجھے اپنے ماضی کا بھوت نظر آئیں۔

"ہیلو آصف ـــ بھئی بیٹھو بیٹھو ـــ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمہیں ڈھونڈھ ہی نکالیں گے ایک دن، لیکن اقبال کو تو سوائے شکار کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں ـــ زری ـــ زری ڈارلنگ ـــ"

"مجھے ابھی مال پر رانا حمید مل گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ اقبال کی تبدیلی لاہور ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا۔ اس نے تو گلوب سینما کی طرف کوٹھی بتائی تھی۔ آپ لوگ تو صدر بازار کی طرف رہتے ہیں۔"

"رانا حمید وہیں آئے تھے لیکن وہ کوٹھی مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ پانی کا پرابلم تھا۔ غسلخانوں میں سے نل چٹے نکلتے تھے۔ رات کے وقت بڑی سیلن رہا کرتی تھی۔ سارے قالین خراب ہو گئے وہاں ـــ آپ ابھی تک سیف گارڈ انشورنس میں ہی ہیں ناں ـــ زری ـــ

زری ڈارلنگ ۔ یہاں آؤ۔ انکل آئے ہیں۔"

"جی ہاں ۔ ابھی تک تو ان ہی لوگوں کے ساتھ دانہ پانی بندھا ہے۔"

"شادی ـــ ہو گئی کہ ابھی تک؟"

"ابھی تک نہیں۔"

تمہاری ممی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں اور تمہیں آواز دینے لگیں۔ تمہاری ممی ایک زمانے میں بڑی خوبصورت عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ نمک کی کان تھیں۔ نقشہ اور جسم ایسا تھا کہ سارے میں ان کا چرچا ہوتا تھا۔ اب وہ ایک بے جان تودے کی طرح سامنے کھڑی کسی اینگلو انڈین بڑھیا کی طرح تمہیں بلا رہی تھیں۔

تم آ کر پردوں کے پاس رک گئیں۔

"آجاؤ زری ڈارلنگ ـــ انکل آصف ہیں۔ تم ان سے اپنی BOOTIES پہنا کرتی تھیں۔ پنڈی کے دن بھی خوب تھے۔ ہے نا آصف۔" ممی بولیں۔

"جی ہاں۔ ویسی بے تکلفی کا دور پھر میں نے کبھی نہیں دیکھا ـــ یورپ میں بھی نہیں۔"

"کیسا انجوائے کرتے تھے ہم سب ـــ یاد ہے آصف؟ وہ مری کی پکنک یاد ہے تمہیں جس روز زری تقریباً مر ہی چلی تھی۔"

"میری بے وقوفی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر پانی میں اتار دیا تھا۔"

ممی کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

"زری ڈارلنگ۔ انکل کو کافی تو پلاؤ۔ یہ کیا بچوں کی طرح پردہ پکڑ کر کھڑی ہو۔ جاؤ بیٹے!"

تم پھر بھاگ گئیں اور تمہاری ممی مجھے پرانے دنوں کے واقعات یاد دلانے لگیں۔ ایسے واقعات جو بظاہر ہم دونوں کے لئے بالکل غیر اہم تھے۔

یہ میری تمہاری پہلی ملاقات تھی۔ اسی ملاقات میں کیوپڈ دیوتا نے تمہیں منتخب کر کے تمہاری دستار بندی کر دی۔ تمہارے لئے یہ ملاقات حرزِ جاں تھی۔ اس ملاقات کو تم نے ہیرے جڑی انگوٹھی

کی طرح بار بار پرکھا۔ ہر سمت سے دیکھا قریب سے دور سے۔ اس کی چمک میں تمہیں دھنک کے سارے رنگ نظر آنے لگے۔ تمہارے لڑکپن کی فصیل میں یہ پہلی دراڑ تھی۔ اس ملاقات کے بعد جب بھی میں تمہاری طرف گیا تمہاری خوشی دیکھ کر مجھے ایکدن بھی شبہات نے نہ گھیرا کیونکہ میں تو تمہیں اپنے ہاتھوں جُوتے پہنا چکا تھا تمہیں سائیکل کی سیر کرانا اور تمہاری چوٹیوں میں ربن ڈالنا بقول تمہاری ممی کے ایک زمانے میں میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ میں تمہاری خوشی کی اصل وجہ کبھی بھی جان نہ پاتا۔ اگر اچانک ایکدن تم سے ڈرامائی ملاقات نہ ہو جاتی۔

اقبال گھر پر نہیں تھا۔ تمہاری ممی اپنی کسی دوست کے ساتھ شاپنگ کو گئی ہوئی تھیں تم اپنی گیتوں کی کاپی لئے اکیلی آتشدان کے پاس بیٹھی تھیں۔

"ڈیڈی کہاں ہیں بے بی!"

"مرغابیوں کے شکار پہ گئے ہیں جی ——" تم نے یکدم کاپی کو پشت کی جانب چھپا لیا۔

"اور ممی کہاں ہیں بے بی؟"

"آپ جی مجھے بے بی نہ کہا کریں۔"

"کیوں؟"

تم نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا —— "کیونکہ جی —— کیونکہ —— بس جی —— آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔"

حکمت عملی کے خلاف جو حرکت مجھ سے اسوقت ہوئی وہ ناقابلِ معافی ہے۔ میں نے تمہیں قد آور بچہ سمجھ کر تمہارا بازو پکڑا اور صوفے پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"پتہ ہے تم بہت تنگ کیا کرتی تھیں پنڈی میں۔ کیا بات ہے زری! تم کانپ کیوں رہی ہو؟"

میرا بازو تمہارے کندھوں کے گرد حمائل تھا اور تم ڈری ہوئی کبوتری کی طرح لرز رہی تھیں۔

"کیا بات ہے زری! بخار تو نہیں کہیں ——" میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

تم خاموش رہیں۔

"تم ٹھیک تو ہو زری!"

تم نے اٹھنے کی کوشش کی تو تمہارے ہاتھ سے گیتوں کی کاپی پھسل کر قالین پر جا گری۔ دانت نکالے چیتے سے ایک فٹ ادھر۔ میں نے اسے ہرگز کھولنے اور پڑھنے کی نیت سے نہ اٹھایا تھا۔ لیکن کاپی کچھ اس انداز سے گری کہ پہلے صفحے پہ بنا ہوا پان کے پتے جیسا دل جگر جگر چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس دل کو اٹھا لیا۔ دل کے وسط میں ایک لمبا سا تیر کھنچا تھا جس سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ کر صفحے پر بکھری پڑی تھی۔ اوپر انگریزی میں رقم تھا —— "الف کے لئے جو نہیں جانتا" —— اس تصویر کے گرد ارغوانی آسمانی پھولوں کی جدول بنی تھی —— ہائی سنتھ کے پھولوں کا حاشیہ۔

تم خوفزدہ کھڑی تھیں اور میں احمق پن سے بار بار پوچھ رہا تھا: "یہ الف سے کس کا نام شروع ہوتا ہے زری ڈارلنگ۔"

تم نے منہ پھیر لیا اور آہستہ سے بولیں۔ "اسے نہ دیکھئے پلیز —— پلیز۔"

میں نے صفحوں کو بڑی بے دردی سے الٹنا شروع کر دیا۔ "بے وقوف۔ انکل سے شرمایا نہیں کرتے۔ انکل تو راز دار ہوتے ہیں الٹا —— ہم کوئی ممی کو بتائیں گے تھوڑا ہی"۔

تمہاری کجلائی آنکھوں میں آنسوؤں کا ترمرا پھیلنے لگا۔ میں نے اس کو اپنی بے وقوفی سے نہ سمجھا اور کاپی کو بے توجہی سے دیکھنے لگا۔ یہ تو ایک کجلی بن تھا جس میں شرم و حیا والے ہاتھی رہتے تھے۔ دنیا سے چھپ کر محبت کرتے تھے اور اس محبت کو سب سے چھپائے رکھتے تھے۔ سارے گیت انگریزی میں تھے۔ ہر گیت کے اوپر ایک ہی جملہ لکھا تھا:

"الف سے مخاطب ہو کر۔"

"پلیز۔ میری سونگ بک واپس کر دیجئے۔ پلیز۔"

اگر مجھے لمحے بھر کیلئے بھی احساس ہوتا کہ میرا نام الف سے شروع ہوتا ہے تو شاید میں بہت

جلد تمہاری کتاب لوٹا کر گھر چل دیتا لیکن میں تو پورے دو سیٹ ٹینس کے کھیل کر آ رہا تھا۔ میرا سارا وجود ٹپہ کھائی گیند کی طرح کھلنڈرا ہو رہا تھا۔

'پلیز ——'

یکدم میری نگاہ ایک صفحے پہ رک گئی۔ اوپر بار بار لکھا تھا۔ شاید کبھی —— شاید کبھی۔ نیچے کونوٹ مار کہ مخصوص لکھائی میں نظم مرقوم تھی۔

"الف —— شاید کبھی تمہیں میرا خیال آئے
تنہائی میں
شاید جس کا آج تمہیں انتظار ہے وہ بے وفا نکلے
شاید!
تم آہیں بھرو اور دست بدعا ہو

میرے لئے —— شاید
کون جانے میں لوٹ کر آ بھی سکوں۔"

نظم نے مجھ سے لبسولی مار کر ساری ہوا نکال دی۔

'یہ الف کون ہے زری —— کون ہے یہ؟"

لیکن تمہارے چہرے پر موٹے موٹے آنسو برس رہے تھے۔ فلمی آنسو نہیں بلکہ وہ آنسو جو بڑی شدت سے حلق میں بھی اترا کرتے ہیں۔

"آئی ایم سوری بے بی ڈارلنگ خدا قسم —— لو اپنی سونگ بک۔ یہ لو۔ میں تمہارا راز نہیں جاننا چاہتا —— پلیز بے بی!'

میں نے تمہیں چپ کرانے کی نیت سے تمہارا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اگر چانکیہ زندہ ہوتا تو وہ دست بستہ عرض کرتا کہ مہاراج! ایسی کنیا کو سینے سے لگانا حکمت عملی کے خلاف ہے۔ یہ سراندیپ کی سروپ نکھا ہے۔ کام دیو کی بانی پہ ننگے پیر آنے والی۔ ایسی کنیا کی ناک اوّل تو ہوتی

ہی نہیں اور جو باقی رہ بھی جائے تو اسے کاٹ لینا ہی بہتر ہے۔ حکمت عملی کی دوسری غلطی کر چکنے کے بعد —— بہت بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے الف کا نام نہ معلوم ہوتا تو اس میں ہم دونوں کی بہتری ہوتی۔

اس واقعے کے بعد کئی روز تک میں تمہارے گھر نہ گیا۔ دل میں ایک انجانا سا خوف تھا۔ گو بظاہر اس خوف کی کوئی وجہ نہ تھی۔ تم نے اپنے منہ سے کچھ نہ کہا تھا لیکن میرے دل کی ٹیلی پرنٹر پہ مسلسل یہی خبر پہنچ رہی تھی کہ حذر کرو..... بچ جاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔ زیرو لائن ہے۔ یہ جگہ بیمہ کمپنی کے مینجر کیلئے بارود خانے سے کم نہیں۔ تمہارا VACCINATION کارڈ مکمل نہیں حذر کرو.... بچ جاؤ۔

جب سے یہ پرچہ دل کو لگا تھا میں نے چھاؤنی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اچانک ایک دن مجھے دفتر میں اقبال کا فون آ گیا۔

'ابھی اسی وقت گھر پہنچو۔ میں چولستان سے تین چیتل اور دو ہرن نوٹے مار کر لایا ہوں۔"

میں نے کام کا عذر پیش کرنا چاہا تو میجر نے دھمکی دی —— "سنو۔ اگر آدھ گھنٹے میں نہ پہنچے تو ہم خود تمہیں لینے آ جائیں گے —— خدا حافظ۔"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی معقول بہانہ تراش سکتا فون ادھر سے بند ہو گیا۔ میں عجب گھولے میں پڑ گیا۔ نہ تو جانے پر طبیعت آمادہ ہوتی تھی نہ ٹھہرنے کی جا تھی۔ ہموار زندگی میں یہ نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب میں بالآخر وہاں پہنچا تو ممی اور ڈیڈی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ حسب عادت اقبال پاٹ پی رہا تھا۔ چہرے پر بڑی بشاش مسکراہٹ تھی۔ ایک ٹانگ پہ دوسری ٹانگ دھرے اوپر والی ٹانگ بڑے تواتر سے ہلائے جا رہا تھا۔ ممی کی کرسی سے چند قدم پرے ہرن اور چیتل پڑے تھے اور ان کے پیٹ کوئلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ممی ایک چھوٹا سا رومال لئے اپنا ناک کریدنے میں مشغول تھیں۔

'ہیلو ینگ مین —— کمال ہے ادھر کا چکر ہی نہیں لگاتے۔ تم اچھے دوست ہو ——"

اقبال نے اپنی کرسی سے اچھل کر کہا۔

تمہاری می نے پہلے نہیں آواز دی اور پھر رومال سے کہنی صاف کرتے ہوئے بولیں۔ "ہم تو تمہارے ہوٹل آرہے تھے ہرن لے کر۔ پھر اقبال کہنے لگا یہ ہرن اس کے کس کام کا۔ وہ تو ہوٹل میں رہتا ہے۔"

تم باہر آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ تمہارا چہرہ ہسپانوی لیموں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ سرخ ربن فلیٹ بوٹ اور یونیفارم کے باوجود تمہاری آنکھیں باب المندب بن چکی ہیں۔ تم میں ایک ایسی بیاہی ہوئی عورت کا سروپ تھا جس کا شوہر اسے پہلی رات ہی چھوڑ گیا ہو۔

"زری نہایت اعلیٰ کباب بناتی ہے آصف ——— انکل کو سلام کرو زری ڈارلنگ"۔

تم مقدس کبوتر جیسا سفید ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف لے گئیں۔

"یہ تو آپکو بہت یاد کرتی ہے آصف۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی اب تو انکل کبھی آتے ہی نہیں میں نے جواب دیا تمہارے ڈیڈی چولستان گئے ہیں۔ وہ بھلا کس سے ملنے آئیں"۔

میں نے تمہاری جانب دیکھا، تمہارے ہونٹوں میں ضبط کئے ہوئے آنسوؤں کی کپکپاہٹ تھی۔ آنکھوں میں بے رخی اور اپنی کم نصیبی کا گلہ تھا۔ ان آنکھوں میں ایک پوری داستان تھی۔ شہر پومپیائی کی تباہی کی داستان۔ میں نے اس کی عبرانی زبان بظاہر سمجھتے ہوئے کہا: "زری تو ہم سے بولتی ہی نہیں۔ ہم کس سے ملنے آئیں بھلا"۔

اپنے غلط جواب پر پشیمان ہو کر میں نے فوراً ہی باتوں کا رخ پلٹ دیا ——— "اچھا یہ بتاؤ کہاں کہاں شکار کرنے گئے"۔

"پہلے تو گئے بہاولپور ——— وہاں نواب صاحب کے مقربین میں سے ایک حضرت ساتھ تھے۔ بڑا آسائشی شکار کھیلا بالکل پرنس آف ویلز بن کر۔ شکار کم اور ضیافتیں زیادہ ہوئیں۔ پھر چار دن چولستان میں رہے ——— ونڈرفل ——— سمندر ——— پہاڑ ——— اور ریگستان یہ تینوں اللہ نے اس لئے بنائے ہیں کہ جب انسان زیادہ اترانے لگے تو انہیں دیکھ کر اپنی اصلیت کو پہچانے"۔

"کافی پئیں گے آپ ———" می نے سوال کیا۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر زری کو آرڈر لگایا۔ "جاؤ زری۔ انکل کیلئے کافی لاؤ۔ چیز اور ویفرز بھی لانا"۔

اقبال اپنی ترنگ میں بولتا گیا۔ "یار چولستان خوبصورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت رخاص کر چاندنی میں۔ لیکن وہ سندربن والی بات کہاں"۔

تمہاری می نے گہرے فیروزی رنگ کا پلو کندھے پر گھسیٹ کر کہا: "توبہ توبہ۔ میمن سنگھ میں یہ اس قدر خوش تھے آصف کہ کیا بتاؤں۔ صبح صبح آدھی درجن کیلے کھاتے۔ رات کو دو چار اناس۔ اور شام کے وقت کچے ڈاب۔ ان کا بس چلتا تو کبھی لوٹ کر مغربی پاکستان نہ آتے"۔

"میری زندگی کے چار بہترین سال میمن سنگھ میں گزرے ہیں۔ وہ شکار ہے وہاں یار۔ وہ شکار ہے کہ انسان شکار AFFORD ہی نہیں کر سکتا۔ کارتوس ختم ہو جاتے ہیں لیکن شکار ختم نہیں ہوتا۔ میلوں پھیلا سبزہ، جھیلیں، بگرے ——— کوئی بیوٹی ہے۔ کوئی وائلڈ لائف ہے مائی گاڈ ——— ونڈرفل ——— ونڈرفل ——— لیکن یہ تمہاری بھابی بہت بور ہوئیں وہاں"۔

تمہاری سانولی می نے فوراً کہا ——— "توبہ۔ میرا تو رنگ سنولا گیا تھا وہاں۔ سال دو اور ہوتی تو بالکل کالی ہو جاتی"۔

"میں تو ریٹائر ہو کر وہیں چلا جاؤں گا۔ یا کھلنا میں کاٹیج بنالوں گا یا چندر گونا میں جھونپڑی ڈال لوں گا ——— میمن سنگھ اب SOHPISTICATED ہو چلا ہے"۔

"چاٹگام بہتر ہے" ——— می بولیں ——— "ہم لوگ بھی چھٹیوں میں آجایا کریں گے"۔

"کہیں بھی ہو۔ رہوں گا مشرقی پاکستان میں۔ یار آصف۔ اس قدر سادہ زندگی ہے ان لوگوں کی۔ ایسی سادہ زندگی کہ انسان عبرت پکڑتا ہے۔ ہر گھر کے آگے ایک پول بھی ہوتا ہے چھوٹا سا۔ سارا خاندان اس میں تین چار بار نہاتا ہے۔ باتھ روم کا خرچ صفر۔ بارہ روپے کی فرسٹ کلاس

دھوتی آتی ہے ——— ایک بین لی ایک ڈھولکی۔ پیروں میں کھڑاویں۔ سونے کو سیتل پاٹی۔ کھانے کو مچھلی بھات۔ نہ انہیں کوئی کراکری چاہیئے نہ قالین درکار ہیں نہ الیکٹرک گڈز۔ سبحان اللہ کیا زندگی ہے۔ شیر کی طرح آزاد پھرتے ہیں بنوں میں۔"

"توبہ بس بھی کیجیئے۔ بہشت کا نمونہ ہی بنا دیا مشرقی پاکستان کو"۔

"بس کیسے کروں۔ جس نے ایک بار ڈابھ پی لی اس نے سوم رس پی لیا۔ یار آصف۔ کیا لذت ہے کچے ناریل میں۔ سبحان اللہ۔ ونڈرفل۔ کبھی گئے ہو مشرقی پاکستان؟"

"جاتا ہی رہتا ہوں"۔

"پھر کیسی جگہ ہے"۔

"تفریح کے لئے نہایت اعلیٰ ہے"۔

"بالکل ٹھیک۔۔ بالکل ٹھیک ———" ممی چہکی۔

"تم لوگ جنت میں بھی صرف تفریح کیلئے جاؤ گے"۔ اقبال نے کہا۔

اتنے میں تم کافی لے کر آگئیں ماخروٹ کی لکڑی کے بڑے ٹرے میں۔ تم میرے پاس بیٹھ کر کافی بنانے لگیں۔ جب بھی تم میری طرف نگاہ کرتیں تو مجھ لگتا کے سب بل نکل جاتے۔ مجھے سلسلۂ کلام جوڑنا مشکل ہو جاتا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر سمجھا رہی تھی کہ مجھے جلد گھر جانا چاہیئے لیکن اقبال ہر قسم کے کارتوس، بندوقوں کی قسمیں، مچان باندھنے کے طریقے جانوروں کی شکار سے بچنے کی گاتیں، آدھی رات، پچھلے پہر اور دوپہر کے شکار کے فوائد اور نقصانات پر سیر حاصل بحث کرتا رہا۔ یک طرفہ بحث جس میں میری شمولیت برائے نام اور تمہاری ممی براہِ صحبت شامل رہیں۔ تم کونے میں کتابیں لئے بیٹھی رہیں۔ گو کئی بار تمہاری ممی نے تمہیں سو جانے کو کہا لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی۔

عجب بات ہے مجھے تمہارے دلی جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا کہ یہ میری خود ستائی ہے۔ کبھی اس قدر پیاری سی کو عشق ہو سکتا ہے۔ یہ سب کنچوں کی جھوٹی کھیل ہے کہ بازی ہار جانے پر سب کھلاڑی اپنے اپنے کنچے واپس لے کر ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کو

لوٹ جائیں گے ——— مجھ انگلی نما انسان سے ایسی محبت ——— اور پھر وہ بھی اتنی کم عمر معصوم لڑکی کرے۔ توبہ توبہ!

اس روز کے بعد میں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو گا میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا۔ لیکن ایک انشورنس کے سلسلے میں مجھے ایک ایسے گھر جانا پڑا جہاں میرے عزم کو توڑنے والی تمہاری ممی موجود تھیں۔ انہوں نے میرے عذر کو پس پشت ڈال دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ آخری بات جو انہوں نے کی اس کے بعد انکار کی گنجائش نہ تھی وہ بولیں: "میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ صرف مجھے گھر پہنچا آؤ۔ اترنا نہ اترنا تمہاری مرضی ———"

اور جس وقت میں نے کار پورچ میں کھڑی کی وہ فرسے اتریں اور اقبال کو فون کرنے چلی گئیں۔ میرا ارادہ اندر جانے کا نہیں تھا۔ میں صرف تمہاری ممی کو تکلفاً خدا حافظ کہنے کیلئے رک گیا۔ لان کے ایک گوشے میں رنگین نواڑ سے بنی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر تمہاری کتابیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا جیسے تم ابھی پڑھتی اٹھ کر گئی ہو۔ بس وقت کٹی کے طور پر ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ تمہاری انگریزی کی لکھائی اچھی تھی لیکن اردو کے حروف ناپختہ اور بچگانہ تھے۔ رف کاپی میں ایک مضمون 'بہار پر'، ایک 'سستی کی عرضی' اور چھوٹے چھوٹے پیروں کو اختصار سے لکھنے کی مشق کی گئی تھی۔ جا بجا میرا نام لکھ کر اس طرح پنسل سے کاٹا گیا تھا کہ بمشکل پڑھا جاتا۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا۔ آسمان پر جیٹ طیارے زناٹے سے گزرتے ہوں تو گھر کی کمزور کھڑکیاں دروازے اسی طرح لرزا کرتے ہیں۔ اسی کاپی کے آخری صفحے کو پنسل سے کاٹ کاٹ کر سیاہ کیا ہوا تھا۔ میرے دل نے گو ٹالی کی لیکن تجسس نے حرف کو شناخت کئے بغیر نہ چھوڑا۔ صفحے کے ایک کونے میں حروف ابھی اچھی طرح مٹائے نہ گئے تھے۔ اوپر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ نیچے تمہارے نام کے انگریزی میں ہجے کئے گئے تھے۔ جو حروف دونوں ناموں میں موجود تھے انہیں بعد ازاں کاٹ کر محبت اور نفرت کا پتہ لگایا گیا تھا۔ اس عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت اور مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم نے یہ نتیجہ بدلنے کے لئے سارا صفحہ سیاہ کر دیا تھا ——— میں تمہیں کیا سمجھاتا زری کہ جب نصیب کا

ہارا ڈوب جاتا ہے تو کوئی عمل کام نہیں آتا ـــــ میں تمہیں کیا بتاتا کہ محبت تو امر بیل ہے ـــ جس درخت پر یہ چڑھ جاتی ہے وہ پیڑ سوکھ جاتا ہے اور درخت ایک دن آپ ہی آپ گر جاتا ہے ـــ میں تمہیں کیا سمجھاتا کہ محبت کی امر بیل میں کبھی کسم کے پھول نہیں لگتے۔ اس بیل میں تو ہمیشہ ہائی سنتھ کے شگوفے کھلتے ہیں ـــ پشیمانی کے ارغوانی پھول ـــ تاسف کے آسمانی پھول!

میں تم سے ملے بغیر تمہاری ممی کو فون کرتا چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا۔ کئی گھنٹے ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کروٹیں بدلنے کے باوجود مجھے ٹھنڈے پسینے آتے رہے۔ کٹے ہوئے حروف ـــ ایل او وی ای سے بھری ہوئی کاپی۔ ذرا سی برآمدے میں آہٹ ہوتی تو میں چونکیل جانور کی طرح اٹھ بیٹھتا اور آہٹ پر کان دھر کر سوچتا کہیں یہ زری نہ ہو ـــ کہیں اس کے دماغ کی ڈھبریاں اس قدر ڈھیلی نہ پڑ گئی ہوں کہ دہ یہاں تک آ گئی ہو۔ پھر جی کو تسلی دیتا کہ اول تو وہ میرے ہوٹل کا رستہ نہیں جانتی ہو گی اور پھر اتنی چھوٹی عمر میں اتنی جرأت کہاں سے آ جائے گی۔ مجھے بھی ہالی ڈڑکا کوئی ایکٹر سمجھ کر محبت کرنے بیٹھ گئی ہے۔ چند روز ملیریا بخار جیسی تھرتھری چھوٹے گی۔ پھر آپ ہی آپ پنڈا نارمل پڑ جائے گا۔

اب میں نے پھر پکا عہد کر لیا تھا کہ تمہارے گھر کسی قیمت پر بھی نہ جاؤں گا۔ اور تو اور میں یہاں تک سوچنے لگا تھا کہ اپنی تبدیلی کہہ سن کے کراچی کروا لوں تاکہ اس دھبدھاسے جان چھوٹ جائے ـــ!

اس شام میں نہا کر غسل خانے سے نکلا تو مجھے برآمدے میں چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا کسی نے میرے کمرے کا کنڈا کھولنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے کنوتیاں اٹھا کر پوچھا:

"کون ہے؟"

ابھی میں قمیض پہن ہی رہا تھا کہ تم دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ میں کلر زدہ زمین کی طرح سفید پڑ گیا۔ سینے پر وہی دو چوٹیاں اور چوٹیوں کے سروں پر سرخ گڑھل کے پھول، لٹھے کی سفید

سفید شلوار قمیض اور کندھوں پر سفید دوپٹہ ـــ ہاں ایک بات خلافِ معمول تھی۔ تمہارے دونوں ہاتھوں میں آج کالی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

"زری ـــ ہیلو بے بی! تم یہاں کیسے؟"

لمحہ بھر تو مجھے وہم ہوا کہ شاید تمہارے والدین نیچے کھڑے ہوں اور انہوں نے محض مجھے چڑانے کی خاطر پہلے تمہیں بھیج دیا ہو۔ میں اس وہم پر بھروسہ کر کے جلدی سے برآمدے تک گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ ایک بھڑی زرد اور سیاہ ٹیکسی پھاٹک سے نکل رہی تھی۔ لان ـــ پورچ اور پکی سڑک تک تمہارے والدین جیسا کوئی بھی شخص موجود نہ تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے واپس آیا اور پہلی بار میں نے تمہارے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت کی۔ تمہاری آنکھیں زیادہ رو لینے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ اور ناک کی پھننگ یاقوت رنگ کی تھی اور تم چھوٹے سے رومال کی لگدی بنا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے زری! ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟"

تم چپ چاپ کھڑی رومال کا گولا بنانے میں معروف رہیں۔

"بات کیا ہے۔ کچھ بولو ناں ـــ" میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

"میں اکیلی آئی ہوں جی ـــ"

زن سے سارا ہوٹل میرے پیروں تلے سے نکل گیا۔

"کیوں ـــ کیوں بیٹے؟"

میں لفظ بیٹے کا قفل ڈال کر تمہارے جذباتی وجود کو مقید کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ آنسوؤں کی چمک پھر سے آنکھوں میں پیدا ہو گئی اور تم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ـــ "آپ مجھ سے ناراض ہیں جی!"

"نہیں نہیں نہیں ـــ ہرگز نہیں ـــ توبہ۔ ہرگز نہیں ـــ یہ خیال تمہیں کیسے آیا: کبھی انکل ناراض ہوتے ہیں؟"

بحر رمل میں ایک سے وزن کے آنسو تمہارے گالوں پر بہنے لگے۔

"پھر جی آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟"

"آؤں گا ـــــ بھئی ضرور آؤں گا۔ انشاء اللہ"

تم نے رومال کا گیند کھولا اور اسے ہونٹوں پر رکھ کر بولیں۔ "میں تو سمجھی تھی آپ کبھی نہیں آئیں گے۔"

"چلو بے بی ـــــ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ کم آن ڈارلنگ۔"

تم دو قدم پیچھے ہٹ کر بولیں: "آپ مجھے ڈارلنگ نہ کہا کریں۔ ڈیڈی کی طرح۔"

میں نے کار کی چابی میز پر سے اٹھائی اور تحکمانہ لہجے میں بولا: "چلو گھر چلیں۔"

"میں اکیلی چلی جاؤں گی ـــــ میری سہیلی گیٹ پر کھڑی ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤنگی۔"

یکدم مجھے احساس ہوا کہ پہلی بار جھجک مٹ جانے پر شاید تم دوبارہ سہ بارہ اور پھر تواتر سے یہاں آنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرو۔ یوں تن تنہا ہوٹل کے ایک بیچلر روم میں آنا میرے ان سفارتی مراسم کو تباہ کر سکتا تھا جو میرے تمہارے خاندان سے تھے۔ میں تمہیں بدنامی سے اپنے آپ سے اور سب سے زیادہ تمہارے اپنے نوشگفتہ ضمیر کی زد و کوب سے بچانا چاہتا تھا۔

"بے بی اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تو پھر میں تمہارے گھر آؤں گا۔"

مجھے علم تھا کہ اس عمر میں وعدے کا بڑا پاس ہوا کرتا ہے۔

"جی؟ ـــــ ضرور ـــــ!"

"تم یہاں کبھی نہیں آؤ گی ـــــ کبھی نہیں۔ سمجھیں۔"

تم نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "کیوں جی!"

"اس لئے کہ ـــــ کہ میں تمہارا یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ تمہارے ڈیڈی کو اگر علم ہو گیا تو وہ بھی ناخوش ہوں گے۔"

تم نے لب کاٹا اور نظریں جھکا لیں۔

"دیکھو زری۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔"

"جی مانوں گی۔"

"وعدہ ہے نا پھر!"

تم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس غیر مشروط وعدے پر تمہارے لبوں نے ایک ہلکی سی سسکی سے مہر لگا دی۔

اس واقعے کے بعد میں مہینے میں ایک آدھ بار تمہارے گھر جانے لگا لیکن کچھ اس التزام سے کہ تمہیں مجھ سے بات کرنے کا ایک لمحہ نہ ملتا۔ میں تمہارے پہنچنے سے پہلے اقبال کو فون کرتا اور اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوتا تو پھر میں ادھر کا قصد بھی نہ کرتا۔ جتنی دیر تک اقبال گھر پر ٹھہرتا میں بھی قیام کرتا۔ اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو میں بھی فوراً اٹھ جاتا۔ اس احتیاط کی کچھ وجہ تو تمہارا تحفظ تھا اور کچھ اس داخل خارج مقدمے میں مہ رخ کا نزول بھی ہو چکا تھا اس لئے میں تمہارے قرب کا متمنی نہ ہو سکا۔

میرے لئے مہ رخ بڑی منحوس صورت اور بسر قدم ثابت ہوئی۔ اس سے ملاقات کے وقت مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ وہ اس طرح میری عنانِ حکومت سنبھال کر میری خوشیوں کے راہوار پر سوار ہو جائے گی۔ مہ رخ کا اصلی نام امتل الحفیظ اور قلمی نام مہ رخ تھا۔ وہ ایک مشہور اخبار میں عورتوں کا کالم لکھتی تھی۔ اس کالم کے اوپر روز مہ رخ کی تصویر چھپتی تھی اور اسی تصویر کے باعث میں نے اسے پہچان بھی لیا تھا۔ گو تصویر میں جو خیر گی تھی وہ اس کی اصلی صورت میں موجود نہ تھی۔ پھر بھی مجھ پر اس صورت کا اثر ہونا تھا ہو کر رہا۔

مہ رخ سے میری ملاقات شالیمار میں ہوئی تھی۔ اکابرینِ شہر چین کے صدر لیو شاؤچی کو ایک نظر قریب سے دیکھنے کیلئے اس جی داری سے ٹوٹ کر آئے تھے کہ کار پارک کرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ عورتیں پھولوں کی پتیاں پلاسٹک کے لفافوں میں لئے روش کے کنارے بھری کھڑی تھیں۔ اس نسوانی دیوار چینی میں جگہ بنا کر آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں بھی انچ انچ آگے کھسکتا بڑھ رہا تھا کہ میری نظر مہ رخ پر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی میں نے اس کالم نگار خاتون کو پہچان لیا۔ اس کے ہاتھ میں

ایک لمبی ڈائری اور پنسل تھی۔ وہ اچک اچک کر بیقراری سے ادھر ادھر جھانک رہی تھی۔ اسی بیقراری کے عالم میں وہ گھستی گھساتی لوگوں میں جگہ بناتی مجھ تک آ پہنچی۔ اب اس سے نانک چندی اینٹوں کی روش تین فٹ کے فاصلے پر تھی اور وہ آسانی سے صدر لیوشاؤچی کے درشن کر سکتی تھی۔ میں نے قرونِ وسطیٰ کے جانبازوں کی طرح اس کیلئے جگہ چھوڑتے ہوئے پوچھا:

"محترمہ! آپ مہ رخ ہیں ناں؟"

"جی ــــ"

"آپ خواتین کا صفحہ لکھتی ہیں ــــــ میرا قیاس درست ہے کیا؟"

دل میں وہ اپنی شہرت پر بہت خوش ہوئی لیکن بظاہر چڑ کر بولی: ــــــ "آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"اس لئے کہ اگر واقعی آپ مہ رخ ہی ہیں تو میں آپکی مدد کروں گا۔ آپ کا کالم بہت دلچسپ ہوتا ہے اور اسے مرد زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔"

مہ رخ کا نام سن کر چند لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا۔ آپس میں نوٹس ملانے اور کھسر پھسر کرنے لگیں۔ میری تعریف کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مہ رخ سے تناؤ کی کیفیت جاتی رہی۔ وہ ہنس کر بولی ــ "واقعی ــــــ"

یہ ہنسی میرے حق میں بڑی ناانصاف ثابت ہوئی۔ میں نے ایک ہی دار میں سارے ہتھیار ڈال دیئے اور دل کے قلعے کی تمام چابیاں اُسے نذر کر دیں۔

"ادھر آجایئے میرے سامنے۔ یہاں سے آپ بہتر دیکھ سکیں گی۔"

وہ مجھ سے چھ انچ آگے آکر کھڑی ہو گئی۔ اب اس کے بالوں کی گندھک آمیز خوشبو اور بغیر آستینوں کی قمیض سے اٹھنے والے جسم کی گرمی مجھ تک بلا روک ٹوک پہنچنے لگی۔ اس نے کوئی نامعلوم فرانسیسی سینٹ استعمال کر رکھا تھا لیکن اس سینٹ پر لائف بوائے سے دھلے ہوئے جسم کی خوشبو غالب تھی۔

"دراصل آج میں دفتر والوں کے ساتھ نہیں آئی ورنہ مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ سامنے جو آدمی بیٹھا ہے ناں ــــ وہ رنگین چھتریوں تلے ــ پریس گیلری میں۔ وہ ہمارا سب ایڈیٹر ہے لیکن میں اسے بلانا نہیں چاہتی ــــ" یہ بات اس نے یک رخی ہو کر کی اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولی ــــ "اللہ جانے اگر ظفر نہ ملا تو پھر میں واپس گھر کیسے پہنچوں گی۔"

اس کے آخری جملے پر ذہن میں پلان بناتے ہوئے میں نے کہا ــــ "میں سیف گارڈ انشورنس کا زونل مینجر ہوں۔ آصف تنویر ــــ"

"میرا اصلی نام امتل الحفیظ ہے ــــ سلام علیکم ــــ"

"اگر آپکو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپکو گھر پہنچا آؤں گا۔"

میری شوخ چشمی کا جواب اس نے بڑی بے رخی سے دیا۔ "جی نہیں۔ شکریہ۔ یہاں ضرور کوئی نہ کوئی واقف مل جائے گا۔"

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ مہ رخ کو اس بھرے مجمع میں ایک بھی واقف شخص نہ ملا جو اسے گھر لے جاتا۔ اور بالآخر جب وہ شام گئے میری کار میں بیٹھی تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میرے ساتھ دفتر تک جائے گی اور وہاں سے تھوڑی دیر بعد اکیلی بس پہ گھر چلی جائے گی۔ میں نے کسی قسم کی حجت بازی نہ کی کیونکہ میرے لئے یہ بھی بارانِ رحمت سے کم نہ تھا۔

مہ رخ بڑی چمکدار گفتگو کرتی تھی۔ ٹکسال سے نکلے ہوئے چمکدار سکوں کی طرح۔ اس گفتگو میں دلآویز مسکراہٹوں اور کھنک دار قہقہوں کی چیپیاں لگا کر وہ نفسِ مضمون کو بڑا معنی اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔ حالانکہ نہ تو اس کی تحریر میں ذہانت تھی اور نہ ہی اس کی کھوپڑی میں فطرت نے معمول سے زیادہ مغز بھرا تھا۔ ایک عام سی سادہ لڑکی جو حسنِ اتفاق سے کالم لکھنے پر مامور ہو گئی تھی۔ اس کالم لکھنے نے اس کی شخصیت میں ایک قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا جیسے کوئی چھوٹے قد کی عورت ایڑی والی جوتی پہن کر خود اعتمادی محسوس کرتی ہے اسی طرح خواتین کا کالم لکھ کر مہ رخ مردوں سے بے تکلف بات کرنے میں، گفتگو کا دھارا موڑنے میں، برجستہ جواب کو احمق پن کی دلیل بنانے اور خواتین کی سائیکولوجی

پر سیر حاصل بحث کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ عورتوں کے مسائل کی وکالت کرتے ہوئے اس کی نظروں میں مردوں کی ذات بالکل بے وقعت ہو کر رہ جاتی۔ جب وہ باتیں کرتی تو اس کی باتوں میں قندھاری انار کا کھٹا میٹھا مزہ اور رنگ ہوتا۔ عجیب سی بات ہے کہ سارے دفتر میں اس گفتگو کا کوئی شیدائی نہ تھا اور سب اسے ایک PUSHING لڑکی سمجھتے۔

مہ رخ سے ملاقات ہونے کے بعد میں بڑے تواتر سے تمہارے گھر جانے لگا۔ تم کو دیکھ کر اب مجھ پر مراقی کیفیت طاری نہ ہوتی تھی۔ میں تم سے تمہارے جذبے سے خوفزدہ نہ رہا۔ میں نے اپنے جملہ حقوق مہ رخ کے نام محفوظ کر کے اپنے آپکو نظرِ بد سے بچانے کا انتظام کر لیا تھا۔ تمہارے لیے شاید یہی بہت تھا کہ میں نے تمہارے گھر کو یاد تو رکھا۔ کیونکہ نہ تو تم نے مجھے کبھی بلانے کی کوشش کی اور نہ کبھی مجھے اکیلا پا کر میرے پاس ہی آئیں۔ بس مجھے دیکھ کر تم میں اتنی تبدیلی آتی کہ تمہارا چہرہ دہکنے لگتا۔ جیسے سرِ شام برف آلود چوٹیوں پر شفق کی روشنی پڑ رہی ہو۔ کانسی کے گلدان میں سرخ گلابوں کا عکس پڑ رہا ہو۔ جیسے کوئی بچہ ہتھیلی میں ٹارچ جلا کر اپنی انگلیوں کی نارنجی روشنی دیکھنے لگے۔ تمہاری ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر اتنی سرخی کا عود کر آنا بذاتِ خود ایک بہت بڑی علامت تھی لیکن میرے لئے یہ علامت اپنا مطلب کھو چکی تھی۔

مہ رخ سے شالیمار میں ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا اتنے برس اتنے قرن میں ایک تیر کی مانند گھومتا رہا ہوں۔ ایک ایسا تیر جس کا ہدف کھو گیا ہو۔ میری ساری زندگی آبشاری تھی۔ شور و غوغا سے پُر ـــــ بہت ساری عورتیں میری زندگی میں سمندر کے جھاگ کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ مجھ سے ان کا رشتہ سطحی تھا۔ ان عورتوں کی محبت میں جانبین کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ نہ ذہنی نہ جسمانی۔ وہ مجھے اور میں انہیں کھیل کود کے شریک سمجھ کر علیحدہ ہوتے تھے۔ کسی سے بھی بچھڑ کر مجھے پامالی، مکمل خستہ حالی کا دورہ نہ پڑا تھا۔ نہ میں نے کبھی شیو بڑھائی نہ خواب آور گولیاں کھائیں اور نہ کبھی دل بہلانے کے لئے شہر چھوڑا۔ لیکن جونہی مہ رخ کار سے اتری مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب میں زندہ نہ بچوں گا۔ اسکی دل پر کندہ ہو گئی تھی۔ اس کی آواز اس کے قہقہے، اس کی ننھی دل کو تھامے بیٹھی تھی ورنہ میں تو

شاید اسی روز کچھ کر بیٹھتا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دمے کے مریض کی طرح میرا سانس اکھڑ رہا ہے، میری ٹانگیں کمزور پڑ چکی ہیں اور میں ـــــ وہ رہا جو اب تک تھا۔ مجھ میں حضرت عیسیٰ جیسی انکساری ـــــ کچھوے جیسی سخت جانی ـــــ فاختہ جیسی ناعاقبت اندیشی اور نہ جانے کیا کیا خاصیتیں پیدا ہوئی جا رہی ہیں۔ میں ان چند گھنٹوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا یا بہت زیادہ گھٹ گیا تھا۔ کوئی ایسی قوت تھی جو میرے ماضی کو ربڑ سے مٹا رہی تھی جو میرے مستقبل کو تشکیل دیئے بغیر جلی حروف میں میرے حال کا نفسِ مضمون تیار کر رہی تھی۔ میں ساری رات جاگتا رہا۔ میں نے کئی درجن سگرٹیں پھونک ڈالیں۔ کئی بار مسہری لگائی۔ اندر لیٹا۔ پھر ہڑبڑا کر باہر نکلا۔ مسہری اوپر چڑھائی اور پھرنے لگا۔ کوئی صاحب عصا ایسا تھا جو اونگھ سے جگاتا اور مہ رخ کے خیالوں میں غلطاں کر دیتا۔

میں بے خواب آنکھیں، بوجھل مراد رات اڑا اڑا ما چہرہ لئے دوسرے دن مہ رخ کے دفتر پہنچا۔ وہ ہاتھ میں پنسل اور ڈائری لئے ایک عینک پوش آدمی سے چتر چتر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے میرا رتی بھر نوٹس نہ لیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کام تھا ـــــ"

مہ رخ نے مجھے پہچاننے سے قطعی طور پر انکار کرتے ہوئے کہا: "فرمائیے"۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں"۔

"جی نہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ آپ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کے زونل مینجر ہیں۔ تنویر آصف صاحب ـــــ فرمائیے!"

عینک والے شخص کی باچھیں خواہ مخواہ کھل گئیں اور وہ بڑے اخلاق سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ـــــ "ظفر ـــــ میں یہاں فوٹو گرافر ہوں"۔

تو یہ ظفر تھا۔ منحنی سا فوٹو گرافر۔ چھوٹی سی فرانسیسی داڑھی اور انتہائی چست ٹیڈی پتلون میں ملبوس ظفر! ـــــ اس کے چہرے پر کسی قسم کی ظفر مندی کے آثار نہ تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ عادتاً یا مصلحتاً بھوکا رہنے کی عادی ہو۔

میں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے ازراہِ تکلف کہا۔

"بہت جلد آپ نے یہ بات کہہ دی ہے —" فوٹوگرافر نے انگریزی میں کہا۔ یہ بات مہ رخ کے قہقہہ کا باعث ہوئی۔ میرے منہ پر تالا پڑ گیا۔

مہ رخ دیر تک ہنستی رہی اور وہ نیم مسخرہ، نیم فلاسفر، دبلا پتلا ہاتھ ہلاتا چینی چوپ سٹکوں کی طرح ٹانگیں ہلاتا اندر چلا گیا۔

"فرمایئے —" کچھ دیر کے بعد مہ رُخ نے میری خبر لی۔

میں ذاتی طور پر کسی کو انشورنس کے لئے نہ کہتا تھا۔ یہ کام میرے فرائض میں شامل نہیں۔ لیکن اس وقت مہ رخ سے اس سے بہتر تقریبِ ملاقات کا بہانہ بھی تو نہ تھا۔ میں نے کاروباری لہجہ میں کہا:

"میں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے انشورنس کے لئے کہوں۔ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کم سے کم پریمیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ ادا کرتی ہے۔"

مہ رخ کچھ طیش میں آ گئی۔ پہلا ہی وار ادھا پڑا — "اسی لئے تو میں انشورنس والوں سے گھبراتی ہوں۔ ذرا سی ملاقات بھی ہو تو فوراً انشور ہونے کو کہیں گے۔"

عجیب سی بات اسی لمحے ہوئی۔ جونہی اسے غصہ آیا میری ہمت عود کر آئی۔ ممکن ہے یہ ان سالوں کی ریاضت اور صبر کا نتیجہ تھا جب میں لوگوں کو انشور کرنے نکلا کرتا تھا — وہ بھی ٹیلیفون ڈائرکٹری میں سے ایڈریس دیکھ کر۔ اب مجھے حالات کے خاطر خواہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔

"ہماری کمپنی عورتوں کی انشورنس نہیں کرتی۔ لیکن میں آپکو بہت اچھی ٹرمز پر انشورنس دلوا دوں گا۔ پریمیم بھی کم دینا ہوگا اور —"

"دیکھئے میں انشورنس کروا چکی ہوں — تھینک یو۔"

اب مجھے جیت بازی میں مزہ آنے لگا۔

"دیکھئے فی زمانہ انسان جتنی بھی انشورنس کروائے کم ہے۔ زندگی کی RISKS بہت

بڑھ چکی ہیں مس مہ رخ!"

"آصف صاحب۔ میں ایک ڈیلی اخبار میں کام کرتی ہوں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے پلیز...."

"محترمہ مہ رخ صاحبہ! اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ایسے قیمتی وقت اور ایسی گرانمایہ شخصیت کے تحفظ کی اشد ضرورت ہے۔"

جوں جوں اسے غصہ چڑھ رہا تھا میری کمزوری میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ میں بھولتا جا رہا تھا کہ میں اچانک اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام امتل الحفیظ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت مجھے اسلامیہ کالج جانا ہے ایک مشاعرے پر — معاف کیجئے۔"

یہ جملہ بول کر اس نے بڑے طمطراق سے اپنا بڑا سا بیگ اٹھایا۔ اس میں ڈائری اور پنسل ڈالی اور بگیہ جھلاتی دفتر کی عمارت سے باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سدھا۔ میں کتے کی طرح میں سڑک تک پیلا آیا۔ نہ اس وقت مجھے یہ خیال تھا کہ شاید وہ دل ہی دل میں مجھے بے حیا سمجھ رہی ہے نہ ہی اس بات کا خدشہ تھا کہ شاید میرا غلط رویہ ہمیشہ کے لئے اسے مجھ سے بدظن بھی کر سکتا ہے۔ بس ایک لگن تھی ایک کلک تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت تک دیکھنے کی۔ اس کے قریب رہنے کی۔

دفتر کی سیڑھیاں اترتے وقت اس نے چپراسی سے پوچھا — "ظفر صاحب کہاں چلے گئے؟ —"

چپراسی نے پہلے اندر نظر دوڑائی۔ پھر سائیکلوں والے چھپر کے قریب گیا اور دور سے آتے ہوئے بولا: "جناب۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی کیمپس گئے ہیں۔"

مہ رخ جھنجلاتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ حسنِ اتفاق سے سڑک سنسان پڑی تھی۔ دو رکشے گزرے دونوں میں سواریاں لدی تھیں۔ مہ رخ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

"میری کار حاضر ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ساری راہ ایک بار بھی آپ کو انشورنس کیلئے نہ کہوں گا — وعدہ —!"

اس نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا اور پھر کار میں بیٹھ گئی۔

مہ رخ فلرٹ لڑکی نہ تھی۔ فقط ذرا بے احتیاط سی تھی۔ باتیں کرنے ترپ کے پتے چھوڑنے، شاہ گھات دکھانے اور بازی لوٹ لے جانے کا اسے چسکا تھا۔ اس کا جسم اور دل بالکل پاک تھے۔ صرف نیت نیک نہ تھی۔ عام عورتوں کی طرح جو بج بن کر بازار جاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ نظروں ہی نظروں میں سارے جہان کے مرد ان کے عاشق ہو جائیں لیکن اوچھا آوازہ کوئی نہ کسے۔ ان کے دوپٹے کو کسی کی انگلی بھی نہ چھو پائے۔ مہ رخ بھی یہی چاہتی تھی کہ چاہنے والوں کے پشتارے لگ جائیں جو ایکبار اس سے بات کرے ہمیشہ کے لئے اس کا یقین نکال لے۔ وہ اپنی جودت طبع کی خود اس قدر قائل تھی کہ ہر مرد کو اس میدان میں ہرا کر اسے ذہنی سکون ملتا تھا —— گو بعد میں مجھے علم ہو گیا کہ یہ ذہانت بھی بالکل سطحی ہے۔ اس میں نہ تو اصلی ذہانت کے ابرق جیسے پرت در پرت تھے نہ گہرے پانیوں کا سکون۔ اور نہ ہی خیال کی گہرائی۔ زیادہ سے زیادہ وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ہیروئنوں کی طرح ضلع جگت کی ماہر تھی۔ بہت جلد مجھ پر عیاں ہو گیا کہ آم تو سارے ظفر کیلئے ہیں۔ میری طرف تو وہ گٹھلیاں پھینکتی ہے لیکن میں مہ رخ کی محبت میں اس قدر محصور ہو چکا تھا کہ اس کم چھٹے مسخرے سے جلنا تو درکنار، الٹا اس کی خوشنودی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ مجھے یہ گٹھلیاں اس قدر عزیز تھیں کہ میں ان ہی کی تلاش میں مہ رخ کے دفتر میں جاتا اور پہروں گداؤں کی طرح بیٹھا رہتا۔

جب کبھی میں تمہارے گھر جاتا تو ان باتوں کی چمک میرے ساتھ آتی۔ پھر نہ تو مجھے تمہاری روتی ہوئی آنکھیں نظر آتیں نہ تمہارا گم سم چہرہ دکھائی دیتا نہ تمہاری آوازیں دیتی خاموشی سنائی پڑتی۔ میں ہمہ وقت خلوت اور جلوت میں مہ رخ سے ہی باتیں کئے جاتا۔ اسی طرح ایک روز میں تمہارے ہاں بے دھیان بیٹھا تھا۔ اقبال نے پہلی مرتبہ میری توجہ تمہاری طرف لوٹائی۔

"صبح تم نے انڈا کھایا تھا بے بی ڈارلنگ۔" اقبال نے پوچھا۔

تم نے نفی میں سر ہلایا۔

"دودھ؟"

"جی پیا تھا ——" تم آہستہ سے منمنائیں۔

"کہاں پیا تھا زری —— ہاں چکھا ضرور تھا اقبال۔ اللہ جانے اسے کیا ہوتا جاتا ہے نہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے۔ دو تولیں کاڈ لیور آئل کی پلائیں۔ وٹامن بی اور سی کی گولیاں کھلاتی ہوں۔ ذرا رنگ تو دیکھئے اس کا۔ چھپکلی سی نکلتی آتی ہے —— ہے نا آصف!"

میں نے ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر نظر ڈالی اور پرے دیکھنے لگا۔ بڑے دنوں کے بعد میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے اور نیکی کرنے پر اکسانے آ بیٹھا تھا۔

اقبال اپنی بندوق کو گن سے صاف کر رہا تھا۔ اس نے تمہاری ممی کی بات پہ کان دھرے بغیر کہا —— "آؤ آصف ذرا باہر چلیں کھیتوں کی طرف۔ شاید کوئی سینڈ گروز مل جائے۔"

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تمہارا شکاری باپ مجھ سے تمہارے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جب ہم آبادی سے بہت دور نکل گئے اور فضا سے شہر کی آوازیں غائب ہو گئیں تو وہ اچانک رک گیا اور گھاس پہ بیٹھتے ہوئے بولا: "آصف! مجھے زری کے متعلق بڑا فکر رہتا ہے —— میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں مہ رخ کے متعلق سوچ رہا تھا یکدم میرے گھٹنے کمزور پڑ گئے۔

"ہاں —— ہاں ضرور پوچھو ——"

"نہ تو وہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے نہ کسی سہیلی سے ملنے جاتی ہے اور نہ ہی اب کوئی اس کی سہیلی گھر آتی ہے۔ پہلے تو وہ کرنل افتخار کی بیٹیوں سے بہت فری تھی۔ اب کبھی ان کا نام بھی نہیں لیتی۔ میں بڑا فکرمند ہوں۔"

میں نے تھوک نگل کر کہا۔ "کسی ڈاکٹر کو دکھایا تھا اقبال —— شاید معدہ —— ہو۔"

"دکھایا تھا۔ کرنل وسیم سے سارا چیک اپ کروایا ہے۔ بلڈ ٹسٹ لیا ہے۔ چیسٹ کا ایکسرے کروایا ہے —— بظاہر وہ بالکل تندرست ہے۔" اقبال نے انگریزی میں کہا

"تعجب ہے ——" دور کہیں چکی چلنے لگی تھی اور اس کی آواز میں مدھم آہوں کی بُرک تھی۔

شکاری کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے ہمیشہ اقبال کو کھلنڈرے موڈ میں دیکھا تھا۔ کارتوس سے لے کر چیتے کی آنکھوں تک اس کی باتوں کی اڑان تھی۔ اس کے سامنے شکار سے ہٹ کر اگر کوئی بات کی جاتی تو وہ اونگھنے لگتا۔ آج وہ گھاس پر بندوق پرے رکھے گھٹنوں کو بازوؤں میں لئے متوحش سا بیٹھا تھا۔ اقبال کا یہ پہلو میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے انگریزی میں بڑے اکھڑ پن سے پوچھا ـــ "تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے ـــ اگر مجھے علم ہو جائے کہ اسے کس سے محبت ہے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ـــ میں . . . . میں زری کی بڑی عزت کرتا ہوں آصف۔"

میرے لئے اس سوال کا جواب دینا سہل نہ تھا۔ ذرا سا اعتراف بھی مجھے اتنی دور لے جاتا کہ پھر میں لوٹ کر نہ آ سکتا۔ میں نے ساری بات کو معمولی روپ دے کر کہا: "ابھی کہاں اقبال۔ ابھی تو وہ اپنی استانی سے CALF-LOVE کر رہی ہوگی۔"

اقبال نے لمحہ بھر کو میری جانب دیکھا۔ اس نظر میں بڑی مجروح سی چمک تھی۔ پھر اس نے بندوق اٹھائی اور گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ سارا راستہ اس نے جنگلی مرغابی، تیتر، بٹیر، مچھلی کے گوشت کی جداگانہ خاصیتوں پر بحث کی۔ شکار کے گوشت کو کوئلوں پر سینک کر پکانے اور سکھانے کے طریقے بتائے لیکن ایک بار بھی پھر اس نے تمہارا نام نہ لیا۔ لیکن اتنی ساری باتوں کے باوجود آج کی تشویش مجھ سے چھپی نہ تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بچی کیلئے بڑے چکر میں تھا۔ اس کی باتوں میں آج انہماک تو ضرور تھا لیکن وہ گہری دلچسپی نہ تھی جو عموماً اس کی باتوں سے مترشح ہوا کرتی تھی۔ میں اقبال کی مدد کرنا چاہتا تھا اور کسی قسم کی مثبت گفت گو ہم میں ممکن نہ تھی۔ پورچ کے پاس پہنچ کر میں نے اس سے اجازت چاہی۔ اس نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں دل ہی دل میں جو فیصلہ کر چکا تھا مجھے اس پر عمل کرنا تھا اور وہ بھی بہت جلدی۔ میں بڑی عجلت میں رخصت ہوا اور سیدھا مہ رخ کے پاس پہنچا۔ وہ ایک فل سکیپ پیپر پر بال پن کے ساتھ کچھ لکھ رہی تھی۔ دفتری میز پر بہت سی تصویریں پڑی تھیں اور ہر تصویر کے اوپر ایک چٹ لگی تھی۔ میں سلام کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے صاحب کی طرح سر کے اشارے سے

سلام کا جواب دیا اور کام میں مصروف رہی۔ میں نے جھک کر صفحے پر دیکھا۔ لکھا تھا:

"میرے میاں شادی کی سالگرہ بھول گئے ـــ"

اس عنوان کو نیک شگون سمجھ کر میں نے کاغذ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا:

"امتل الحفیظ ـــ"

اس نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا ـــ "امتل الحفیظ بہت ذاتی نام ہے ـــ مہ رخ کہئے ـــ"

گرم استری پر جیسے پانی کے چھینٹے پڑ گئے۔

"مہ رخ!"

وہ کاپی پر لکھتے ہوئے بولی ـــ "آنسو نیک شگون ضرور ہیں لیکن چہرے کا میک اپ خراب کر دیتے ہیں۔ شادی کی پہلی رات . . . ."

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔"

"وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال خود کرتی ہیں ـــ بیگم رضوانی سے ایک ملاقات۔"

"میری بات سنو مہ رخ ـــ خدا کے لئے ـــ"

"ٹین کے ڈبوں سے آراستہ کھانا ـــ" وہ تصویروں پر کیپشن لکھتی گئی۔

"مہ رخ لمحہ بھر کے لئے میری طرف توجہ دو۔"

وہ قلم گھسیٹتے ہوئے بولی ـــ "فرح دیبا۔ اپنے شوہر کی چہیتی بیگم۔"

"اللہ کے لئے مہ رخ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"ملکہ الزبتھ دس لاکھ کی مالیت کے ملبوسات لے کر سفر کرتی ہیں۔"

میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر کہا ـــ "مجھے تم سے محبت ہے مہ رخ۔"

"محبت کی شادی میں ناکامی کی وجہ ـــ"

اب میں جھنجھلا کر اٹھا اور اس کے ہاتھوں سے کاغذ چھین کر بولا ـــ "مہ رخ۔ مذاق کی ایک

حد ہوتی ہے۔"

"مذاق کون کر رہا ہے؟"

میں نے چڑ کر کہا: "اور میرے ہر سوال کا وہی جواب ہے جو آپ نے دیا۔"

مہ رخ نے کاغذ بڑی اترا ہٹ سے میرے ہاتھوں سے چھینا اور اوپر اٹھا کر بولی —

"جناب۔ میں کچھ عنوان بنا رہی تھی اپنے کالموں کے لئے —— دیکھئے پسند فرمائیے۔"

"اچھا۔ آج تم سنجیدہ نہیں ہو۔ میں پھر آؤں گا۔"

جب میں دروازے کے پاس پہنچ گیا تو مہ رخ اپنی میز پر بیٹھتے ہوئے بولی: "اور وہ کلاسیکی موسیقی کی کنسرٹ پر نہیں جائیں گے۔ ابھی کل تک تو بڑا جوش تھا۔"

مہ رخ سے ناراض ہونا اور پھر اس ناراضگی کو مستقل کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میری شخصی آزادی اس کے حضور بالکل ختم ہو چکی تھی —— میں دُم دبائے کتے کی طرح دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے بعد کسی قسم کی گفت گو نہ ہوئی۔ میں اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنا چاہتا تھا اور وہ مجھ جیسوں کو دھوئیں میں اڑاتی تھی۔ اس لئے جب تک وہ لکھتی رہی میں تصویریں دیکھتا رہا۔ میں نے ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ پاکستان کی خواتین فینسی ڈریس کو بہت پسند کرتی ہیں۔ جا بجا کلچرل شوز میں عورتیں گھنے پلتے سے لیس، غرارے، سندھی قمیض، چوڑی دار پاجامے، پشواز، سلہٹ کے انداز کی ساڑھی، وہ گزے لہنگے، پٹھانی کرتے اور شیشوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ پنجابی لڑکیوں کو پٹھانی بننے کا شوق تھا۔ سندھی لڑکیاں ساڑھی پہنے اترا رہی تھیں۔ معمر عورتیں چوڑی دار پاجاموں اور عروسی لباسوں میں ملبوس تھیں۔ غرضیکہ بڑے پیمانے پہ ایک بڑا وسیع و عریض گھپلا تھا۔ فیشن کے ان مقبول شوز کے علاوہ ان خواتین کی تصویروں کا بھی پلندہ دھرا تھا جو ایکٹریس بنتے بنتے کسی طرح بچ گئی تھیں۔ یکسو خا پورا چہرہ اور تین چوتھائی چہرے کی ان گنت تصویریں تھیں۔ سب شکلوں پہ وہی ایک لیمن ڈراپ قسم کی مسکراہٹ تھی۔ کچھ تصویریں ان پارٹیوں کی تھیں جو شادی سالگرہ اور نوجوان لڑکوں کے یورپ جانے کی تقریبوں پہ دی جاتی ہیں۔ ان تصویروں میں مہمان عموماً

دولہا دلہن، سالگرہ منانے والا یا سفر پہ جانے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ افسر بالا یا مشہور آدمی ہوتا ہے جن کے اردگرد تمام مہمان گھسنے کی کوشش کریں۔ میں نے تو ایک آدھ تصویریں یہاں تک ظلم دیکھا کہ دولہا اور دلہن کے عین درمیان ایک گنجے سر والے صاحب براجمان ہیں۔ اردگرد گھر والوں کی دورویہ پلٹن کھڑی ہے۔ نیچے رقم ہے:

"دولہا دلہن کے درمیان جناب اعزاز الحق صاحب"

ان تصویروں پر مستزاد ان معمر لیڈر نما عورتوں کی تصویروں کا اجتماع تھا جو بیرونی ممالک کے سربراہوں کا خیر مقدم کرنے ایئر پورٹ کے وی آئی پی میں پہنچی تھیں۔ جنہیں مقامی فنکشنز پر پہلی قطار میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ جو زنانہ جلسوں میں صدارت کے فرائض ادا کر چکی تھیں ان خواتین کے چہرے فوٹو گرافروں کی چابکدستی کے باوجود دیسی مچھلی کی طرح تھل تھل اور بے جان نظر آ رہے تھے۔ میں یہ تصویریں دیکھنے میں مصروف تھا کہ مہ رخ اٹھتے ہوئے بولی:

"کیوں چلئے گا کہ ناراض رہئے گا ابھی۔"

ابھی ہم ہال تک پہنچے تھے کہ مجھ پہ پھر دورہ پڑا۔

"مہ رخ! یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟"

"کونسا سلسلہ! دیکھئے دیکھئے آہستہ چلیئے رکشا آ رہا ہے ادھر سے۔"

"میری گرویدگی اور تمہاری بے رُخی۔"

"جب تک آپ چلانا چاہیں۔ ساری کاروائی یک طرفہ ہے۔"

میں نے ستر کی رفتار پہ موڑ کاٹا۔

"اللہ۔ آج آپ صحیح سالم لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"مہ رخ! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو شادی کے بعد عورتوں کی آزادی سلب کر لیا کرتے ہیں۔ تم چاہے ساری عمر عورتوں کا کالم لکھنا خدا قسم مجھے اعتراض نہ ہوگا۔"

"یہ تو میری مرضی پر منحصر ہے شاید میں جرنلزم فوراً چھوڑ دوں۔"

ایک تانگے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔

"ہم دونوں کی مرضی ہمیشہ ایک ہوگی مہ رخ ــــ ہمیشہ!"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی ــــ "یعنی بالا ہی بالا میرے حقوق آپ کے نام محفوظ بھی ہوگئے!"

"تمنا تو میری یہی ہے"۔

"خوب ــــ اللہ کے لئے اتنی تیز نہ چلایئے گاڑی!"

مجھ پر اپنی محبت کا بوجھ بڑا شدید ہو چلا تھا اور گاڑی بے قابو ہو کر کبھی دائیں کبھی بائیں مڑنے اور جھولنے لگی تھی۔

"آصف صاحب۔ کیوں مفت میں بدنام کرنے لگے ہیں مجھے۔ صبح اخبار میں چھپے گا - - - مہ رخ، خواتین کی کالم نگار ــــ سیتلا مندر کے پاس حادثے کا شکار ہوگئیں ــــ ان کے ساتھ کار میں جو شخص تھا اس کی شناخت جاری ہے"۔

میں نے گڑگڑا کر کہا: "تم دن بھر میں کسی وقت سنجیدہ بھی ہوتی ہو کہ نہیں"۔

اس نے بھولا سا منہ بنا کر جواب دیا: "میرا خیال ہے سارے دن میں مجھے غیر سنجیدہ ہونے کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا"۔

"خدا کے لئے مہ رخ۔ مجھ سے شادی کر لو بلیز"۔

"اب اگر آپ نے مجھ سے ایسا مذاق کیا تو میں یہیں اتر جاؤں گی۔ اسی لمحہ"۔

میں خاموش ہو گیا اور کنسرٹ کے اختتام تک خاموش رہا۔

لان پر رنگدار نواڑی کرسیاں پڑی تھیں اور کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ہمیں ایسی جگہ ملی جہاں سے ہر آنے جانے والا آدھ فٹ کے فاصلے سے گزرتا تھا۔ شامیانے تلے اکابرین شہر کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ مجمع میں عورتوں کی اکثریت تھی اور ان میں وہ خواتین زیادہ تھیں جو شوہروں کے شانہ بشانہ بڑے ٹھسے سے آئی تھیں۔ عورتوں کی تعداد کچھ اس لئے زیادہ نہ تھی کہ یکدم لاہور کی مستورات کن رس ہو گئی تھیں اور انہیں موسیقی سے عشق ہو گیا تھا بلکہ اکثر اس لئے آئی تھیں کہ ان کے پاس کچھ ایسے

لباس تھے جو لوگوں کو دکھانا بہت ضروری تھا۔ کچھ اس لئے تشریف لائی تھیں کہ صبح ہی انہیں اپنی ہمسائی اور دوستوں کو بتانا تھا کہ رات وہ بھی کنسرٹ پر موجود تھیں۔ کچھ محض اس لئے چلی آئی تھیں کہ آج شام کنسرٹ سے بہتر شہر میں کوئی اور پروگرام نہ تھا . . . . بیگمات کی خیرہ کن زیبائش ایسی تھی کہ بڑی بڑی رسہ گیر طوائفیں کان پکڑتیں اور ان سے لباس پہننے کا سبق حاصل کرتیں۔ مجھ سے ایک مرتبہ ایک ٹیکسی گرل نے شکایتاً کہا تھا:

"جناب جب سے بیگمات طوائف گیری کرنے لگی ہیں انہوں نے ہمارے رزق پر لات مار دی ہے"۔

"وہ کیسے"۔ میں نے سوال کیا

"پہلے مرد طوائفوں کے پاس اس لئے زیادہ آتے تھے کہ گھریلو بیبیاں سادہ لباس پہنتی تھیں۔ اور اپنے آپ کو ڈھانپے رہتی تھیں۔ اب تو بیگمات ہر پہلو سے اپنے آپ کو یوں پیش کرتی ہیں کہ طوائف دنگ رہ جاتی ہے۔ اب ہم لوگوں کو کون پوچھے بھلا!"

آج چونکہ میں بظاہر مہ رخ سے ناخوش بیٹھا تھا اس لئے میری نظروں میں تنقید زیادہ تھی اور تحسین کم۔ سجی سجائی عورتوں کو دیکھ کر مجھے سالم خرگوش کا روسٹ یاد آنے لگا۔ ایسا روسٹ جو بڑے سلیقے سے سٹین لیس ٹرے میں پیش کیا گیا ہو۔ ان عورتوں کا ہر رنگ آپ کے سامنے تھا۔ آپ کے تخیل کیلئے کچھ باقی نہ تھا۔ یہ مرد کی تواضع تھی۔ سوءِ ہضم پیدا کرنے کی حد تک تواضع۔

کنسرٹ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں مہ رخ کے گھر چل دیئے۔ ساری راہ نہ میں نے اسے بلایا اور نہ ہی اس نے مجھ سے کوئی بات کی لیکن جونہی وہ میکلوڈ روڈ کے پہلو میں ایک بنگلے کے پاس اتری میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا:

"مہ رخ!"

مہ رخ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور تنک کر بولی: "مسٹر آصف! میرا خیال تھا کہ مرد اور عورت میں افلاطونی محبت ممکن ہے لیکن یہ تجربہ غلط نکلا۔ مرد اور عورت میں کیسا ہی لاتعلق رشتہ کیوں نہ ہو۔ دونوں میں سے ایک کو ضرور توقع پیدا ہوتی ہے محبت کی۔ خدا حافظ"۔

"مہ رخ۔ سنو تو!"

"کیا سنوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس نے آپکو غلط امید دلائی ہو۔ پھر بھی غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ ہوگئی۔ ہوگئی ناں!"

"مہ رخ۔ تم لوٹ کر مجھ تک ضرور آؤگی۔"

"فی الحال تو میں ظفر کی طرف مراجعت کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ یہ بات طے ہے۔"

مہ رخ جلدی سے روانہ ہوگئی اور میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔ ظفر۔ مہ رخ۔ چوب سٹک جیسی ٹانگیں چلانے والا نیم مسخرہ۔ نیم فلاسفر۔ اس آتشبازی کا منظور نظر ہے۔ یہ حقیقت مجھے سمجھ نہ آتی تھی —— بڑی دیر بعد جب میں کار میں بیٹھا تو ونڈ سکرین پہ مجھے تمہاری صورت نظر آئی۔ ہسپانوی لیموں جیسی جلد، گم سم آنکھیں، سینے پر لٹکتے دو لمبے لچکیلے سانپ اور سانپوں کے منہ میں گڑھل کے آتشیں پھول۔ میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے محبت کی بُو آتی ہو۔ پھر تم نے آپ ہی آپ یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ میری محبت کے بغیر تمہارا وجود نامکمل ہے۔ شاید مہ رخ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مرد اور عورت کا رشتہ کبھی لاتعلق نہیں ہوسکتا۔ یہاں ہمیشہ ایک وائرس موجود رہتا ہے جو مکمل بھولپن اور سادگی کو مفلوج کر دیتا ہے۔ یہ وہ بتیاں ہیں جو آپ ہی آپ نیلے پانیوں میں منعکس ہوجاتی ہیں۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں تمہارے ہاں پہنچا۔ یہ میری خود غرضی تھی کہ میں تمہاری عقیدت کے پھاہے سے اپنی زخمی انا کو سینک دینا چاہتا تھا۔ میں ہمدردی وصول کرنے اس جگہ پہنچا جہاں کا ہر ذرہ محبت کے وائرس میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں نے کار کو پورچ میں روکا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شاید تمہارے ممی ڈیڈی گھر پر نہ ہوں لیکن بھاگ جانے کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔ کار کا شور سنتے ہی تم برآمدے میں آپہنچی تھیں۔ تمہارا چہرہ زرد تھا۔ کبھی یہ آئرن ٹانک اور غازے کی سرخی سے بے نیاز شنگرفی نظر آیا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر تمہارے کان کی لوئیں سرخ ہوگئیں۔ تم بھاگ کر ڈرائیور والی سیٹ کی جانب آگئیں اور ہینڈل گھماتے ہوئے بولیں: "آئیے!"

"ڈیڈی کہاں ہیں تمہارے؟"

"وہ جی ہرن مینار گئے ہیں۔"

"اور ممی جان"

"وہ بھی ساتھ گئی ہیں جی۔"

"تم نہیں گئیں ان کے ساتھ؟" میں نے سوال کیا۔

"میرے سینئر کیمرج کے امتحان ہیں جی —— پرسوں سے۔"

میں نے بالکل انکلوں جیسی آواز میں کہا: "ٹھیک ٹھیک۔ پھر تم تو پڑھو بی بی۔ میں تو چلتا ہوں اقبال کو بتا دینا میں آیا تھا۔"

تم نے پہلی بار جرأت سے دروازہ کھول کر بات کی: "جی ممی ڈیڈی آنے والے ہیں بس آپ ذرا تو اتر آئیے۔"

تمہاری آواز میں جو التجا تھی میں نے اس کے سامنے اپنے آپ کو نہتا محسوس کیا۔

"نہیں بھئی۔ تمہاری پڑھائی میں حرج ہوگا۔"

"پانچ منٹ رک جائیے سچ ڈیڈی آنے والے ہیں ابھی۔"

تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ان آنسوؤں کا دکھ میں نے پہلی بار محسوس کیا۔ اپنی محرومی کے احساس سے میرا اپنا حلق نمکین ہوگیا۔ تم مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ میں اسی مخصوص صوفے میں بیٹھ گیا جو آتشدان کے قریب تھا سارے کمرے میں کمائے ہوئے چمڑے کی مہک تھی۔ چیتے کے سر، بارہ سنگھوں کی آنکھیں اور شیر ببر کی کھال یکدم بہت جاندار ہوگئی تھی۔ مجھے جنگل کا سناٹا کمرے میں مقید محسوس ہو رہا تھا۔

"پہلا پرچہ کس کا ہے؟"

"انگلش کا۔"

"پھر؟"

"دوسرے دن سنڈے ہے جی"۔

"اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں۔ تمہارے ڈیڈی تو مچھلی کا شکار کھیلنے گئے ہوں گے"۔

یکدم میں اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے کی نیت سے دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ تمہاری آواز آئی یہ آواز ایک بچے کی تھی لیکن اس میں میرا بائی کا سارا غم تھا۔ اس پہ آنسو ان کا اور تعاون بھی کر رہے تھے۔

"مجھ سے شادی کر لیجئے۔ دو دن کیلئے۔ ایک دن کیلئے۔ ساری لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں آصف صاحب۔ خدا کیلئے مجھ سے نکاح کر لیجئے۔ ایک گھنٹہ بھر کے لئے چاہے پھر آپ مجھے طلاق دے دیجئے گا۔ میں ہمیشہ آپکی احسانمند رہوں گی"

میرے سر کے عین اوپر بم کا گولہ پھٹا۔

"لڑکیوں کو اس بات کا علم کیسے ہوا زری"۔

"ہو گیا ہے جی۔ ہونا ہی تھا۔ میں آپکی تصویر جو ساتھ لے جاتی تھی بستے میں"۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میری تصویر اس کے پاس کہاں سے آئی لیکن جب میں نے لوٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بے حد چھوٹی، دل برداشتہ نظر آئی۔ بالکل جنگی قیدی کی طرح مجبور اور بدحال۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پہ رکھے اور آہستہ آہستہ بولا:

"سنو زری! میں تمہاری ثبت کی عزت کرتا ہوں لیکن ابھی تم بچہ ہو۔ یہ دور گزر جائے گا۔ تم خود اس جذبے پہ ہنسو گی۔ بچپن میں سبھی اس طرح محبت کرتے ہیں لیکن اقبال میرا جگری دوست ہے۔ ہم دونوں چاہے برسوں نہ ملیں ہماری دوستی بہت گہری ہے۔ میں ایک خاص اعتماد پہ یہاں آتا ہوں:

تمہاری آنکھیں بند تھیں اور پلکوں سے بکھری برسات ٹوٹ رہی تھی۔

"اور ایک اور بات بھی ہے زری!"

تم نے آنکھیں کھول دیں۔ آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں۔

"مجھے کسی اور سے محبت ہے۔ بالکل ایسی ہی محبت جیسی تمہیں مجھ سے ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ

نہیں رہ سکتا۔ سمجھیں زری!"

"جی! ــــ"

نہ جانے وہ سارے آنسو کیسے یکدم خشک ہو گئے۔

میں بھاری قدم اٹھاتا باہر آیا اور کار میں بیٹھا اور پورچ سے رخصت ہو گیا۔ کاش! میں پلٹ کر ایک بار تمہیں دیکھ ہی لیتا۔

رات کو پونے دو بجے مجھے اقبال کا فون ملا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو اقبال باہر ٹہل رہا تھا

"بڑی دیر لگا دی تم نے آصف"۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ اقبال میرے متعلق کس قدر جانتا ہے۔ میں خاموش رہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر جلد مرنا چاہتی ہے تو میں اسے خود شوٹ کرتا۔ اسے دو گھنٹے مرنے میں نہ لگتے"۔

"آئی ایم سوری اقبال"۔

"ابھی تک میرا خیال تھا کہ زری اتنی سخت دل نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں میری محبت ضرور ہو گی۔ لیکن ــــ" میں بلا مقصد اس کا کندھا تھپ تھپانے لگا۔

"ایک شکاری کی بیٹی کا نشانہ اتنا خراب۔ پورے دو گھنٹے سسکتی رہی۔ بہت دیر کر دی تم نے آصف"۔

"کاش میں اسے ہسپتال نہ لایا ہوتا۔ آصف! گھر اور ہسپتال میں خدا تو وہی رہتا ہے نا!"

میں خاموشی کے ساتھ اس کے برابر ٹہلنے لگا۔

"وین ابھی تک نہیں آئی"۔

"وین؟ ــــ" میں نے بے دھیانی سے سوال کیا۔

"زری کو گھر لے جائیں گے۔ اسے نہلائیں گے۔ دھلائیں گے۔ میں اس کے ماتھے کا زخم خود صاف کروں گا۔ بڑی DARLING لڑکی تھی۔ تھی نا آصف!"

میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

"میں اصل وجہ سمجھ نہ سکا۔ میں ہرن منارے سے لوٹا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ خانساماں بدبخت گھر پر نہیں تھا۔ دی ایڈیٹ "

"چلو ذرا بنچ پر بیٹھ جائیں"

اس نے میری نصیحت پر عمل نہ کیا: "زری مجھے ہمیشہ شکار سے منع کیا کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی ڈیڈی اللہ میاں سزا دیتا ہے۔ یہ گناہ ہے"۔

اس کی آنکھوں میں تھوڑا تھوڑا پاگل پن اتر آیا تھا۔

"آصف! کیا اسے کسی سے محبت تھی۔ تم ہمارے گھر آتے تھے تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا کوئی ایسا بھی اس صفحۂ ہستی پر تھا جو زری کو نہ چاہ سکا۔ ہم کبھی اس کے خلاف نہ ہوتے۔ زری نے یہ کیوں سمجھا کہ میں اس کی محبت پر معترض ہوتا۔ کیوں ؟ کیوں ؟ کیوں ؟"

میں تمہارے ڈیڈی کو کیا سمجھاتا کہ نیل کے پانیوں میں منعکس ہونے والی بتیوں کا کوئی قصور نہیں۔ میں تمہارے ڈیڈی کو کیا بتاتا محبت توامربیل کی مانند ہے۔ جس درخت پر اس کی زرد رُو ڈالیاں چڑھ جاتی ہیں وہ درخت آپ ہی آپ مرجاتا ہے۔ میں تمہارے باپ کو کیا سمجھاتا اور وہ کیوں سمجھتا۔

میں تو تمہیں بھی نہ بتا سکا زری کہ تمہارے جانے کے بعد مہ رخ کی محبت چھن جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ تمہاری محبت مجھ تک مہ رخ کے توسط سے پہنچی ہے زری۔ اس محبت کا تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکا لیکن میں نے تمہارا قرض لوٹا دیا ہے۔ میرے اردگرد امربیل چڑھ چکی ہے۔ اس میں ہائی سنتھ کے پھول کھلے ہیں۔ پشیمانی کے ارغوانی پھول۔ تاسف کے آسمانی پھول۔ میں تمہارا قرض لوٹا رہا ہوں۔ ہولے ہولے۔ آنسو بہ آنسو۔ آہ در آہ!

تمہاری محبت کی بتیاں میرے دل کے ناسپاس پانیوں میں منعکس ہو چکی ہیں زری۔ لیکن میں بتیاں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔ میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میرا کوئی ماضی نہیں۔ میں وہ مریض ہوں جس کی شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ شاں شاں کر رہا ہے اور وہ آپریشن تھیٹر سے بھاگ آیا ہے۔

بارش بہت زور سے آئی ہے۔ بادلوں کے نیلے کپڑے میں شگاف آ گئے ہیں۔ مٹی کے گرم وجود سے ٹھنڈی بوندوں نے لپٹ کر سوندھی خوشبو اٹھائی ہے۔ تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا ہے۔ میں اس طفل زادے کی طرح تھا جو محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر بے وقعت کر دیتے ہیں۔ لیکن اب نہیں۔ اب نہیں زری!

لیکن اب کیا فائدہ ؟

اب کیا فائدہ زری؟؟